حزب التحریر کے سیاسی تصورات

حزب التحریر

چوتھاایڈیشن

1425ھ- 2005ء

عربی سے اردو ترجمہ

1439ھ- 2018ء

فہرستِ مضامین

مقدمہ 4

سیاست ایک فکر اور ایک طریقہ ہے 7

سیاسی منصوبے اور اسالیب.....13

عالمی صورتِ حال.....21

عالمی روایات اور عالمی قانون.....34

ریاستوں کے درمیان کشمکش کے محرکات.....59

بڑے عالمی مسائل.....66

1 - یورپ کا مسئلہ 99

2 - مشرق وسطیٰ کا مسئلہ 107

3 ۔ مشرق بعید کا مسئلہ 128

4 ۔ وسطی ایشیا کا مسئلہ 136

6 - افریقہ کا مسئلہ 146

دنیا کی ابتر صورتِ حال کے اسباب.....164

عالمی سیاست پر اثر انداز ہونے کی کیفیت.....180

سیاسی شعور و آگاہی.....183

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

سیاست، اُمت کے خارجہ اور داخلہ امور کی دیکھ بھال کو کہتے ہیں۔ یہ اُمت اور ریاست دونوں کی طرف سے ہوتی ہے، چنانچہ ریاست عملی طور پر یہ کام سرانجام دیتی ہے اور امت اس دیکھ بھال کے بارے میں ریاست کا محاسبہ کرتی ہے۔

ریاست کی طرف سے امت کے داخلہ اور خارجہ امور کی دیکھ بھال، ریاست کے اندر مبدأ (آئیڈیالوجی-ideology) کے نفاذ سے ہوتی ہے اور اسے داخلی سیاست کہتے ہیں۔

جہاں تک ریاست کی جانب سے امت کے خارجہ امور کی دیکھ بھال کی بات ہے تو یہ دیگر ریاستوں، عوام اور اقوام کے ساتھ اس کے تعلقات اور مبدأ (آئیڈیالوجی) کی نشرواشاعت پر مشتمل ہے اور یہی خارجہ سیاست ہے۔

خارجہ سیاست کا فہم ریاست اور امت کے وجود کے تحفظ کیلئے ایک بنیادی امر ہے۔ یہ دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کا علمبردار بننے کے لئے بھی بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور یہی وہ کام ہے جو دوسروں کے ساتھ امت کے تعلقات کو درست طریقے سے استوار کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔

چونکہ تمام انسانوں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کی ذمہ داری امتِ مسلمہ پر ڈالی گئی ہے، لہٰذا مسلمانوں کے لیے اشد ضروری ہے کہ وہ پوری دنیا سے رابطہ میں رہیں، جہاں وہ ان کے حالات سے آگاہ ہوں، انہیں ان کے مسائل کا ادراک ہو، وہ ان کی ریاستوں اور اقوام کے محرکات کو جانتے ہوں، دنیا میں جاری سیاسی

سرگرمیوں پر ان کی گہری نظر ہو، ان ریاستوں کے سیاسی منصوبوں اور ان اسالیب پر توجہ مرکوز رہے، ان کے ایک دوسرے سے تعلقات سے باخبر ہوں اور ان ریاستوں کی سیاسی چالوں سے واقف ہوں۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ بین الاقوامی صورتحال کی روشنی میں عالمِ اسلام میں موجود حالات کو سمجھیں تاکہ وہ ایسے اسلوب اختیار کر سکیں جو ان کی ریاست کے قیام کے لیے ناگزیر ہوں اور دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے میں مددگار ہوں۔

لیکن یہ واضح ہونا چاہیے کہ ممالک کا مؤقف ہمیشہ یکساں اور پائیدار نہیں رہتا بلکہ یہ بین الاقوامی حالات کے مطابق تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بین الاقوامی سطح پر ہر ریاست کی صورتِ حال ہمیشہ یکساں نہیں رہتی بلکہ اس ریاست کی قوت اور کمزوری، مؤثر یا غیر مؤثر ہونے کی طاقت، اس کے اور دوسری ریاستوں کے درمیان قائم تعلقات میں سرد مہری یا گرم جوشی اور ان تعلقات میں تناؤ کے لحاظ سے یہ حالت تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے بین الاقوامی پوزیشن کے بارے میں کوئی مستقل رہنما اصول بنالینا اور دنیا میں قائم کسی بھی ریاست کی صورتحال کے بارے میں کوئی دائمی رائے دینا ممکن نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی مخصوص وقت میں عالمی پوزیشن کے حوالے سے عمومی رہنمائی (گائڈ لائنز) دے دی جائے، اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ یہ پوزیشن تبدیل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مخصوص وقت میں ایک ریاست کی صورتحال کے بارے میں متعین فکر دی جائے، یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ اس کی صورتحال تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس لئے ایک سیاستدان کو عالمی سطح پر جاری سیاسی اقدامات پر گہری نظر رکھنی پڑتی ہے اور ان کو سابقہ سیاسی معلومات کے ساتھ منسلک کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ صحیح طور پر سیاست کو سمجھ سکے اور یہ جان سکے کہ بین الاقوامی صورتحال اپنی سابقہ حالت پر برقرار ہے یا اس میں کچھ تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ نیز وہ ہر ریاست کی پوزیشن بھی جان سکے اور یہ بھی کہ کیا فلاں ریاست کی پوزیشن اب بھی وہی ہے یا تبدیل ہو گئی ہے۔

عالمی صورتحال میں تبدیلی کا دارومدار بعض ریاستوں کی صورتحال میں ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیلی پر ہے جیسے ایک ریاست مضبوط تر ہو جائے یا پہلے کے مقابلے میں کمزور ہو جائے، اس کے

دیگر ریاستوں کے ساتھ تعلقات مضبوط ہو جائیں یا کمزور، چنانچہ اس سب کے نتیجے میں عالمی طاقتوں کے درمیان توازن میں تبدیلی کی وجہ سے عالمی توازن میں تغیر پیدا ہوتا ہے۔ اس بنا پر عالمی صورتحال کو سمجھنے کیلئے ہر اس ریاست کی صورتحال سے آگاہی بنیادی حیثیت رکھتی ہے جو عالمی صورتحال پر اثر انداز ہوتی ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر ریاست کے بارے میں مکمل معلومات کے حصول پر زیادہ توجہ دی جائے کیونکہ سیاسی سمجھ بوجھ کیلئے یہی پہلا ستون ہے۔ کسی ریاست کی صورتحال کو پہچاننے کا تعلق عالمی صورتحال میں اس کے مقام و مرتبے کے ساتھ نہیں بلکہ اس کا تعلق ہر اس چیز کے ساتھ ہے جو اس کی داخلہ و خارجہ سیاست کے ساتھ تعلق رکھتی ہو۔ اس لئے دنیا کی تمام ریاستوں کے فکری قاعدے، جس کی بنیاد پر کسی ریاست کی پالیسی رکھی جائے، سے واقفیت اور شناسائی بھی انتہائی ضروری ہے، بالخصوص وہ ریاستیں جو عالمی صورتحال کے حوالے سے قابل ذکر حیثیت رکھتی ہیں جن سے امت مسلمہ کی جدوجہد ناگزیر ہے۔ یہ بھی لازم ہے کہ ان ریاستوں کے منصوبوں اوران اسالیب کی پہچان ہو جو وہ ان منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہچانے کے لیے بروئے کار لاتی ہیں اور یہ تلاش و جستجو برابر جاری رہے، ان اسالیب اور منصوبوں کی تبدیلی کی حدود کا ادراک ہو اور ان محرکات کی سمجھ ہو جن کے باعث یہ تبدیلیاں کی گئیں۔ یا وہ وجوہات جن کی بنا پر یہ ممالک اپنے منصوبوں اوراسالیب کو بدلنے پر مجبور ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی اچھی طرح پہچان ہو کہ وہ کونسے معاملات ہیں جو ان ممالک پر اثر انداز ہوتے ہیں یا ان کو اپنے منصوبوں اور اسالیب کو تبدیل کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

سیاست ایک فکر اور ایک طریقہ ہے

جہاں تک ایسی فکر (نظریہ) کا تعلق ہے کہ جس پر کسی بھی ریاست کی سیاست قائم ہوتی ہے تو یہ فکر ہی وہ بنیاد ہے جس پر ریاست دیگر اقوام کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرتی ہے۔ پس وہ ریاستیں جو کسی مبدأ (آئیڈیالوجی-ideology) کی حامل نہیں، ان کے افکار مختلف اور متضاد ہوتے ہیں اوران کے افکار میں تبدیلی کی گنجائش رہتی ہے۔ ایسے ممالک کی سیاست کے متعلق بحث سیاسی منصوبوں اور اسالیب کے ضمن میں کی جائے گی، نہ کہ سیاسی نظریے کی بحث کے ضمن میں۔

البتہ وہ ریاستیں جو کسی نہ کسی مبدأ (آئیڈیالوجی) کی حامل ہیں تو ان کی فکر کسی تبدیلی کے بغیر مستقل رہتی ہے۔ یہی اختیار کردہ فکر اس آئیڈیالوجی کو دنیا میں ایک ایسے مستقل طریقہ کار کے ذریعے فروغ دیتی ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوتا، خواہ اس کے اسالیب میں تبدیلی واقع ہو جائے۔ ایسی ریاستوں پر سیاسی نظریے کی بحث کا اطلاق ہوتا ہے۔

دنیا میں موجود ریاستوں کو اسی بنیاد سے دیکھنا ضروری ہے۔ یعنی اس بات کو مدِ نظر رکھا جائے کہ کیا ایک ریاست دوسری اقوام کے ساتھ تعلقات کیلئے ایک بنیادی فکر رکھتی ہے خواہ یہ فکر مستقل ہو یا غیر مستقل۔ اسی طرح اس فکر کے نفاذ کیلئے اس ریاست کا ایک مخصوص طریقہ کار ہوتا ہے، خواہ مستقل ہو یا غیر مستقل۔ اور وہ ریاست اپنے اِس مخصوص فکر و طریقہ کی روشنی میں اپنے منصوبوں کو اس انداز میں تشکیل دیتی ہے اور ایسے اسالیب styles کو اختیار کرتی ہے تاکہ اس کے مقصد کو حاصل کیا جا سکے۔ البتہ آجکل دنیا میں موجود

ممالک اسالیب کے حوالے سے اپنے آپ کو آزاد رکھتے ہیں، لہٰذا وہ ایسے اسلوب اختیار کرتے ہیں جن سے مقصد حاصل ہو جائے۔ اگرچہ وہ اسلوب ان کی آئیڈیالوجی کے طریقہ کار کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اور وہ "انت بھلا سو بھلا (The end justifies the means)" کے اصول پر چلتے ہیں۔

بہر حال، تمام ممالک ایسے سیاسی منصوبے تشکیل دیتے ہیں جو حسبِ ضرورت بدلتے رہتے ہیں اور ایسے مختلف اسالیب اپناتے ہیں جو حالات کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

ریاستیں اپنی امت کے مفادات کی دیکھ بھال کے لیے سیاسی اعمال سرانجام دیتی ہیں اور ریاستیں اپنے مفادات کے مطابق دیگر ریاستوں کے ساتھ تعلقات قائم کرتی ہیں۔ اس کے باوجود ریاستوں کے درمیان بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ریاست جو کوئی مخصوص آئیڈیالوجی نہیں اپناتی، اس کے نزدیک بین الاقوامی تعلقات میں مفاد ہی مؤثر عنصر (effective factor) ہوتا ہے۔ جبکہ وہ ریاست جو ایک مخصوص آئیڈیالوجی (مبدأ) کی حامل ہے اور اس کا دنیا میں پرچار کرتی ہے، وہ بین الاقوامی تعلقات میں آئیڈیالوجی کو ہی مؤثر عنصر سمجھتی ہے اور اس آئیڈیالوجی کے متعین کردہ مفادات کو ایک معاون عنصر (supporting factor) کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس لئے ریاست کو اس کے اختیار کردہ نظریاتی پہلو کے لحاظ سے پہچاننا لازم ہے، مثلاً فلاں ریاست کسی آئیڈیالوجی کی حامل ہے یا اس کی کوئی آئیڈیالوجی نہیں ہے۔ اس طرح ان عوامل کی معرفت حاصل ہو سکے گی جو اس کے بین الاقوامی تعلقات پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ چونکہ آئیڈیالوجی ہی وہ چیز ہے جو اسے اختیار کرنے والی ریاست پر اثر انداز ہوتی ہے اور نتیجتاً اس کے بین الاقوامی تعلقات اور بین الاقوامی صورتحال پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، اس لئے دنیا پر راج کرنے والی آئیڈیالوجیز Ideologies کو پہچاننا لازمی ہے اور یہ بھی جاننا لازم ہے کہ یہ آئیڈیالوجیز (مبادی) موجودہ عالمی سیاست پر کس حد تک اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کے اندر کس حد تک مزید اثر انداز ہونے کی قابلیت موجود ہے اور یہ کہ مستقبل میں عالمی سیاست پر یہ کہاں تک اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ یوں ان آئیڈیالوجیز اور حال و مستقبل پر ان کے مرتب ہونے والے اثرات کی روشنی میں عالمی تعلقات کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اس وقت جب ہم پوری دنیا پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں صرف تین آئیڈیالوجیز نظر آتی ہیں: اسلام، سرمایہ داریت اور اشتراکیت۔ ان میں ہر آئیڈیالوجی کے حامل کروڑوں لوگ موجود ہیں، لیکن اس وقت اسلامی آئیڈیالوجی کی حامل کوئی ریاست موجود نہیں۔ لہذا نہ عالمی تعلقات میں اس کی کوئی جگہ ہے اور نہ ہی اس عالمی صورتحال پر اس کا اثر ہے میں جو اس وقت دنیا پر غالب ہے۔ جہاں تک اسلامی ریاست کی کارزارِ حیات میں دوبارہ واپسی کے راستے میں رکاوٹوں کا تعلق ہے جو یہ ممالک ڈالتے ہیں، جس کی وجہ سے امتِ مسلمہ میں اضطرابیت کو محسوس کیا جارہا ہے، اس کا عالمی صورتحال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ سب عالمی تعلقات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کیونکہ عالمی صورتِ حال اور عالمی تعلقات پر اثر انداز ہونے کا تقاضا ہے کہ ایک ایسی ریاست موجود ہو جو اسلامی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر اپنی داخلی و خارجی سیاست کے امور چلائے۔

اور جہاں تک عالمی سیاست کا مسلمانوں کی طرف متوجہ ہونے کی بات ہے، خصوصاً امریکی سیاست جو اس وقت اسلامی سرزمین کو اپنے تسلط کے منصوبوں کے مطابق ڈھالنے میں مصروف ہے۔ جیسا کہ 2003ء کا "عظیم مشرق وسطیٰ پلان" (Greater Middle East Plan) تو یہ سب اُس بڑھتے ہوئے اندیشے اور خوف کی علامت ہے جو ان ممالک کو مسلمانوں کی متوقع اسلامی ریاست کے قیام سے لاحق ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسلام عالمی سیاست میں بھی وہی مؤثر کردار ادا کر رہا ہے جو وہ اپنی ریاست کی حقیقی موجودگی کی صورت میں ادا کرے گا۔

جہاں تک دوسری دو آئیڈیالوجیز کی بات ہے تو دونوں آئیڈیالوجیز کی حامل کوئی ایک یا ایک سے زائد مملکتیں دنیا میں موجود ہیں، اس لئے ان کا عالمی تعلقات اور عالمی سیاست پر اثر ہے، بالخصوص جب سوویت یونین اپنے سقوط سے پہلے کی حالت میں تھا۔ ان آئیڈیالوجیز (مبادی) کا ایک اثر یہ تھا کہ دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی تھی، مشرقی بلاک اور مغربی بلاک۔ لیکن مشرقی بلاک کے سقوط اور وارسا پیکٹ (Warsaw Pact) کے تحلیل ہونے کے ساتھ دو قطبی پالیسی (bi-polar policy) کا بھی خاتمہ ہوا۔ اور پھر اشتراکی مبدأ (کیمونزم) چین اور شمالی کوریا کے علاوہ کسی ریاست میں علامتی طور پر بھی نافذ نہیں رہا۔ چنانچہ دنیا میں بین الاقوامی جدوجہد اختتام پذیر ہو کر علاقائی جدوجہد بن گئی کیونکہ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد اس کی فکر عالمی

سیاست میں نمایاں کردار ادا نہ کر سکی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اشتراکیت کے فروغ کا نظریہ کہ جس پر ان کی خارجہ پالیسی کی بنیاد تھی، نفاذ سے محروم ہو گیا۔ جہاں تک ان ریاستوں کا تعلق ہے جو اب بھی اشتراکی آئیڈیالوجی کی علمبردار ہیں تو اب ان کی خارجہ پالیسی اس فکر کی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ چنانچہ چین کی پالیسی دنیا میں اشتراکیت کے فروغ کی بنیاد پر قائم نہیں ہے اوراس کی وجہ چینی قوم کے طبعی رجحانات ہیں جو صرف پڑوسی ایشیائی ممالک میں اثر ورسوخ پر اکتفاء کیے ہوئے ہے۔ تاریخی طور پر بھی اس کے عزائم عالمی اثر ورسوخ حاصل کرنے کے لئے نہیں رہے اور چینی قوم کی اس حقیقت کے سبب، چین نے کبھی بھی اپنے آپ کو اور اپنی قوت کو اس قابل بنانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ عالمی سیاست میں نمایاں مقام حاصل کرے۔ خلاصہ یہ کہ چین کی تمام تر کوششیں صرف اپنے اردگرد کے علاقے میں اثر ونفوذ پیدا کرنے پر مرکوز رہی ہیں۔

جہاں تک سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کی بات ہے تو جس فکر پر ان کی پالیسی قائم ہے وہ پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کو فروغ دینا ہے، یعنی دین کی دنیاوی امور سے جدائی کی فکر۔ تاہم سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کی حامل ریاستیں متعدد ہونے اور باہمی اختلاف کے باوجود، سب متفقہ طور پر اپنی فکری قیادت یعنی سرمایہ داریت کو پوری دنیا میں پھیلانے اور زندگی کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کو دنیا پر غالب کرنے کی پالیسی پر گامزن ہیں۔

جہاں تک اس طریقہ کا تعلق ہے جو سرمایہ دارانہ بلاک اپنی فکر کے نفاذ کیلئے اپناتا ہے، تو وہ استعماریت (colonialism) ہے، یعنی مغلوب اقوام کا استحصال کرنے کیلئے ان پر سیاسی، عسکری اور ثقافتی تسلط قائم کرنا۔ یہ طریقہ کار متعین اور فکس ہے اوراس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی چاہے حکومتیں یا ان کے قوانین کتنے ہی بدل جائیں۔ چنانچہ استعماریت کے بارے میں لینن نے جو کچھ کہا کہ "یہ سرمایہ داریت کا انتہائی مرحلہ ہے" درست نہیں ہے، بلکہ استعماریت سرمایہ دارانہ نظریے کا ہی ایک حصہ ہے، یعنی یہ وہ طریقہ کار ہے جس کے ذریعے لوگوں تک سرمایہ داریت پھیلائی جاتی ہے۔ لہٰذا سرمایہ دارانہ بلاک کی خارجہ پالیسی اس کی فکر اور طریقہ کے حوالہ سے اٹل ہے، یہ ریاستوں کے اختلاف اور جھگڑوں کی وجہ سے تبدیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ

برطانیہ کی پالیسی امریکہ، فرانس، اٹلی اور تمام دوسرے سرمایہ دارانہ ممالک کی طرح یہ ہے کہ اپنی آئیڈیالوجی اور زندگی کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کو استعماری طریقہ سے فروغ دینا۔

مغربی بلاک یا کیمپ کے طریقہ کو سمجھتے وقت یہ بات مدِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اگرچہ یہ طریقہ استعمارانہ ہونے کی حیثیت سے اٹل ہے لیکن مغربی کیمپ کے استعماریت کو ممکن بنانے کے اسالیب میں اور اس کے متعلق نقطۂ نظر میں زمانے کے ساتھ ساتھ کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ان کی بعض تبدیلیاں وہ ہیں جو اس کے اسالیب اور استعمار کے بارے میں نقطۂ نظر میں اختلاف کے حوالے سے رونما ہوئیں۔ جہاں تک استعماری طریقے کے اسالیب میں تبدیلی کا تعلق ہے تو ماضی میں مغرب کا دارومدار فوجی تسلط پر رہا اور اسے قدیم استعماریت سے منسوب کیا جاتا ہے، لیکن پھر مغرب نے دیگر اسالیب کو اختیار کر لیا اور اسے جدید استعماریت کہا گیا۔ چنانچہ امریکہ سیاسی دباؤ اور ہراساں کرنے کی سرگرمیوں کے علاوہ اقتصادی پہلوؤں، جیسے قرضوں کی فراہمی، ترقیاتی سکیموں اور ماہرین وغیرہ پر انحصار کرنے لگا۔ پھر امریکہ ان نئے اسالیب کے ہمراہ دوبارہ عسکری تسلط کے استعمال کی طرف لوٹا، یعنی اپنے اثر ورسوخ اور خواہشات کے سامنے دیگر اقوام کو سرنگوں کرنے کے لئے کوشاں ہوا اور اپنے اثر ورسوخ کی نگرانی کیلئے اپنی نو آبادیات (colonies) میں فوجی اڈوں کے قیام پر توجہ دینے لگا۔ دوسری طرف برطانیہ کی توجہ ایجنٹ اشخاص پیدا کرنے کی طرف رہی، اس نے اپنی انٹیلی جنس کو استعمال کیا اور کئی ریاستوں کے حکام میں موجود اپنے ایجنٹوں اور بدنام تجارتی سودے بازیوں پر انحصار کرنے لگا۔ قرضوں پر اس کا اعتماد اس لئے کمزور ہوا کہ اس کی مالی حالت کمزور ہو گئی۔ اسی طرح فوجی اڈوں کے قیام پر بھی اس کا انحصار کم ہونے لگا کیونکہ اس کے عالمی اثر ورسوخ میں کمی آگئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود برطانیہ اپنی نو آبادیات کالونیوں میں یا ان کے نزدیک فوجی اڈے اور چھاؤنیاں تاحال قائم کئے ہوئے ہے، جیسا کہ قبرص میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ استعماریت کے اسالیب میں تبدیلی ایک لازمی جزو رہا ہے۔

جہاں تک استعماریت کی رائے میں تبدیلی کا تعلق ہے جو سرمایہ داریت کی فکر کے ساتھ بطورِ طریقہ کے مربوط ہے، تو یہ رائے دو معاملات کے مابین شش وپنج میں پڑ گئی ہے: ایک طرف سرمایہ دارانہ نظریے کے ساتھ استعماریت کے ربط کی مضبوطی ہے یعنی بعض کا خیال ہے کہ استعماریت محض سرمایہ داریت کے فروغ کا

ایک طریقہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ داریت کے فروغ کو ترجیح ہونی چاہئے۔ اور دوسری جانب اس ربط کی کمزوری ہے یعنی سب سے زیادہ ترجیح خود استعماریت کی ہونی چاہئے اور سرمایہ داریت کو ثانوی حیثیت دی جائے۔ چنانچہ استعماریت بذات خود ایک مقصد کی حیثیت حاصل کرنے لگی۔ سرمایہ دارانہ نظریے کے ساتھ استعماریت کے ربط کی اس کمزوری اور مضبوطی کا دارومدار ان ممالک پر ہے جن پر سرمایہ دار ممالک تسلط حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آیا یہ ممالک کسی تہذیب کے حامل ہیں جن پر تسلط پانے کے لئے ان پر سرمایہ داریت کی فاسد تہذیب کو مسلط کیا جائے اور ان کے وسائل لوٹے جائیں، اور آیا ان کی کوئی تہذیب نہیں ہے کہ جس سے ٹکراؤ کی ضرورت ہو، تو اس کو صرف کالونی بنا کر اس پر تسلط حاصل کیا جائے اور ان کے وسائل لوٹے جائیں۔ اس کی وضاحت اس سے ہوتی ہے کہ افریقہ کو صرف استحصال پر مبنی کالونی بنانے کی کشمکش میں مغربی ممالک پیش پیش رہے جبکہ افریقہ میں سرمایہ دارانہ نظریے کا فروغ نہ ہونے کے برابر تھا۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ کے درمیان اثر ورسوخ حاصل کرنے کی کشمکش میں صرف مادی لالچ ہی عروج پر تھا جیسے یوگنڈا اور روانڈا کی علاقائی جنگ، جو کئی سالوں تک جاری رہی اور جس میں لاکھوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ اسی طرح زائر (ڈیموکریٹک کانگو) کے واقعات وغیرہ۔ لہٰذا برطانیہ، اس کے یورپی اتحادیوں اور امریکہ نے افریقہ میں صرف مادی وسائل ہی کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ اس طرح افریقہ میں استعماریت، سرمایہ دارانہ نظریے کے طریقے کی بجائے بذاتِ خود مقصد بننے لگی۔ جبکہ عالم اسلام میں سے مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ یا وسطی ایشیاء اور جنوبی ایشیاء کے مادی مفادات کے استحصال کیلئے استعماری ممالک، جن کا سرغنہ امریکہ ہے، نے ایک طرف سیاسی، فوجی اور اقتصادی غلبہ اور تسلط کی کوششیں کیں تو دوسری جانب سرمایہ داریت کے فروغ کیلئے بہت سے پہلوؤں میں کوششیں کیں۔ مثلاً وہ "عورت کی آزادی" کی کانفرنسیں اور "عورت کی حکمرانی" کی باتیں کرتے تھے۔ اسی طرح مشرق وسطیٰ پلان (Middle East Plan) میں امریکہ کی طرف سے جو دیکھنے میں آیا یعنی ثقافتوں کی تعمیرِ نو کی آڑ میں ثقافتی تسلط کا حصول، اسی طرح بین المذاہب مکالمہ، ثقافتوں میں میل جول، تعلیم کے طریقہ کار میں ترمیم یا تغیر، ان تمام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا اپنی ثقافت اور تہذیب کے ساتھ رابطہ منقطع ہو جائے۔ اس طرح سرمایہ داریت کا طریقہ وقت کے ساتھ شکلیں بدلتا رہا لیکن اس کے باوجود استعماریت ہی سرمایہ داریت میں اساسی

رکن کی حیثیت رکھتی ہے، چاہے یہ سرمایہ داریت کو فروغ دینے کے لیے بطور طریقہ ہو یا یہ خود ایک مقصد بن جائے۔

سیاسی منصوبے اور اسالیب

سیاسی منصوبے اور وہ اسالیب جن کے ذریعے ان منصوبوں کو نافذ کیا جاتا ہے، ریاستوں کے مفادات کے تقاضوں کے پیش نظر تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اگرچہ منصوبوں میں اسالیب کی نسبت کم تبدیلی آتی ہے۔ منصوبے اور اسلوب کے درمیان فرق یہ ہے کہ منصوبہ وہ عام پالیسی ہوتی ہے جو آئیڈیالوجی کے فروغ یا اس کے طریقہ کیلئے درکار مقصد کو حاصل کرنے کیلئے تشکیل دی جاتی ہے۔ اور اسلوب ایک مخصوص پالیسی ہوتی ہے جو کہ جزوی طور پر منصوبے کے حصول اور اس کی مضبوطی میں مدد فراہم کرتی ہے۔ یہ بات عالمی سیاست کے مطالعہ سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

مثال کے طور پر عراق کیلئے امریکی منصوبہ یہ تھا کہ وہ کسی عالمی قرارداد کے ذریعے یا اس کے بغیر عراق پر قبضہ کرلے، پھر وہاں ایک ایسی حکومت قائم کرے جو اس قبضے کیلئے اقوام متحدہ کے ذریعے بین الاقوامی قانونی جواز فراہم کرسکے، جبکہ قبضہ کرتے وقت اس نے اقوام متحدہ کو نظر انداز کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ علاقائی سطح پر بھی اس قبضے کو قانونی جواز فراہم کرنے کے لئے عراقی انتخابات جیسا کچھ کیا جائے۔ پھر یہ حکومت عراقیوں کا نمائندہ بن کر قابض قوتوں کی موجودگی پر رضامندی کے کاغذات پر دستخط کرے، تاکہ اس بات کو قانونی حیثیت دیدی جائے کہ یہ اس ملک کے لوگوں کی رضامندی اور مطالبے اور عالمی قرارداد کی بنا پر ہوا

ہے۔ یہ امر دوسرے ممالک اور سلامتی کونسل کو عراق کے معاملات میں دخل دینے سے دور رکھے گا اور امریکہ عراق کے تمام معاملات میں سیاہ وسفید کا مالک بن جائے گا، یوں اس قبضے کو مکمل جواز حاصل ہو گا کیونکہ عراق کی قانونی اور منتخب حکومت نے ہی امریکہ کی موجودگی اور قیام کو تسلیم کیا ہے۔ اور قابض قوت کی زیر نگرانی عراق کیلئے عنقریب ایک نیا دستور مرتب کیا جائے گا جس میں علیحدگی کو مقدس بنایا جائے گا، فیڈرل ازم (وفاق پسندی) کے بہانے ریاست کے ٹکڑے کئے جائیں گے اور فرقہ واریت کی آگ بھڑکائی جائیگی۔ چنانچہ مسلمان بجائے اس کے کہ وہ قابض قوت کے ساتھ لڑیں، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار (دست وگریباں) ہوں گے۔ اس لئے امریکہ عراق پر قبضہ کے طے شدہ منصوبے کیلئے وہ تمام وسائل اور اسالیب بروئے کار لایا جو اس کے بس میں تھے۔ پھر اس قبضہ کو اس طرح جواز فراہم کیا کہ اس کو عالمی اور علاقائی سطح پر قانونی شکل دلوادی۔

دوسری طرف فرانس کا منصوبہ امریکی منصوبے سے نبٹنے کیلئے یہ تھا کہ اس کی قیادت میں بڑی ریاستوں کا ایک محور تشکیل دیا جائے۔ اس منصوبے نے سلامتی کونسل کو امریکی منصوبوں کو جواز فراہم کرنے کیلئے ایسی واضح قراردادوں کو پاس کرنے سے روکا جو عراقی جنگ کیلئے سلامتی کونسل کو استعمال کرنے سے متعلق تھیں۔ اس طرح امریکہ سلامتی کونسل کے کارڈ کو مکمل طور پر نہ کھیل سکا اور عالمی سطح پر امریکہ ایک باغی ریاست کے طور پر بے نقاب ہوا۔ اور دنیا نے دیکھا کہ امریکہ بجائے اس کے کہ وہ عالمی قوانین کی حفاظت کرتا، عالمی قوانین سے بغاوت کرنے والی ایک غاصب قوت کے راستے پر چل پڑا ہے، اور فرانس اس قابل ہوا کہ وہ جرمنی کے لوگوں کے احساسات کو متحرک کرے اور ان کے جذبات کو اس حد تک مشتعل کر دیا کہ انہوں نے امریکی کاروائیوں کے سامنے ایک مزاحمت کھڑی کر دی۔ دوسری طرف روس فرانس کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور اس نے امریکہ کی طرف سے اپنے منصوبوں کے لیے سلامتی کونسل کے استعمال کی مخالفت کی۔ اس طرح فرانس کا منصوبہ امریکی جنگ کو روکنے کی بجائے ان امریکی اہداف کو بے نقاب کرنے میں کامیاب رہا جو وہ اس جنگ سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔

جہاں تک برطانوی منصوبے کا تعلق ہے تو وہ ایک پیچیدہ اور غلیظ قسم کا منصوبہ تھا، برطانیہ عراق کی جنگ میں غنیمت میں سے اپنے لیے کچھ حصہ پانے کیلئے ظاہری طور پر امریکہ کی پشت پناہی کر رہا تھا، جب امریکہ کا پلڑا بھاری ہوتا تو وہ عالمی سٹیج پر امریکہ کا ساتھ دیتا، جبکہ موقع پا کر امریکہ کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیتا تھا۔ چنانچہ برطانیہ امریکہ کا ساتھ دیتا رہا کیونکہ امریکہ کا پلڑا بھاری تھا لیکن دوسری طرف اس نے امریکہ کو عراق پر چڑھائی کرنے کیلئے سلامتی کونسل سے قرارداد منظور کروانے کی درخواست پر مجبور کیا، حالانکہ برطانیہ پہلے سے ہی یہ جانتا تھا کہ فرانس، روس اور جرمنی کے موقف کی وجہ سے اس طرح کی قرارداد ممکن نہیں۔ اس طرح امریکہ کا غلط طرزِ عمل فاش ہو گیا کہ وہ ہر صورت عراق پر چڑھائی کرنا چاہتا ہے اور اسے قرارداد کی منظوری یا عدم منظوری کی کوئی پروا نہیں۔ برطانیہ نے 20 ستمبر 2003 میں شیراک اور شروڈر کے ساتھ ایک سربراہی سیمینار میں بلئیر کی شرکت کے ذریعے اسی تجویز پر زور دیا اور امریکی موقف کے خلاف دونوں ریاستوں کے موقفوں کی مضبوطی کیلئے اپنی روایتی سیاسی چالاکی کو استعمال کیا اور ان ممالک کو ایسی بعض آراء کے ذریعے مشتعل کر دیا جو برطانیہ کی طرف سے متعارف کرائی گئی تھیں۔ اس طرح برطانیہ نے امریکہ کے سامنے اپنی نیت کو ظاہر کئے بغیر ان دونوں ممالک کو اس طرف دھکیلا کہ وہ امریکہ کے سامنے غیر لچکدار رویہ اختیار کریں۔ برطانیہ عراق پر امریکی قبضے سے لے کر امریکہ کی طرف سے اپنے قبضے کو قانونی جواز فراہم کرنے کیلئے اقوام متحدہ میں اپنے منصوبوں کو پیش کرنے تک اسی پالیسی پر گامزن رہا۔

ایک اور مثال یہ ہے کہ امریکہ نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ یورپی اتحاد کو حقیقی معنوں میں اتحاد بن جانے اور امریکہ کیلئے خطرہ بن جانے سے روکا جائے۔ اس منصوبہ کی بنیاد تین محوروں پر تھی:

اولاً : یورپی یونین کی مشرقی یورپی ممالک کے ذریعے توسیع، جبکہ یہ ممالک امریکہ کے لے پالک اور ہراول دستہ ہیں، تاکہ یورپی یونین میں امریکہ کا اثر ورسوخ جگہ پالے۔ یہ تب واضح ہو گیا جب ان ممالک نے عراق پر امریکی یلغار کی حمایت کی جس کی وجہ سے رمز فیلڈ نے یورپ پر قدیم وجدید یورپ کی پھبتیاں کسیں۔ فرانسیسی صدر شیراک ان ممالک کی رویہ کی وجہ سے آپے سے باہر ہو رہا تھا اور اس نے ان ممالک کو یہ اشارہ دینا چاہا کہ ان ممالک کا امریکہ کی طرف جھکاؤ ان کی یونین میں حتمی منظوری کو سبوتاژ کر کے رکھ دے گا۔

اس کے باوجود یورپی یونین کی حتمی میٹنگ میں ان کی شمولیت کو تسلیم کر لیا گیا، اور فرانس ان کی شمولیت کو روک نہ کر سکا۔

ثانیاً : وارسا معاہدہ کی تحلیل ہونے کے باوجود نیٹو کو برقرار رکھ کر اس کی اسٹریٹیجی میں توسیع کی جائے تاکہ امریکہ یورپ کے سلامتی کے امور میں دخل اندازی کر سکے، بجائے یہ کہ اس کا بیرونی خطرات سے دفاع کیا جائے، جیسا کہ نیٹو کی اصل تشکیل میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی تھی۔ اور جب یورپ کو اس اتحاد کے خطرے کا احساس ہوا، کیونکہ اس کی عملی قیادت امریکہ کے پاس تھی، تو فرانس، جرمنی، بلجیم اور لکسمبرگ نے نیٹو کی بجائے اسپیشل یورپی فورس تشکیل دینے کی بات کی۔ امریکہ نے اس پر اعتراض کیا اور وہ اس یورپی طاقت کے وجود میں آنے سے پہلے ہی یورپ کیلئے مشکلات پیدا کر رہا ہے۔

ثالثاً : امریکہ نے برطانیہ کی صورتحال سے فائدہ اُٹھایا۔ چونکہ برطانیہ اپنی معروف چالاکی کو استعمال کرتے ہوئے یورپی یونین کے ایک واحد مربوط طاقت بننے کو پسند نہیں کرتا کہ جس کے اندر برطانیہ تحلیل ہو کر رہ جائے اور وہ لکسمبرگ جیسی ایک معمولی ریاست بن جائے۔ یہ اس لئے کہ برطانیہ اب بھی اپنی اس شہنشاہیت کی عظمت کو بھولا نہیں ہے جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے اس یونین کی تشکیل کو الجھایا اور اس میں شمولیت تب ہی اختیار کی جب واقعتاً یورپی یونین وجود پذیر ہوئی اور یہ شمولیت بھی اس کو ناکام بنانے اور کمزور کرنے کیلئے تھی۔ تاحال برطانیہ یورپی کرنسی (یورو) میں شامل نہیں ہوا ہے۔ اپنی شہنشاہی ذہن کی وجہ سے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح وہ عالمی سطح پر اپنے لیے منفرد کردار تلاش کرے۔

اس کے بالمقابل فرانس کا منصوبہ یورپی یونین کو سہارا دینا، اس کو امریکی چھتری کے مقابلہ میں ایک مناسب اور موزون چھتری بنانا اور نیٹو سے آزاد یورپ کی ایک مستقل فوج بنانے کی کوشش کا تھا۔ فرانس نے جرمنی کو بھی اسی منصوبہ پر اپنا ہمنوا بنایا۔ فرانس نے جرمنی کے ساتھ معاہدہ کر کے ایسا مدبرانہ اقدام کیا جس کی وجہ سے برطانیہ بھی ان کے ساتھ شامل ہونے لگا تاکہ فرانس اور جرمنی کی کوششیں کامیاب ہونے کی صورت

میں اس کو بھی غنیمت میں حصہ ملے۔ اسی طرح فرانس، برطانیہ اور جرمنی کے ساتھ مل کر بالآخر اس فوج کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوا، اس کے باوجود کہ اس فوج کی تشکیل روکنے کیلئے امریکہ کی طرف سے جرمنی اور برطانیہ پر سخت دباؤ تھا۔ اور ان تینوں ممالک کا یورپی یونین کی طویل المیعاد پالیسیوں کی خاکہ سازی کا منصوبہ بھی کامیاب ہوا۔ اس منصوبہ کو یونین کے اندر موجود چھوٹی ریاستوں اور اٹلی و اسپین جیسی یونین پر اثرانداز ہونے کی خواہش مند لالچی ریاستوں کی مداخلت سے دور رکھا گیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جرمنی اور برطانیہ سے اتحاد کر کے یورپ کی آزاد فوج کی تشکیل کے ذریعے، فرانس یونین کو مضبوط کرنے کیلئے راستہ بنانے میں کامیاب ہوا، اگرچہ یہ ایک آغاز تھا۔ اگر یہ ریاستیں سرمایہ داریت کو ماننے والی نہ ہوتیں، جس میں ہر ریاست کا ذاتی فائدہ اس کی اقدار کے زمرے میں آتا ہے، تو یقیناً یہ ریاستیں امریکہ کے مقابلے میں ایک مضبوط یورپی یونین بنا سکتی تھیں۔ تاہم فرانس کی یورپ کی طاقتور ریاستوں (جرمنی اور برطانیہ) پر اس منصوبے کو امریکہ کے مقابلے میں پیش کرنے میں کامیابی ایک غیر معمولی اقدام سمجھا جاتا ہے جسے امریکہ کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اور مثلاً وہ منصوبہ جسے امریکہ نے روس کو لگام دینے اور اس کے اثر و نفوذ کو علاقائی سطح سے بھی کم کرنے کیلئے ترتیب دیا تھا۔ سو یہ منصوبہ روس کو اس کے اثر و رسوخ کے مقامات یعنی بلقان، مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا سے بیدخل کرنے، نیز اس کے جوہری اثاثوں کو تلف کرنے پر مبنی تھا جو اس کی طاقت کا اہم عامل ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ امریکہ اس پر خلائی تسخیر میں برتری حاصل کرے۔ چنانچہ امریکہ نے اس کیلئے متعدد اسالیب اختیار کئے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے کوسوو کے مسئلے کو ستعمال کرتے ہوئے یوگوسلاویہ (سربیا اور کوسوو) کی فوج پر حملہ کیا جہاں روس کے ساتھ سلاویہ کے نسلی تعلقات موجود ہیں۔ اسی طرح اپنا اثر و نفوذ پیدا کرنے کیلئے امریکہ نے مشرقی یورپ کے ممالک کے ساتھ اقتصادی اور عسکری تعلقات قائم کئے، پھر ان میں سے بہت سے ممالک کو نیٹو میں شامل کیا۔ اسی طرح اس نے دہشت گردی کے خلاف جنگ سے فائدہ اُٹھایا، چنانچہ اپنے لئے وسط ایشیائی ریاستوں میں فوجی اڈے قائم کئے اور یہ تب ہوا جبکہ اس نے اقتصادی امدادوں کے ذریعے ان ریاستوں کے بعض حکام کو اپنا تابع بنالیا، پھر امریکہ نے افغانستان پر قبضہ کرلیا۔ مزید

اس نے روسی میزائیلوں کے خلاف انٹی میزائل سسٹم تیار کرنا شروع کیا جو ایٹمی بم لیجانے والے روسی بین البراعظمی میزائل کا توڑ تھے۔ اس نے جارجیا کی غربت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں اپنے ایجنٹوں کو اختیارات کی چوٹی پر بٹھا دیا جس کی وجہ سے روس اور ترکی کے درمیان نیٹو کا بفر زون (buffer zone) ختم ہو گیا۔ اس نے روس کو اپنی خلائی اسٹیشن "میر" کو چھوڑنے اور بین الاقوامی خلائی اسٹیشن "آئی ایس ایس" میں شرکت کرنے پر قائل کر لیا تاکہ روس کو خلائی تسخیر کی دوڑ میں برتری سے روکا جائے۔ امریکہ روس کے گرد گھیرا تنگ کرنے کیلئے مسلسل اپنے منصوبوں کو جاری رکھے ہوئے ہے تاکہ وہ علاقائی سطح پر ایک غیر مؤثر ریاست بن جائے، جبکہ سوویت یونین کی شکست کے بعد اس کا عالمی اثر و نفوذ پہلے ہی ناپید ہو چکا ہے۔

امریکہ نے ایسا ہی چین کے ساتھ کیا، کیونکہ امریکہ چین کو زیر کرنے اور اسے محض ایک عام ریاست میں تبدیل کرنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ اگرچہ چین کے اندر سپر طاقت بننے کی صلاحیتیں نہیں ہیں لیکن وہ نوے کی دہائی کے نصف سے اپنی طاقت کے بل بوتے پر علاقے کی بڑی ریاست بن چکا ہے جس کو سلامتی کونسل میں ویٹو کا حق حاصل ہے۔ چین کے کچھ علاقائی خواہشات اور عزائم ہیں، جو امریکہ کو ناپسند ہیں۔ امریکہ کی نظر میں چین ایک بڑی تجارتی منڈی ہے جس سے خوب فائدہ اُٹھانا چاہئے اور یہ ایک انسانی دیو ہے جسے قابو کرنا ضروری ہے تاکہ وہ مشرقی ایشیاء کے علاقے میں امریکی مفادات کیلئے خطرہ نہ بن سکے۔ اس لئے امریکہ کو سرد جنگ کے اختتام کے بعد چین کو لگام دینے کیلئے منصوبہ سازی کرنی پڑی تاکہ اگر اس کو اس کے اثرورسوخ کے علاقوں سے مکمل طور پر بیدخل نہ کر سکے تو کم از کم اس کو اچھے طریقے سے اس کے اثرورسوخ والے کسی تنگ علاقے میں محصور کر دے۔ اس لئے وہ ویت نام کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے پر توجہ دے رہا ہے، یوں امریکہ ویت نام کے ساتھ تعلقات کی بہتری کے بعد چین کے راستے میں ایک رکاوٹ کھڑی کر دے گا۔ امریکہ جزیرہ نمائے کوریا کو چین کے ارد گرد اعلیٰ درجے کی ایک خطرناک لکیر بنانے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ شمالی کوریا پر بدی کا محور ہونے کا فرضی بہانہ بنا کر اس پر پابندیاں بڑھا دی جائیں، جبکہ انہی حالات میں وہ چین کی سرحد سے متصل، بلکہ اس کے دروازے پر اپنی عسکری اڈوں کو باقی رکھنے پر عمل پیرا ہے۔ امریکہ کی یہ کوشش بھی ہے کہ انڈیا، چین کا ہم پلہ ہو جائے اور وہ مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیا میں علاقائی فوجی معاہدے کرے

اوراسٹریٹجک اتحادی پیدا کرے۔ دوسری طرف امریکہ نے وسطی ایشیا میں چین کے مغربی بارڈر پر ہمالیہ کے اُس پار عسکری اڈے قائم کر لیے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیاسی منصوبے اور اسالیب فوری کاروائی کیلئے طے کئے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ امر بعید از امکان نہیں کہ کوئی ریاست اپنا موجودہ اسلوب تبدیل کرلے اور موجودہ اسالیب کے بے نقاب ہونے اور کارآمد نہ ہونے کی صورت میں دوسرے اسالیب تلاش کرے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ منصوبے کو یکسر بدل ڈالے، جب وہ بے فائدہ ہو جائے یا اس منصوبے کا جاری رہنا ریاست کیلئے غیر ضروری مسائل کا سبب بنے۔ البتہ جب ایک ریاست اپنا منصوبہ تبدیل کرتی ہے تو اس کی جگہ کوئی دوسرا منصوبہ بنالیتی ہے، اسی طرح جب ایک اسلوب کو تبدیل کرتی ہے تو اس کی جگہ کوئی دوسرا اسلوب اپنالیتی ہے۔ ایک ریاست مسلسل مختلف منصوبوں اور اسالیب کو اختیار کرنے میں لگی رہتی ہے سوائے اس کے کہ جب وہ عالمی صورتحال میں اپنا مقام کھو بیٹھے اور کمزور ہو جائے۔ جیسا کہ وہ ریاستیں جن کی سیاسی صلاحیت اور قوت کی تاثیر باقی نہیں رہی، جیسے جاپان، اٹلی، ہالینڈ، بلجیم، اسپین اور پرتگال۔

منصوبہ تبدیل کر دینے کی مثال وہ ہے جو امریکہ نے جرمنی کیلئے بنائے اپنے منصوبہ کے حوالے سے کیا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ جرمن عسکریت پسندی کو جگایا جائے اور ایک مغربی جرمن جمہوری ریاست قائم کی جائے۔ پھر اس نے اپنا منصوبہ تبدیل کیا اور اس نے مغربی جرمنی کو کمزور کرنے، اس کے اور مشرقی جرمنی کے درمیان اتحاد قائم کرنے اور جرمنی کی اسلحہ سازی کی حد بندی کرنے کی منصوبے پر عمل کرنا شروع کیا۔ پھر امریکہ نے 1990ء میں مغربی اور مشرقی جرمنی کے اتحاد کا تہیہ کر لیا تاکہ ایک ایسی طاقتور مغربی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے جو فرانس اور برطانیہ کے ساتھ پنجہ آزمائی کر سکے اور ان دونوں کے ساتھ یورپی یونین کی قیادت لینے پر مقابلہ کر سکے۔ اس منصوبے کے ذریعے امریکہ نے یورپ کے ایک قوت کی شکل میں ممکنہ اتحاد کو کمزور کیا۔

اسی طرح وہ منصوبہ جو امریکہ نے چین کیلئے تیار کیا، چنانچہ پہلے اس نے چین کو عالمی نظام world (order) کا ستون بنانے کیلئے اس کے ساتھ تعاون اور اس کو بین الاقوامی کھلاڑی بنانے، اس کے ساتھ تعلقات کی بہتری، نیز چین اور جاپان کے درمیان اچھے تعلقات کے قیام کی پلاننگ کی تاکہ اس وقت کے سوویت یونین کی بین الاقوامی صورتحال کو کمزور کیا جائے، نیز اپنی جانی دشمن، دو کمیونسٹ اتحادی ریاستوں کے درمیان پھوٹ بڑھائی جائے۔ سرد جنگ کے خاتمے پر امریکہ نے اپنا منصوبہ تبدیل کیا اور حالات کے تقاضے کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے چین کو نکیل ڈالنے کے منصوبے کی ضرورت محسوس کی اور اس کو دیوار چین کے اس پار محصور کرنے کا سوچا۔ چنانچہ اسے ایک منصوبہ بنانے کی ضرورت پڑی تاکہ امریکہ کو اس کی فکر نہ ہو کہ چین مشرقی ایشیا میں اس کے مفادات کیلئے خطرہ ثابت ہو گا، بالخصوص جبکہ چین کے پاس یہ صلاحیت موجود ہے۔

اسالیب کی تبدیلی کی مثال، جیسا کہ عالم اسلام کے حوالے سے امریکہ نے کیا۔ ماضی میں اپنے ایجنٹوں کو اقتدار تک پہنچانے کیلئے امریکہ نے فوجی انقلابات اور اقتصادی امدادوں، جیسے قرضے، ترقیاتی منصوبے اور تجربہ کار افراد کی فراہمی وغیرہ کا سہارا لیا، مزید برآں وہ دھمکانے اور لالچ دینے کی پالیسی کو اختیار کرتا تھا، اب وہ فوجی حل اور دھمکیوں پر یقین رکھتا ہے، وہ فوجی معاہدوں اور فوجی اڈوں کے قیام کی طرف دوبارہ لوٹ آیا ہے جبکہ وہ ان چیزوں کو ترک کر چکا تھا جو فوجی استعمار اور مغربی سامراجیت کی یاد دلاتی تھیں۔

برطانیہ نے بھی اپنے اسالیب تبدیل کئے۔ چنانچہ اس نے فوجی معاہدوں اور اڈوں کو چھوڑ دیا اور ایجنٹ حکمرانوں، اقتصادی سمجھوتوں اور اسلحہ کی فروخت کے معاہدوں پر بھروسہ کرنے لگا۔ تاہم اب ایسا لگتا ہے کہ برطانیہ بھی امریکہ کے پیچھے چل پڑا ہے، اب وہ بھی عسکری اڈوں کے قیام کو پھر سے اسلوب کے طور پر اختیار کرنے لگا ہے۔

یہ سیاسی منصوبوں اور اسالیب کا بیان تھا۔ اس لئے مسلمانوں کیلئے یقیناً یہ جاننا ضروری ہے کہ مغربی کیمپ کی سیاسی فکر اور طریقہ کار میں تبدیلی نہیں آتی، البتہ وہ نئے منصوبوں اور اسالیب کو تشکیل دیتے وقت پچھلے منصوبوں اور اسالیب کو تبدیل کرتا ہے تاکہ اپنی آئیڈیالوجی کو پھیلایا جاسکے۔ اگر اس کے اسالیب اور

منصوبے نتیجہ خیز ثابت نہ ہوں تو اس کے وہ پروگرام بھی ناکام ہو جاتے ہیں جن کیلئے یہ منصوبے اور اسالیب بنائے گئے تھے۔ لہٰذا سیاسی جدوجہد کا ہدف یہ ہونا چاہئے کہ منصوبوں اور اسالیب کو بے نقاب کیا جائے اور ان کا مقابلہ کیا جائے اور بیک وقت سیاسی نظریے اور اس کے پھیلاؤ کے طریقہ کار کے خلاف جدوجہد کی جائے۔ اس بناپر مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ہر ریاست کے تشکیل کردہ منصوبوں کو جانیں اور ان کے اسالیب کے درمیان پائے جانے والے فرق سے آگاہ ہوں۔

عالمی صورتِ حال

عالمی صورتِ حال سے آگاہی ہر ریاست کی پالیسی کے بارے میں آگاہی سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ بااثر ریاستوں کی پالیسیوں کو سمجھنے کا تعلق اس فکر اور طریقہ کی سمجھ سے ہے، جس پر ان ریاستوں کی سیاست کی بنیاد ہوتی ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا۔ جہاں تک عالمی صورتحال کا تعلق ہے تو یہ مؤثر بین الاقوامی تعلقات کی شکل و ہیئت کا نام ہے، بالفاظِ دیگر یہ نمبر ون طاقت اور اس سے مقابلہ کرنے والی ریاستوں کی صورتِ حال کا نام ہے۔ اس کا تعلق فکر اور طریقہ کے ساتھ نہیں بلکہ اس کا تعلق عالمی تعلقات اور عالمی طاقت کے منصب کیلئے ریاستوں کے باہمی مقابلے اور عالمی سیاست پر اثر انداز ہونے کے ساتھ ہے۔ اس لئے عالمی صورتحال کو سمجھنا ضروری ہے۔

یہ واضح ہونا ضروری ہے کہ عالمی صورتحال ہمیشہ یکساں نہیں رہتی بلکہ عالمی حالات اور واقعات کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ اس کی واضح تصویر کھینچی جائے اور اس کے بارے میں رہنما اصول دیئے جائیں اور اس کے مختلف حالات کے بارے میں تفصیلات دی جائیں لیکن یہ سب اس وقت اس کی حالت پر دلالت کرتا ہے جب یہ صورتحال منظر کشی کے وقت لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائے، یوں یہ تصویر کشی ایک ایسی حقیقت کے بارے میں ہو گی جو واقعی میں موجود ہے اور جب عالمی صورتِ حال بدل جاتی ہے تو اس کی گذشتہ تعبیر غلط نہیں ہو گی بلکہ یہ ایک ایسی تعبیر تصور کی جائیگی جو کہ اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ اور پھر موجودہ حقیقت یعنی نئی عالمی صورتِ حال کی تصویر کشی ضروری ہو جاتی ہے۔ اس لئے جب ہم عالمی صورتِ حال کی تصویر کشی کریں یا رہنما اصول دیں یا اس کی تفصیلات دیں تو وہ گذشتہ مشاہدہ کی گئی حقیقت کی تصویر کشی ہو گی یا موجودہ حقیقت کی، یا جو متوقع ہو، اور یہ کوئی حتمی امر نہیں ہوتا۔ اس لئے ایک سیاست دان پر لازم ہے کہ عالمی صورتِ حال اور عالمی سیاست کے بارے میں اس کے پاس معلومات موجود ہوں تاکہ وہ انہیں اپنے مشاہدہ کے ساتھ جوڑے تاکہ اس کے سامنے حقیقت واضح ہو جائے اور وہ اس کے متعلق فیصلہ دے سکے۔

عالمی صورتِ حال کو سمجھنا مسلمانوں سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس بات سے آگاہ ہوں کہ دنیا کی عالمی طاقت کون ہے اور اس طاقت کے لحاظ سے دوسری ریاستوں کی اور عالمی سیاست کی پوزیشن کیا ہے۔ نیز یہ اس بات کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ ہمیں آگاہی حاصل ہو کہ ماتحت ریاستیں کونسی ہیں، وہ کونسی ریاستیں ہیں جو دیگر ریاستوں کے زیر اثر اس کے محور میں گھومتی ہیں جبکہ آزاد ریاستیں کونسی ہیں۔

ماتحت ریاست وہ ریاست کہلاتی ہے جو اپنی خارجہ پالیسی اور بعض داخلی مسائل میں کسی دوسری ریاست کے ساتھ بندھی ہوئی ہوتی ہے جیسے مصر کے امریکا کے ساتھ اور قازقستان کے روس کے ساتھ حالیہ تعلقات ہیں۔

زیر اثر ریاست وہ کہلاتی ہے جو دوسری ریاست کے ماتحت نہیں ہوتی مگر مفاد کی بنیاد پر اس کی خارجہ پالیسی دوسری ریاست سے منسلک ہوتی ہے۔ جیسے جاپان کا امریکہ کے ساتھ، آسٹریلیا کا امریکا اور برطانیہ کے

ساتھ، کینیڈا کا برطانیہ امریکہ اور فرانس کے ساتھ، موجودہ ترکی کا برطانیہ اور امریکہ کے ساتھ تعلق ہے۔ آزاد ریاست وہ ریاست ہوتی ہے جو اپنی خارجہ وداخلہ پالیسیوں کو اپنے مفادات کے مطابق جیسے چاہے مرتب کرتی ہے جیسے فرانس، چین اور روس۔

کچھ حالات وہ ہیں جو عالمی سیاست کے تحت نہیں آتے بلکہ یہ استعماری ممالک کے اپنی کالونیوں سے نکلنے کی وجہ سے پیدا شدہ حالات ہوتے ہیں۔ اس قسم کے حالات عالمی سیاست کے تحت نہیں آتے ہیں، اور نہ ہی ان پر عالمی سیاست میں بحث کی جاتی ہے اور نہ اس کے بارے میں رہنما اصول دیے جاسکتے ہیں بلکہ ہر حالت کو اس کے واقع کے تناظر میں دیکھ کر اس پر حکم لگایا جائے گا۔ مثلاً عراق سے جب انگریزوں کا انخلا ہو گیا اور جولائی 1958ء کا انقلاب آیا اور تمام معاہدے اور تعلقات منسوخ ہو گئے، تب وہ فرانس، برطانیہ یا دوسری آزاد ریاستوں کی طرح ایک آزاد ریاست بن گئی۔ لیکن چونکہ اس کا حکمران اس وقت امریکی ایجنٹ تھا، اس لئے عراق درحقیقت امریکہ کی ماتحت ریاست بن گئی، اگرچہ عالمی سطح پر وہ ایک آزاد ریاست تھی۔ پھر جب 17 جولائی 1968 کا انقلاب آیا اور حکومت انگریزوں کے ایجنٹوں کے ہاتھوں میں آگئی تو عراق برطانیہ کے ماتحت ہو گیا۔

لہٰذا آزاد ریاستوں کا حکمران جب ایجنٹ بن جاتا ہے یا ان میں ایجنٹ شخصیت کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے، تب یہ ریاست اس ریاست کے ماتحت ہو جاتی ہے اس ریاست کا حکمران جس کا ایجنٹ ہوتا ہے۔

اس طرح وہ تمام ریاستیں جو نو آبادیات تھیں، ان پر بھی اس قسم کے حالات آتے رہتے ہیں۔ یہ حکمرانوں کی تبدیلی کے نتیجے میں ایک ریاست کے ہاتھ سے دوسری ریاست کے ہاتھ میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ تو اس طرح کی ریاستیں بظاہر عالمی پہلو سے اگرچہ آزاد ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں وہ ماتحت ہوتی ہیں۔ البتہ یہ عالمی صورتِ حال سے الگ حالات ہیں جو کہ ایک استعمار سے نو آبادیاتی کالونی کی آزادی یا استعماری ریاستوں کے اپنی سابقہ نو آبادیات کو دوبارا کالونی بنانے یا انخلا کرنے والے استعماری ملک کی جگہ دوسری ریاستوں کی طرف سے اس کالونی کو اپنے زیر اثر لانے کی کوششوں سے پیدا ہوتے ہیں۔

جس چیز کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے وہ دنیا کی اوّلین ریاست (leading state) کو سمجھنا ہے، کیونکہ عالمی سیاست اور عالمی صورتِ حال کو سمجھنے میں اس کی اہمیت ہے۔ چنانچہ امن کی حالت میں نمبر وَن یا سپر طاقت ہی عالمی صورتحال میں مؤثر طاقت ہوتی ہے جبکہ بقیہ ریاستوں میں سے عالمی نمبر دو ریاست اور دیگر ریاستیں عالمی صورتحال پر اثر انداز ہونے میں اپنی قابلیت کے اعتبار سے برابر ہوتی ہیں۔

جہاں تک باقی ریاستوں کی بات ہے تو ان کا درجہ ان ریاستوں کے بعد ہے جو سپر طاقت پر دباؤ ڈال سکتی ہوں اور یہ دباؤ ان ممالک کی ذاتی طاقت اور بین الاقوامی اثر ورسوخ کے اعتبار سے مختلف ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ایک ریاست اپنی قوت اور عالمی وزن کے بقدر سپر طاقت پر اثرانداز ہوکر نتیجتاً عالمی سیاست پر اثرانداز ہوسکتی ہے۔

سپر طاقت پر اثرانداز ہوکر عالمی سیاست پر اثرانداز ہونے کی سب سے واضح مثال ان دنوں (2004) میں برطانیہ کی ہے۔ چنانچہ اس کا عالمی سیاست پر اثر کسی حد تک امریکہ پر اثرانداز ہونے کی وجہ سے ہے جو عالمی سپر طاقت ہے۔ اس طرح وہ عالمی سیاست پر اس طرح بھی اثرانداز ہوتا ہے کہ وہ اپنی سابقہ کالونیوں پر برابر اثر ورسوخ قائم رکھے ہوئے ہے۔ عراق کے خلاف امریکہ وبرطانیہ کی جنگ کے بعد فرانس، روس اور جرمنی نے مل کر کام کیا تاکہ نمبر وَن طاقت پر اثرانداز ہوکر عالمی سیاست پر اثرانداز ہوسکیں۔

وہ ممالک جن کا سپر یعنی نمبر وَن طاقت پر کوئی اثر ورسوخ نہیں ہوتا اور نتیجتاً ان کا عالمی سیاست میں مستقل کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ ماتحت ریاستیں ہیں اور وہ ریاستیں جو دیگر ریاستوں کے زیر اثر اس کے محور میں گھومتی ہیں۔ جہاں تک ماتحت ریاست کا تعلق ہے تو وہ نمبر وَن طاقت پر اُتنا ہی اثرانداز ہوسکتی ہے جتنا کہ وہ اس کو استعمال کرتی ہے۔ اسی طرح زیر اثر ریاستیں عالمی صورتِ حال پر بڑی طاقتوں کے بل بوتے پر اثرانداز ہوتی ہیں کہ جس کے زیر اثر وہ ہوتی ہیں۔

باقی رہے وہ ممالک جو ماتحت نہیں، یا زیر اثر نہیں، یعنی آزاد ریاستیں، مثلاً سویزرلینڈ، اسپین، ہالینڈ، اٹلی، سویڈن، یہ بین الاقوامی سیاست پر اسی وقت اثرانداز ہوتی ہیں جب وہ سپر طاقت کے مفادات کی پاسبانی

کریں، یا اس کیلئے خطرہ بنیں۔ اس کی مثال اٹلی اور اسپین ہیں جنہوں نے امریکہ کی اہم ترین مفاد کا خیال رکھا اور 2003 میں امریکہ کے عراق پر قبضے میں اس کے ساتھ تعاون کیا۔

اس لئے کوئی بھی ریاست جو عالمی سیاست پر اثر انداز ہونا چاہتی ہے اور عالمی سیاست کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے اسے ان دو راستوں میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑے گا، یا تو عالمی صورتحال میں سپر طاقت کے حقیقی مفادات کیلئے مؤثر خطرات پیدا کرے، یا پھر اپنے لیے فائدہ حاصل کرنے کے لیے سپر طاقت کے ساتھ سودے بازی کرے اور بدلے میں اس کے مفادات کا تحفظ کرے۔

سپر طاقت کے لیے حقیقی خطرہ بن جانا ہی وہ رستہ ہے جو عالمی صورتِ حال پر اثر انداز ہونے کے لیے کارگر ثابت ہوتا ہے۔ وہ حقیقی ریاست جو اس بات کو اپنا ہدف بناتی ہے کہ عالمی سطح پر اس کی بات سنی جائے اور وہ یقینی طور پر عالمی صورتِ حال ہو اثر انداز ہو، اس کے لیے یہی رستہ موزوں ہے۔ جبکہ دوسرا راستہ جس کا مطلب مفادات کا تحفظ ہوتا ہے ایک غیر یقینی راستہ ہے جس میں پاؤں پھسل جانے کا خطرہ ہوتا ہے، اس سے کبھی کبھار مقصد کا حصول ہو جاتا ہے اور کبھی یہ تباہی کا باعث بنتا ہے کیونکہ یہ کسی بھی قوم کے وجود کو داؤ پر لگانے کے مترادف ہے۔ اور یہ کسی ریاست کے مقدر کیلئے احمقانہ مہم جوئی ہو گی، کیونکہ کسی ریاست کی جانب سے سپر ریاست کے مفادات کا تحفظ، سپر ریاست کو اس بات سے نہیں روکتا کہ کسی اور ریاست کے ساتھ اس کے مفادات پر سودے بازی کرے۔

چنانچہ امریکہ نے 2003 میں مغربی یورپی ممالک کو نظر انداز کر دیا اور ان کو قدیم یورپ کا طعنہ دیا۔ اور ان کی جگہ لینے کیلئے مشرقی یورپی ریاستوں کو طرف دیکھنا شروع کر دیا، حتی کہ جب برطانیہ نے امریکہ کو اقوام متحدہ کی طرف رجوع کیے بغیر عراق پر چڑھائی کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی تو اس نے برطانیہ کو بھی اشارہ دیا۔ چنانچہ امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رمز فیلڈ نے کہا کہ امریکہ برطانیہ کے بغیر بھی عراق جا سکتا ہے۔

سپر طاقت کے مفادات کیلئے خطرہ بننے اور حقیقی طور پر اس پر اثر انداز ہونے کیلئے ضروری ہے کہ ریاست کے پاس اپنے دفاع کے وسائل اور داخلی صورتِ حال پر کنٹرول کے اسباب موجود ہوں۔ اس کا صحیح

واحد راستہ یہ ہے کہ یہ ریاست نشاۃِ ثانیہ کے رستے پر برابر چلتی رہے۔ یعنی یہ ریاست ایک آئیڈیالوجی کی حامل ہو اور اس کے پاس ایک عالمی پیغام ہو جسے وہ دنیا کے سامنے پیش کرے اور وہ اپنی پڑوسی ریاستوں سے اس کا آغاز کرے تاکہ وہ داخلہ امور میں کسی بھی مداخلت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے اور وہ اپنے آپ کو اپنی سرحدوں کی حفاظت تک ہی محدود نہ کرے بلکہ اپنی آئیڈیالوجی کو پھیلائے اور اپنے اثرورسوخ میں توسیع کرے، تاکہ عالمی صورتحال پر اثرانداز ہونے میں سپر طاقت کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔

کوئی ریاست عالمی سپر طاقت کو اس کے قائدانہ کردار سے جنبش دے سکے، اس کیلئے اسے سیاسی فضا کو اپنے موافق بنانا ضروری ہے، اور دوسری ریاستوں کو سیاسی طور پر اپنی طرف اور اپنی فکر کی طرف مائل کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے جرمنی نے کیا۔ اور جب کوئی ریاست یہ کر لے گی تو عالمی صورتحال غیر مستحکم ہو جائے گی اور اس بات کی گنجائش پیدا ہو جائے گی کہ اب کوئی دوسری ریاست سپر طاقت کا منصب سنبھال لے۔ یہ صورتحال عموماً اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک کوئی ایسی جنگ نہ ہو جائے جو عالمی صورتحال کو بدل ڈالے، خواہ عالمی ہو یا کسی محدود اور مخصوص علاقے میں ہو۔ یا یہ کہ جنگ شروع ہونے کا غالب گمان ہو اور سپر طاقت اس جنگ کے سلسلے میں اس ریاست کی محتاج ہو جائے جو بڑی طاقتوں کے گروہ میں اس کی مقابل ہو۔

دنیا میں عالمی سپر طاقت کا منصب کوئی نئی چیز نہیں بلکہ یہ پہلے بھی ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ قدیم تاریخ میں مصر سپر طاقت تھی اور عراق کی آشوری ریاست اس کے ساتھ مقابلہ کرتی تھی، اسی طرح رومی سلطنت سپر طاقت تھی جبکہ فارس اس منصب میں اس کے مدِ مقابل تھی، پھر خلفائے راشدین کے زمانے سے صلیبی جنگوں تک اسلامی ریاست سپر طاقت رہی اور روئے زمین پر اس کا کوئی مدِ مقابل نہ تھا۔ پھر فرانس سپر طاقت تھی اور برطانیہ اس کا مقابل تھا۔ ریاستِ عثمانیہ بحیثیت ایک اسلامی ریاست کے لگ بھگ تین صدیوں تک سپر طاقت رہی اور اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف تک کوئی اس کا مقابل نہیں تھا۔ جنگِ عظیم اول سے پہلے جرمنی سپر طاقت تھی اور فرانس اور برطانیہ اس منصب کے لیے جرمنی سے محاذ آرا تھے۔ جنگ عظیم اول کے بعد برطانیہ سپر طاقت تھی اور فرانس اس کے مدمقابل تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے برطانیہ سپر طاقت

تھی جبکہ جرمنی اس کا مدمقابل تھا، یہاں تک کہ جرمنی سپر طاقت بننے کے قریب ہی تھا کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور امریکہ اس جنگ میں شریک ہوا اور یہ جنگ امریکہ کی طرف سے سپر طاقت کا منصب ہتھیا لینے پر اختتام پذیر ہوئی۔ پھر اس نے عالمی سیاست اور عالمی صورتحال کا خاکہ تیار کیا کیونکہ اسے عالمی سیاست کو اپنا ہمنوا بنانے پر سب سے زیادہ قدرت حاصل تھی۔ عالمی صورتحال اسی کے کنٹرول میں رہی، جہاں صرف اس کے پسندیدہ سیاسی واقعات ہی وقوع پذیر ہوں اور اسی کی طے کردہ پالیسیوں پر عمل کیا جائے۔ اس کے باوجود اس وقت کا سوویت یونین، برطانیہ اور فرانس اس کے ساتھ مزاحمت کر رہے تھے اور اپنی قوت وطاقت کے لحاظ سے عالمی سیاست پر اثرانداز ہونے میں کسی حد تک ان کی بھی شراکت داری تھی، بالخصوص سوویت یونین سب سے زیادہ مضبوط انداز میں اور برطانیہ نسبتاً کمزور انداز میں عالمی سیاست پر اثرانداز ہوتا رہا۔

سوویت یونین امریکہ کے ساتھ ایک شریک اور اتحادی کے طور پر کھڑا رہنے میں کامیاب ہوا جبکہ برطانیہ پیچھے جاتا رہا اور تنزلی سے دوچار رہا، یہاں تک کہ وہ موجودہ حالت میں پہنچ گیا۔ ہوا یوں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ جنگ کی زد سے آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگا اور امریکہ کو سپر طاقت کے منصب سے ہٹانے کیلئے کوشش کرنے لگا اور امریکہ پر اثرانداز ہونے کیلئے سیاسی سرگرمیاں شروع کیں، چنانچہ اس نے کوریا جنگ میں محض علامتی طور پر شرکت کی اور چین کو امریکہ کی فوجی معلومات دینی شروع کیں، جبکہ درحقیقت چین ہی کوریا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس طرح برطانیہ اپنے خفیہ اور گھٹیا ذرائع سے امریکہ کی کوریا جنگ کے حوالے سے عالمی صورتحال پر اثرانداز ہونے کے قابل ہو سکا، جس کی وجہ سے امریکہ کا منصب ڈانواں ڈول ہو گیا۔ اسی طرح جنیوا کانفرنس میں، جو بھارت-چین کے مسائل حل کرنے کیلئے منعقد کی گئی تھی، برطانیہ مشرقی بلاک کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ چنانچہ اس کانفرنس میں وہ مشرقی بلاک کیلئے قراردادیں پاس کروا کے باہر آیا، مزید برآں وہ روس کو امریکہ کی فوجی اور انٹیلی جنس خبریں پہنچاتا رہا، ان میں سے وہ معلومات بھی ہیں جو اس نے روس کو U2 طیارے کے بارے میں فراہم کیں، نتیجتاً روس نے اس کو مار گرایا۔ اس کے علاوہ پیرس کانفرنس میں میک مولن، امریکی صدر آئزن ہاور کے خلاف خروشیف کے ساتھ کھڑا ہو گیا جس کی وجہ سے کانفرنس ناکام ہو گئی اور امریکہ کمزور پڑ گیا۔ امریکہ کو نیچا دکھانے کیلئے برطانیہ نے ان جیسی اور بھی بہت سی کاروائیاں کیں تاکہ سپر پاور کی

صورتحال پر اثر انداز ہو سکے، لیکن امریکہ یہ سب کچھ بھانپ گیا۔ اس کے بعد جب خروشیف اور کینیڈی کی ویانا میں ملاقات ہوئی، تب سے برطانیہ نے امریکہ کو زک پہنچانے کا موقف چھوڑ کر دفاعی موقف اپنالیا، کیونکہ تب سے روس (سوویت یونین) اور امریکہ نے عالمی معاملات سے برطانیہ کو نکال باہر کرنے کیلئے ایک ساتھ کام شروع کر دیا۔

بیشک سوویت یونین مغربی بلاک کے خلاف سرد جنگ بھڑکاتا رہا اوراس نے خاص کر امریکہ پر زیادہ توجہ دی، اس کی یہ کوشش تھی کہ مغربی بلاک کی باگ دوڑ امریکہ کی بجائے اپنے ہاتھ میں لے لے اور امریکہ کو سپر پاور کے منصب سے ہٹاکر وہ خود سپر پاور بن جائے۔ روس کی بہت سی کوششیں کامیاب ہوئیں، چنانچہ وہ اس قابل ہوا کہ امریکہ کو اس کے مضبوط قلعے (اقوامِ متحدہ) جسے وہ عالمی مسائل کے حل کیلئے استعمال کرتا ہے، سے نکال لے اور بین الاقوامی مسائل کے حل کے لیے اقوام متحدہ سے باہر کانفرنسیں منعقد کی جائیں۔ اور سپر پاور کے موقف کو کمزور کرنے کیلئے اس نے امریکہ کے ساتھ مقابلہ کرنے میں برطانیہ کی حوصلہ افزائی کی اور مغربی بلاک میں دراڑیں ڈالنے کی کوشش کی، اسی طرح اس نے فرانس اور امریکہ کے درمیان اختلافات بڑھائے، یوں سوویت یونین عالمی کاروائیوں پر بڑی حد تک اثر انداز ہوا، اس کے ساتھ ساتھ اس نے خلائی دوڑ میں اتنی ترقی کی کہ امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑ گیا، اسی طرح ایٹمی اسلحہ اور بین البراعظمی میزائل سسٹم میں بھی امریکہ سے آگے نکل گیا۔ نیز امریکہ کو چیلنج کرنے کیلئے اس نے کیوبا میں فوجی اڈہ بنایا، اور کانگو، مصر اور الجزائر وغیرہ میں امریکہ کے بہت سے (استعماری) اسالیب کا پردہ چاک کیا۔ اس سب کچھ سے امریکہ شدید متاثر ہوا لیکن وہ امریکہ کو سپر طاقت کے منصب سے نہ ہٹا سکا۔ ہاں عالمی سیاسی مسائل میں اسے چند جزوی کامیابیاں حاصل ہوئیں، تاہم سوویت یونین اس کے باوجود امریکہ پر سرد جنگ کے طرزِ عمل کے ذریعے حملہ کرنے سے ناامید نہیں ہوا، یہاں تک کہ 1961ء میں خروشیف کی کینڈی کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ دونوں رہنماؤں نے جون 1961ء میں آسٹریا کے دارالحکومت ویانا میں ملاقات کی اور دنیا کو آپس میں بانٹنے پر اتفاق کیا۔ اسی دن سے فرانس اور برطانیہ عالمی سیاست سے بے دخل ہوگئے اور اب سوویت یونین اور امریکہ ہی عالمی سیاست کی صورت گری کرنے لگے۔ عالمی سیاست میں اپنی آواز پیدا کرنے میں برطانیہ کی کوئی کوشش کامیاب

نہ ہوئی۔ اسی طرح فرانس بھی عالمی سیاست میں تھوڑی سی قدرت پیدا کرنے کیلئے ایک قدم بڑھانے میں بھی ناکام رہا، یہاں تک کہ ڈیگال کے دورِ حکومت میں بھی وہ ناکام رہا۔ 1989 تک یہی حالت رہی جب دیوار برلن گری اوراس کے دوسال بعد سوویت یونین باضابطہ طور پر تحلیل ہوااور سرد جنگ اختتام پذیر ہوگئی۔ گذشتہ صدی میں نوے کی دہائی کے آغاز میں روس اگرچہ رسمی طور پر سوویت یونین کے منصب کا جانشین بنا لیکن عالمی سیاست میں اس کو دوسرے درجے سے گرادیا گیا ،عالمی صورتِ حال نئی کروٹ لے چکی تھی جہاں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اب پہلی مرتبہ کسی عالمی شراکت دار کے بغیر تھااور دنیا ایسے دور میں داخل ہوئی جس کی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ امریکہ نے بش سینئر کے آخری ایام میں یک طرفہ عالمی پالیسی تشکیل دینے کی کوشش کی گئی اور جدید عالمی نظام New World Order کا نعرہ لگایا۔ لیکن یہ نظام کامیاب نہ ہوسکااور غیر یقینی کا شکار رہا، علاوہ ازیں 1992 میں کلنٹن کے زمامِ اقتدار سنبھالنے تک عالمی حالات بھی دھندلاہٹ کے شکار رہے۔ کلنٹن نے نیاعالمی نظام متعارف کرایا جس کا انحصار یک طرفیت کے بجائے برتری پر تھا،کلنٹن انتظامیہ نے اس نیو ورلڈ آرڈر کے ستون کھڑے کرنے شروع کیے،اس کا اہم ترین ستون دوسری بڑی طاقتوں کے ساتھ شراکت داری کی پالیسی تھی۔ یہ پالیسی بوسنیاہرزیگووینا اور کوسوو میں بلقان کے مسائل کے تصفیے کے دوران نظر آتی ہے اور روس کے ساتھ باہمی مفاہمت اختیار کرتے ہوئے یوکرائن اور بیلاروس (مغربی روس) میں ایٹمی اسلحہ کی تحلیل سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح امریکہ اور ان ممالک کے درمیان جو ماضی میں مشرقی بلاک کا حصہ رہے ہیں، مفاہمتی یادداشتوں پر دستخطیں ہوئیں۔ بعض یادداشتوں پر دستخط کرنے میں برطانیہ اور جرمنی نے بھی شرکت کی۔ یوں امریکہ شراکتی پالیسی کے بل بوتے پر اس عرصے کے دوران اس قابل ہوا کہ اُس نے مغربی یورپی ریاستوں کے ساتھ تعاون کے ذریعے نیٹو اتحاد کی توسیع کی۔ یہ تمام تر توسیع روس اور اس کے اثر ونفوذ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انجام دی گئی۔

یہ مرحلہ اس حیثیت سے منفرد ہے کہ اس دوران جرمنی کی قوت میں اضافہ ہوا، کیونکہ سوویت یونین کے کمزور پڑجانے، دیوارِ برلن کے سقوط اور مشرقی جرمنی کی پشت پناہی ختم ہونے کے ساتھ ہی مشرقی اور مغربی جرمنی کے درمیان بہت تیزی سے اتحاد ہوگیا،اور اس مرحلے میں جرمنی یورپ کی سب سے بڑی معاشی

طاقت بن گیا، ایک ایسی مؤثر سیاسی قوت کہ امریکہ اور یورپ اسے اپنے حق میں مائل کرنے لگے۔ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا کہ امریکہ، یورپ اور دنیا نے سلامتی کونسل کی مستقل رکن ریاستوں میں جرمنی کو بھی شامل کرنے کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔

اس نئی سیاسی صورتحال کے ساتھ نئی معاشی صورتحال نے جنم لیا جہاں بڑے پیمانے پر آزاد منڈی کی سیاست میں سرگرمی پیدا ہوئی۔ یہ پالیسی دنیا پر عالمگیریت (گلوبلائزیشن) کی صورت میں نمودار ہوئی جسے دنیا پر لاگو کیا گیا، چنانچہ کمپنیاں متحد ہو کر بڑے جن کی شکل اختیار کرنے لگیں اور ایک بڑے معاشی کھلاڑی کا روپ دھارنے لگیں جو حکومتوں پر اپنی پالیسیاں تھوپتا ہے، ملٹی نیشنل کمپنیاں معیشت دانوں کی زبان بن گئیں۔ 1995 میں GATT معاہدے کو مکمل طور پر عالمی تجارتی تنظیم (WTO) میں تبدیل کیا گیا، جو قانونی طور پر گلوبلائزیشن کی سیاست کو تحفظ فراہم کرے۔ عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے کردار کو اس طور سے فعال کیا گیا کہ بڑی ریاستوں کی جانب سے ان تینوں یعنی (WTO)، عالمی بینک اور آئی ایم ایف کو ممالک کی معاشی پالیسیوں میں مداخلت اور دباؤ کے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ سابق امریکی وزیر خارجہ لارنس ایگل برجر اور آئی ایم ایف کے مینیجنگ ڈائریکٹر مائیکل کام ڈیسس نے اعتراف کیا کہ ورلڈ بینک کو currency floating اور قرضوں سے محرومی کی پالیسی کے ذریعے صدر سوہارتو کی حکومت کو اُلٹنے کیلئے استعمال کیا گیا کہ اگر وہ اس پالیسی کو قبول نہیں کرتا ہے تو اس کی حکومت ختم کر دی جائے گی۔ اُس نے اِس دباؤ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور کرنسی کو float کیا تاہم اس کے بعد اسے حکومت سے اتار دیا گیا۔

G7 یعنی سات صنعتی ریاستوں کے کردار کو بھی روس کو اس میں شامل کر کے فعال کیا گیا۔ چنانچہ ان 8 ممالک امریکہ، جاپان، جرمنی، برطانیہ، فرانس، اٹلی، کینیڈا اور روس نے عالمی اقتصادی اور کرنسی سے متعلقہ پالیسیوں پر تسلط حاصل کیا۔ ان آٹھ ممالک کے ساتھ چین کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے، جو ایک بڑی اقتصادی اور ایٹمی طاقت ہے، اور ایک بہت بڑی آبادی ہے اور سلامتی کونسل میں مستقل سیٹ کی حامل ہے، ان وسائل کے ہوتے ہوئے ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں یہی نو ممالک ہی بڑی طاقتیں ہیں، تاہم ان ممالک کے طاقت کے لحاظ سے مختلف ہونے کی بنا پر ہم ان میں سے دو ممالک نکال دیتے ہیں، اٹلی اور کینیڈا، ان دونوں

ممالک کے پاس کوئی سیاسی یاجغرافیائی سیاسی قوت نہیں جو ان کو عالمی کردار کا اہل بنائے۔ اس بناپر عالمی سیاست میں سات ممالک ہی مؤثر ہیں: امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، روس، چین اور جاپان۔ عالمی اثر ونفوذ کے لحاظ سے یہ ممالک اگرچہ آپس میں مختلف ہیں تاہم پہلی پانچ ریاستیں دنیاکے مختلف علاقوں میں اپنااثرونفوذ قائم کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔ ان میں سے امریکہ کو باقی چاروں پر زبردست فوقیت حاصل ہے۔ چھٹی ریاست (چین) اپنے علاقائی دائرے میں اثرورسوخ کاخواہاں ہے۔ ساتویں ریاست (جاپان) دنیاکے مختلف علاقوں میں صرف اقتصادی بنیادوں پر اثرورسوخ کی خواہشمند ہے۔

فرانس کے سابق وزیرخارجہ ہوبرٹ ویڈرینHubert Védrine اپنی کتاب "گلوبلائزیشن کے دور میں فرانس "میں کہتاہے کہ یہ اکیلی قوت (امریکہ) جسے معیشت، ٹیکنالوجی، فوج، کرنسی، زبان اور ثقافتی میدانوں پر تسلط حاصل ہے، اس کی مثال پہلے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پھر ویڈرین قوت اور اثر کے اعتبار سے ریاستوں کی درجہ بندی کرتے ہوئے کہتاہے "امریکہ پوری دنیامیں کسی مدمقابل کے بغیر درجہ اول کی ریاست ہے، اس کے بعد دوسرے درجہ پر وہ سات ریاستیں آتی ہیں جو عالمی اثرورسوخ رکھتی ہیں، فرانس، برطانیہ، جرمنی، روس، چین، جاپان اور انڈیا، بشرطیکہ یہ ریاستیں اپنی ویژن میں توسیع کریں جو کہ ابھی تک علاقائی ہے"۔ وہ مزید کہتاہے کہ "اس درجہ بندی کے معیار بہت ہیں ان میں قومی آمدنی، ٹیکنالوجی کی سطح، جوہری ہتھیار اور ان کی تعداد اور معیار، عالمی گروہوں اور تنظیموں جیسے سلامتی کونسل، G8 گروپ یایورپی یونین میں شراکت، زبان کی ترویج اور ثقافتی ورثہ کی اثراندازی شامل ہیں"۔

لیکن ویڈرین کے رائے سے زیادہ باریک رائے یہ ہے کہ امریکہ کی دیوقامت ریاست کے بعد، جس کااکیسویں صدی کے اوائل میں کوئی ہمسر اور مقابل نہیں، تین حقیقی بڑی ریاستوں کانمبر ہے، یعنی روس، برطانیہ اور فرانس۔ ان کے بعد ہی جرمنی آتاہے۔ ان چار ممالک کی دنیاکے بہت سے علاقوں میں عالمی عزائم ہیں۔ پھر چین کانمبر آتاہے، یہ اپنے علاقائی دائرے میں سپرطاقت ہے۔ اگر اس کے عالمی عزائم تنگ اور محدود نہ ہوتے تو وہ سابقہ چاروں ریاستوں یاان میں سے بعض کے ساتھ پنجہ آزمائی کرنے کی صلاحیت رکھتاتھا۔ جہاں تک جاپان کی بات ہے، یہ امریکہ کے بعد سب سے بڑااقتصادی ملک ہے۔ اس لئے طاقتور ریاستوں کی ترتیب کچھ یوں ہوگی:

امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، جرمنی، چین اور جاپان، یکے بعد دیگرے ان پر بڑی طاقت ہونے کا اطلاق ممکن ہے۔ جہاں تک انڈیا، کینیڈا اور اٹلی کی بات ہے، یہ اس قابل نہیں کہ ان پر بڑی طاقت ہونے کا اطلاق کیا جاسکے، اس کے باوجود کہ ان سات ممالک کے بعد ان کا نمبر آتا ہے اور ان کے ساتھ دنیا کی دس بڑی طاقتیں تشکیل پاتی ہیں۔

بیسویں صدی کے اختتام اور عیسوی کیلنڈر کے اگلے ہزار سال کے آغاز کے ساتھ جارج بش جونئیر کی انتظامیہ نے سیاسی کھیل کے ضابطے تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے شراکت داری کی پالیسیوں کو چھوڑ دیا، جو کلنٹن نے اختیار کیں تھیں اور بڑی ریاستوں پر زبردستی اپنی پالیسی مسلط کرنے لگا۔ اس نے بہت سے عالمی معاہدات سے ہاتھ کھینچ لیا، جیسے Q2 معاہدہ، عالمی محکمہ جرائم international court of crimes، اسی طرح بیلسٹک اسلحہ کے پھیلاؤ میں تخفیف کیلئے سالٹ معاہدات وغیرہ۔ امریکہ اور دوسری بڑی طاقتوں کے درمیان 11 ستمبر 2001 کے واقعات کی وجہ سے تعلقات کشیدہ ہوگئے، جب نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن میں پینٹاگان کی عمارتوں میں دھماکے ہوئے۔ ان واقعات نے امریکہ کو یک طرفہ رجحان کا ایک اور موقع فراہم کیا اور اس نے اس تباہی کو نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ کا ایک جواز بنایا، چنانچہ اس نے افغانستان اور عراق پر اسی بہانے چڑھائی کی۔ اس دوران امریکی انتظامیہ پر سیاسی غرور چھایا رہا، اور اس نے "اگر تم ہمارے ساتھ نہیں تو پھر ہمارے مخالف ہو"(you are with us or against us) کی پالیسی اختیار کرلی۔ ان نئی پالیسیوں کے خلاف یورپی اور دوسرے لوگوں کی طرف سے برہمی اور سخت رد عمل سامنے آیا اور انہوں نے اسے بیوقوفی اور سادہ لوحی قرار دیا اور امریکیوں سے مطالبہ کیا کہ وہ پھر مشاورت اور شراکتی پالیسی کی طرف لوٹ آئیں۔ تاہم امریکیوں نے کلنٹن کی مشاورت اور شراکتی پالیسی کی طرف لوٹنے سے انکار کر دیا اور نو قدامت پسند(neo-conservatives)، جن کی قیادت نائب صدر ڈِک چینی، وزیر دفاع رَمز فیلڈ، نائب وزیر دفاع ولویٹزWolvowitz، صدر دفاعی پالیسی کونسل رِچرڈ پرل، ڈگلس فیتھ، جان بولٹن، کونڈالیزا رائس وغیرہ کر رہے تھے۔ یہ سب بش کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے میں کامیاب ہوگئے،

انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتوں، اثر و نفوذ اور ان کمپنیوں کو جو ان کے ساتھ تعاون کرتی تھیں، ان پالیسیوں کی تکمیل کیلئے استعمال کیا۔

ان پالیسیوں میں سے ایک اہم پالیسی فیصلہ کرنے کے حوالے سے اقوامِ متحدہ اور اس کی اجازت کو نظر انداز کرنے کی پالیسی تھی، اور یہ کہ اولیت امریکی مفادات کو حاصل ہونی چاہئے۔ سو اگر یہ مفادات عالمی قانون سے متصادم ہوں تو ان کے مقابلے میں عالمی قانون کو نظر انداز کیا جائے گا اور عدم ٹکراؤ کی صورت میں عالمی قانون پر عمل کیا جائے گا۔ یہی معاملہ سلامتی کونسل کے ساتھ کیا کہ اگر امریکی حکومت سلامتی کونسل سے قراردادیں منظور کرواسکتی ہے تو صحیح، ورنہ سلامتی کونسل کو بھی نظر انداز کیا جائے گا۔

یورپ نے برطانیہ کی نمائندگی میں امریکی انتظامیہ کو عالمی قوانین کو بائی پاس کرنے سے روکنے کی کوشش کی اور امریکی وزیر خارجہ کولن پاول اس کے حق میں تھا، صدر بش بھی اس کی طرف مائل تھا، تاہم نو قدامت پرست گروہ نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا اور امریکہ جس طرح عالمی تنظیم کو مؤثر کردار دینے سے آنکھیں چراتا رہا اسی طرح شراکتی پالیسیوں سے مسلسل بے پروائی کرتا رہا۔

بہر حال بش جونیئر انتظامیہ برطانیہ، روس، فرانس، جرمنی جیسی سپر طاقتوں کو عالمی سیاست میں کردار ادا کرنے سے روکنے میں ناکام رہی، بلکہ بش جونیئر کے اختیار کردہ پالیسیوں نے ان ممالک کی صورتحال کو کمزور کرنے کے بجائے اور مضبوط کر دیا۔ کیونکہ ان ممالک کو امریکہ کے اس سخت ترین حملے سے اپنے دفاع کی خاطر اپنی صفوں میں وحدت پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ فرانس، جرمنی اور روس کا محور (axis) تشکیل پایا اور خفیہ طور پر اس نے برطانیہ کے ساتھ تعاون کیا۔ ان ممالک نے نرمی اور گرمی کے ذریعے عالمی سیاست میں کسی حد تک اپنی طاقت کو مؤثر ثابت کیا۔

عالمی روایات اور عالمی قانون

سابقہ ادوار میں سپر طاقت کے منصب کیلئے کشمکش میں کسی عالمی قانون کے ساتھ منسلک سیاسی اعمال سرانجام نہیں دیے جاتے تھے کیونکہ ایسا کوئی قانون موجود ہی نہیں تھا، بلکہ ابتدائی تاریخ سے جنگوں اور لڑائیوں اور فوجی کاروائیوں کو بروئے کار لایا جاتا تھا اور ریاستوں کی عملداری کو ہتھیالیا جاتا تھا۔ یہ حالت اٹھارویں صدی کے نصف تک بدستور قائم رہی، پھر عالمی قانون وضع ہو گیا، یا مناسب الفاظ میں ایک قانون کی شکل میں وجود میں آ گیا۔ اسی وقت سے عالمی تعلقات اور عالمی مسائل کے حل میں سیاسی اعمال اہمیت کا پہلو اختیار کرنے لگے۔ چنانچہ مسائل کے حل اور سپر طاقت کے تسلط کو روکنے اور اس کے منصب کی کشمکش میں اب سیاسی

اعمال، فوجی کاروائیوں کی جگہ لینے لگے۔ اسی دن سے عالمی تعلقات میں عالمی قانون کی ثالثی بڑھ گئی اور عالمی مسائل کے حل میں سیاسی کاروائیوں کو بطورایک ذریعہ کے بہت زیادہ استعمال کیا جانے لگا، چاہے یہ جنگ اور جارحیت کے حوالے سے ہو یا اس کے بغیر۔ 1919 کے بعد یہ قانون بہت مستحکم ہوا، جب عالمی لیگ (world league) کا قیام عمل میں آیا۔ چنانچہ عالمی لیگ اور عالمی قانون کی طرف مقدمات لے جانے میں اضافہ ہوا۔ عام طور پر ریاستیں جو عالمی کاروائیاں انجام دیتی ہیں، یا سپر طاقت کے مقابل ریاستیں یا خود سپر طاقت مخصوص انداز میں جو اقدامات کرتی ہے، یہ سب عالمی رسم و رواج اور عالمی قانون کا سہارا لیتے ہیں۔ اس لئے عالمی رسم و رواج اور عالمی قانون پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہے تاکہ سیاسی کاروائیوں کا ادراک ہو جائے اور عالمی سطح پر سیاسی کاروائیاں انجام دینے کی کیفیت کا علم ہو جائے۔

جہاں تک عالمی رسم و رواج کی بات ہے تو یہ ریاستوں اور امارتوں کے ظہور اور سیاسی ڈھانچوں کی طرح قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ یہ ان قوائد وضوابط کا مجموعہ ہے جو انسانی گروہوں کے درمیان حالتِ جنگ وامن میں تعلقات کے دوران وجود پذیر ہوئے۔ طویل عرصے تک ان ضابطوں پر عملدرآمد کی وجہ سے یہ قوائد عالمی رواج بن گئے۔ پھر یہ قوائد ریاستوں کے ہاں ضابطے قرار پائے اور ریاستیں رضامندی سے اپنے آپ کو اس کا پابند سمجھنے لگیں، اور آخر کار یہ قانون کی طرح ہو گئے۔ یہ پابندی اخلاقی ہوتی تھی نہ کہ مادی (قوت کی بنا پر) نیز اس بارے میں رائے عامہ کا خوف بھی دامن گیر رہتا تھا کہ جو کوئی ان قواعد کا پاس نہیں رکھتا، اسے عوامی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا اور یہ اس کی تذلیل کا باعث بنتا۔ اسلام سے قبل عربوں کا حرمت کے مہینوں میں لڑائی کی روک تھام پر اتفاق، اسی عالمی رواج کی ایک مثال ہے، اس لئے جب عبداللہ بن جحشؓ کی جماعت نے عمرو بن الحضرمی کو قتل کیا اور قریش کے دو آدمیوں کو قید کیا اور تجارت کا قافلہ اپنے قبضے میں لے لیا، تو قریش نے رسول اللہ ﷺ کی مذمت کی اور تمام اطراف میں یہ اعلان کیا کہ محمد ﷺ اور ان کے اصحاب نے حرمت کے مہینوں کا تقدس پامال کیا ہے اور خون ریزی کی ہے، اموال پر قبضہ کیا ہے اور آدمیوں کو قیدی بنایا ہے۔ قریش نے آپ ﷺ کے خلاف رائے عامہ کو اس دلیل کے ساتھ بھڑکانا چاہا کہ رسول ﷺ نے بین الاقوامی رسوم و رواج کی مخالفت کی ہے۔

اس طرح تمام انسانی گروہوں کے درمیان ایسے قواعد وضوابط متعارف تھے جن کی وہ جنگ یا امن میں پابندی کیا کرتے تھے، انہی ضوابط میں سے قاصد ہیں جنہیں سفیر کہا جاتا تھا اور جنگ کے دوران حاصل شدہ غنیمتیں وغیرہ۔ البتہ ان رواجوں میں بعض عام رواج ہیں جن پر تمام انسانی گروہ کاربند ہیں، جیسے سفیر یعنی قاصد اور بعض مخصوص گروہوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان رواجوں میں ریاستوں، امارات اور دیگر سیاسی ڈھانچوں یعنی انسانی مجموعوں کے باہمی تعلقات کی ضرورتوں کے پیش نظر اور ان کی ضروریات کے مطابق تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ چنانچہ رائے عامہ کی وجہ سے لوگ ان عالمی روایات کے تحت فیصلے کرتے تھے اور جو لوگ ان روایات کی مخالفت کرتے، ان کو اس پر شرمندہ کیا جاتا تھا، لہٰذا اخلاقی طور پر خوشی سے ان روایات کی پابندی کی جاتی تھی، نہ کے کسی مادی قوت کی وجہ سے، جو ان کو نافذ کرے۔ چنانچہ انہی روایات کو دلیل بنا کر انسانی گروہ سیاسی اعمال سرانجام دیتے تھے۔

جہاں تک عالمی قانون کی بات ہے تو یہ اسلامی ریاست کے خلاف وجود میں آیا جب وہ خلافتِ عثمانیہ کی شکل میں موجود تھی۔ ہوا یوں کہ ریاستِ عثمانیہ ایک اسلامی ریاست کی طرح یورپ کے ساتھ جنگ کے لئے کمربستہ ہوئی اور یورپ کے عیسائیوں کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور ان کے علاقوں کو ایک ایک کر کے فتح کرنے لگی۔ چنانچہ اس نے یونان، رومانیا، البانیا، یوگوسلاویہ، ہنگری اور آسٹریا کو اپنے اندر سمو لیا، یہاں تک کہ اسلامی ریاست ویانا کے دروازوں پہ دستک دینے لگی۔ یہ فتوحات اتنی تیز تھیں کہ یورپ کے عیسائیوں پر ایک رعب اور دہشت طاری تھی، ان کے ہاں ایک مقولہ بن گیا کہ "اسلامی لشکر ناقابلِ تسخیر ہے" اور یہ کہ "مسلمان جب لڑتے ہیں تو موت کو خاطر میں نہیں لاتے"، کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ جہاد میں قتل ہو جانے کے بعد ان کیلئے جنت ہو گی، ان کا تقدیر اور اجل پر پختہ یقین ہے۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کے اندر بے مثال جرأت و بہادری کا مشاہدہ کیا تو وہ ان کے سامنے ٹھہر نہ سکے اور پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگے، اس صورتحال نے مسلمانوں کے لئے ان کے علاقوں کو لینا اور ان کو اسلامی سلطنت کے آگے سرنگوں کرنا آسان کر دیا۔ اس دور میں یورپ کے عیسائی، امارتوں (علاقائی حکومتوں) اور جاگیروں پر مشتمل تھے، منتشر ریاستیں تھیں اور ہر ریاست امارتوں میں تقسیم تھی جس پر کوئی نہ کوئی جاگیر دار حکومت کرتا تھا جو بادشاہ کے ساتھ اختیارات بانٹ لیتا تھا۔ اس بنا پر بادشاہ نہ

تو ان امارتوں کو لڑائی میں شرکت پر مجبور کر سکتا تھا، نہ ہی اس کو جاگیر دوروں کے نمائندہ کے طور پر فاتحین کے ساتھ خارجی امور سے متعلق کسی بات کا حق حاصل ہوتا تھا۔ اس صورتحال نے مسلمانوں کیلئے جنگوں اور فتوحات کو آسان کر دیا اور قرونِ وسطیٰ یعنی سولہویں صدی کے اختتام تک یورپی ریاستوں کی حالت بدستور ایسی ہی رہی۔ اسی صدی میں یورپی ریاستیں ایک (عالمی) برادری بنانے کیلئے متحد ہونے لگیں، جو اسلامی ریاست کا مقابلہ کر سکے۔ اس وقت یورپی ریاستیں کلیسا (چرچ) کے زیر اثر تھیں اور عیسائیت ہی ان کے اتفاق کا مرکز تھی۔ اس لئے کلیسا نے ان تمام ریاستوں پر مشتمل ایک عیسائی برادری بنانے کیلئے کوششیں شروع کیں اور یہ ریاستیں اپنے درمیان تعلقات طے کرنے لگیں۔ اس سے کچھ ایسے ضابطے وجود میں آ گئے جن پر ان کا اپنے تعلقات کو منظم کرنے کیلئے اتفاق ہوا تھا۔ یہ آغاز تھا جسے بعد میں عالمی قانون کا نام دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عالمی قانون کی اولین بنیاد یہ تھی کہ یورپ کی عیسائی ریاستیں یورپ میں عیسائی رشتے کی بنیاد پر اسلامی ریاست کے مقابلے کیلئے اکھٹی ہو گئیں، چنانچہ اسی سے عالمی عیسائی ریاستوں کی برادری (International Christian Community) وجود میں آئی اور اس نے اپنے درمیان چند قواعد پر اتفاق کیا، جس میں یہ شامل تھا کہ حقوق کے لحاظ سے ان ریاستوں کے افراد کے درمیان برابری ہو اور یہ کہ ان ریاستوں کے یہی اصول اور مشترک اقدار ہونگے اور یہ کہ یہ تمام ریاستیں باوجود اختلافِ مذہب کے کیتھولک پوپ کیلئے اعلیٰ روحانی اختیار تسلیم کرتی ہیں۔ یہی اصول عالمی قانون کیلئے بیج کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ابتدا میں ان عیسائی ریاستوں کا ملاپ غیر مؤثر تھا، کیونکہ جن اصولوں پر ان کا اتفاق ہوا تھا وہ ان کو اکٹھا نہیں کر سکے، کیونکہ جاگیر دارانہ نظام، ریاست کی طاقت اور بیرونی تعلقات نبھانے کے سامنے رکاوٹ بنا رہا۔ اسی طرح ان ریاستوں پر کلیسا کے تسلط نے ان کو کلیسا کا ماتحت بنالیا تھا اور ریاست سے اس کی قیادت اور آزادی سلب کر لی تھی۔ اس لئے جاگیر داروں پر غلبہ پانے کیلئے ریاست کے اندر ایک کشمکش شروع ہوئی، جو بالاخر ریاست کے غلبہ اور جاگیر دارانہ نظام کے خاتمہ پر اختتام پذیر ہوئی۔ انہی ادوار میں ریاست اور کلیسا کے درمیان بھی کشمکش شروع ہوئی جس کے نتیجے میں ریاست کے داخلہ وخارجہ امور پر کلیسا کے اختیارات ختم کئے گئے۔ لیکن ریاست پھر بھی عیسائی رہی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ ریاست نے کلیسا کے ساتھ تعلقات ایسے انداز میں استوار کئے، جو ریاست کی آزادی کو یقینی بنائے۔ اس کے نتیجے

میں یورپ میں طاقتور ریاستیں وجود میں آگئیں لیکن اس کے باوجود وہ اسلامی ریاست کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ سترھویں صدی کے نصف یعنی 1648ء تک یہی حالت رہی۔ اس سال یورپی ریاستوں نے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا جسے ویسٹ فیلیا Westphalia کانفرنس کہا جاتا ہے، اس کانفرنس میں یورپی عیسائی ریاستوں کے درمیان تعلقات کے انتظام کیلئے ٹھوس ضوابط وضع کئے گئے اور اسلامی ریاست کے مقابلے میں یورپی عیسائی ریاستوں کی برادری کو منظم کیا گیا۔ چنانچہ اس کانفرنس نے روایتی اصول وضع کئے، جسے عالمی قوانین کا نام دیا گیا۔ تاہم یہ عمومی عالمی قوانین نہیں تھے، یہ صرف یورپی عیسائی ریاستوں کی نسبت سے بین الاقوامی تھے۔ اس قانون کی رو سے اسلامی ریاست کیلئے اس بین الاقوامی برادری کے اندر شمولیت یا عالمی قانون کا اس پر اطلاق ممنوع قرار دیا گیا۔ اسی دن سے عالمی برادری وجود میں آئی، جو تمام یورپی عیسائی ریاستوں پر مشتمل تھی، خواہ وہ شاہی ہوں یا جمہوری، کیتھولک ہوں یا پروٹسٹنٹ۔ شروع میں اس میں صرف مغربی یورپ کی ریاستیں شامل تھیں، پھر اس میں باقی یورپی عیسائی ریاستیں بھی شامل ہوتی گئیں، پھر ان عیسائی ریاستوں کو بھی شامل کیا گیا جو یورپی نہیں تھیں۔ بہر حال اُنیسویں صدی کے دوسرے نصف تک اسلامی ریاست پر اس میں شمولیت پر پابندی برقرار رکھی گئی۔ جب اسلامی ریاست کمزور ہو گئی اور اسے "بیمار آدمی" کا نام دیا گیا، تو ان حالات میں ریاستِ عثمانیہ نے عالمی برادری میں شمولیت کا مطالبہ کیا، لیکن اس کو مسترد کر دیا گیا اور جب اس نے اس مطالبے پر اصرار کیا تو اس پر کڑی شرائط عائد کی گئیں، جیسے کہ عالمی تعلقات میں یہ اسلامی ریاست کی حیثیت سے دستبردار ہو گی اور اس میں کچھ یورپی قوانین کو شامل کیا جائے گا۔ ریاستِ عثمانیہ نے ان شرائط کو قبول کر کے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ لہٰذا عالمی قوانین میں اپنا اسلامی تشخص چھوڑنے کی رضامندی کے بعد اس کا مطالبہ پورا کیا گیا اور 1856ء میں اس کو عالمی برادری میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے بعد اس عالمی برادری میں غیر عیسائی ریاستیں بھی داخل ہو گئیں، جیسے جاپان۔ اس لئے ویسٹ فیلیا کانفرنس کو، جو 1648ء میں منعقد کی گئی تھی، عالمی قانون کیلئے اصول و ضابطے ترتیب دینے والی کانفرنس سمجھا جاتا ہے۔ اس کانفرنس کے اصول کی بنا پر ایک منفرد انداز میں سیاسی کاروائیوں کو وجود ملا اور مشترکہ عالمی اقدامات وجود میں آئے۔

ان ضوابط میں سے دو نظریے خاص طور پر خطرناک تھے۔ ایک عالمی توازن کا نظریہ idea of international balance دوسرا عالمی کانفرنسوں کا نظریہ۔ جہاں تک عالمی توازن کا نظریہ ہے، تو یہ طے کرتا ہے کہ جب کوئی ریاست دوسری ریاستوں کے مقابلے میں توسیع کی کوشش کرے گی، تمام ریاستیں اکٹھی ہو کر اس کی اس کوشش کے آگے رکاوٹ بنیں گی، تاکہ عالمی توازن کی حفاظت کی جائے جو لڑائیوں کو روکنے اور امن کے فروغ کی ضمانت دے گا۔ جہاں تک عالمی کانفرنسوں کی بات ہے، یہ کانفرنس مختلف یورپی ریاستوں سے مل کر بنی تھی، یہ یورپی مفادات کی روشنی میں ان ریاستوں کے مسائل اور امور سے متعلق بحث کرنے کیلئے منعقد کی جاتی تھی۔ پھر یہ نظریہ سپر طاقتوں کی کانفرنسوں میں تبدیل ہو گیا، جو ان ریاستوں کے مفادات کی روشنی میں عالمی مسائل پر غوروفکر کیلئے منعقد کی جاتی تھیں۔ یہ دونوں نظریے ان تمام مشکلات اور سختیوں کی بنیاد تھے، جنہیں دُنیا استعماری اور بڑی طاقتوں (superpowers) کے تسلط کو ختم کرنے کے راستے میں اُٹھا رہی تھی۔

سب سے پہلے ان دو نظریوں کو اُنیسویں صدی کے اوائل میں نپولین کے دور میں استعمال کیا گیا۔ چنانچہ جب فرانس کا انقلاب برپا ہوا اور آزادی و مساوات کے افکار عام ہو گئے اور فرد اور عوام کے حقوق تسلیم کئے گئے، تب فرانس اس قابل ہوا کہ یورپ کا سیاسی نقشہ تبدیل کر دے اور پرانی ریاستوں کو ختم کر کے نئی ریاستیں قائم کرے۔ تو یورپی ریاستیں عالمی توازن کی دلیل کی بنیاد پر اکٹھی ہو کر فرانس پر ٹوٹ پڑیں۔ اور جب نپولین کو شکست ہوئی، تو یہ ریاستیں ایک بار پھر 1815ء میں ویانا کانفرنس میں اکٹھی ہوئیں اور عالمی توازن کو سابقہ حالت پر لانے اور عالمی عیسائی برادری کے حوالے سے غور کیا، چنانچہ پروشیا Prussia اور آسٹریا کو بادشاہت واپس دلائی گئی، سویڈن و ناروے کے درمیان ایک فیڈریشن قائم کی گئی، بلجئیم کو ہالینڈ کے ساتھ ملا دیا گیا تاکہ ایک ریاست بن کر فرانس کی توسیع کے آگے رکاوٹ بن سکے، اور سوئیزرلینڈ کو مستقل طور پر غیر جانبدار رکھا گیا۔ اس کانفرنس کی قراردادوں کو نافذ کرنے کیلئے کانفرنس میں شریک ریاستوں نے آپس میں ایک معاہدہ کیا، یہ پروشیا، روس اور جرمنی کے بادشاہوں کے درمیان ہوا، جبکہ برطانیہ کا بادشاہ بھی ان کا ہم خیال تھا، بعد میں فرانس بھی اس میں شامل ہوا۔ لہٰذا یہ بڑی طاقتوں کا دوسری ریاستوں پر تسلط حاصل کرنے کا معاہدہ

تھا۔ 1818ء میں Aix –La-Chapelle کانگریس کے اجلاس میں روس، برطانیہ، پروشیا، جرمنی اور فرانس کے درمیان معاہدہ ہوا جس میں یہ ممالک اس بات پر متفق ہوئے کہ ویانا کانفرنس میں طے کردہ فیصلوں کیلئے چیلنج بننے والی کسی بھی بغاوت کو کچلنے کیلئے مسلح مداخلت کی جائے گی۔ اس طرح ان پانچ بڑی ریاستوں نے امن اور عالمی برادری کے نظام، یعنی عالمی عیسائی برادری کی حفاظت کیلئے اپنے آپ کو ایک تنظیم کے طور پر منوایا۔ پھر انھوں نے اپنے اختیارات میں توسیع کی اور ریاستِ عثمانیہ کے کمزور ہونے کے بعد بعض اسلامی ممالک کو بھی شامل کیا۔ ان ریاستوں نے امن کی حفاظت کو جواز بنا کر کئی مداخلتیں کیں، چنانچہ نیپولی (Naples) میں 1821 میں اور اسپین میں 1827 میں، پرتگال میں 1826 میں اور مصر میں 1840 میں مداخلت کی گئی۔ ان ریاستوں نے امریکہ کے اندر بھی مداخلت کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان ریاستوں نے امریکہ میں موجود اپنی نوآبادیوں کو لینے کیلئے اسپین کے ساتھ تعاون کیا مگر امریکہ، جو کہ ایک ایسی مضبوط ریاست بن چکی تھی، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا، اس میں حائل ہوا اور صدر ریاست ہائے متحدہ امریکہ جیمز مونرو نے 1823ء کو اپنا مشہور بیان دیا جو مونرو ڈاکٹرائن (Monroe Doctrine) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس نے کہا "ریاست ہائے متحدہ امریکہ کسی یورپی ریاست کو براعظم امریکہ کے معاملات میں دخل اندازی یا اس کے کسی حصے پر قبضے کی اجازت نہیں دیتی"۔ اس طرح یہ ریاستیں مداخلت سے باز آگئیں۔

چنانچہ یہ ہے عالمی قانون کی بنیاد، جس نے مداخلت کے جواز پیدا کئے اور بڑی طاقتوں کو یہ موقع دیا کہ وہ دوسری ریاستوں کے بارے میں فیصلے کریں۔ اور یہ ان سیاسی کاروائیوں کی بنیاد بھی ہے جسے اپنے مفادات کے حصول یا سپر طاقت کی مزاحمت کیلئے یہ ریاستیں انجام دیتی ہیں، مگر ان عالمی ضابطوں میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ تاہم یہ تمام تبدیلیاں بڑی ریاستوں کے فائدے اور ان کے عزائم کو ضبط میں رکھنے کیلئے کی گئیں، یا بالفاظ دیگر یہ ریاستیں دنیا کے وسائل کو آپس میں اس طرح تقسیم کریں گی، جس سے جنگ اور مسلح جھگڑے پیدا نہ ہوں۔ انیسویں صدی عیسوی استعماریت کا دور تھا، اس دور میں بڑی ریاستیں کمزور ریاستوں کو نوآبادیات بنانے کی طرف لپکیں۔ چنانچہ اس استعماریت کی وجہ سے جھگڑے پیدا ہوتے تھے لیکن بڑی جنگ نہیں ہوئی، مگر جب برطانیہ، فرانس اور روس کو پتہ چلا کہ جرمنی اپنی زبردست طاقت کی بدولت اب ان کیلئے چیلنج بن رہا ہے اور

انہوں نے دیکھا کہ وہ عراق میں اسلامی علاقوں کے تیل پر قبضہ کرنے والا ہے اور ایران اور جزیرہ نمائے عرب کے تیل کے حوالے سے برطانیہ کیلئے خطرہ ثابت ہورہا ہے، جب انہوں نے یہ دیکھا تو تینوں ممالک جرمنی کے خلاف متحد ہوئے اور اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، ریاستِ عثمانیہ جرمنی کے ساتھ اتحادیوں کے خلاف جنگ میں کود پڑی، لیکن اتحادیوں کو کامیابی ملی۔ البتہ روس اس اتحاد سے نکل گیا، لہٰذا فرانس، برطانیہ اور امریکہ رہ گئے۔ امریکہ نے دوبارہ گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ چنانچہ میدان میں صرف برطانیہ اور فرانس رہ گئے۔ ان دونوں ریاستوں نے اپنے درمیان استعماریت کا نظم ونسق کرنے اور مسلح کشمکش سے بچنے کیلئے League of Nations بنائی تاکہ ریاستوں کے معاملات کا انتظام کیا جائے اور ان کے درمیان لڑائیوں کو روکا جائے، مگر لیگ آف نیشن متضاد قسم کے پُر پیچ حالات میں وجود میں آنے کے علاوہ ناکام بھی ثابت ہوئی، کیونکہ بڑی طاقتوں کی پالیسی تبدیل نہیں ہوئی تھی اور امن کانفرنس میں ہر ایک کو مختلف طاقتوں کے درمیان قوت کے توازن اور اپنے مفادات کی حفاظت اور جرمنی اور ریاست عثمانیہ کے علاقوں کو آپس میں بانٹنے کرنے کی فکر لگی ہوئی تھی۔ استعماری ممالک نے اپنی خود مختاری پر کوئی آنچ نہیں آنے دی اور اپنی کالونیوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ پُر فریب نام (states under mandate) کے ذریعے کالونیوں کی ایک اور قسم بڑھادی۔ اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ لیگ آف نیشن عالمی صلح جوئی اور قیام امن کی کوششوں میں ناکام ہوگئی۔ اس نے امن کو یقینی بنانے کیلئے عالمی معاہدات کئے، یعنی کالونیوں پر جھگڑوں کی بندش کی یقین دہانی کیلئے۔ چنانچہ لیگ کی وساطت سے جنیوا پروٹوکول 1924 وضع کیا گیا۔ اس پروٹوکول کا مقصد یہ تھا کہ جھگڑوں اور اختلافات کو پرامن طریقے سے نمٹایا جاسکے اور فیصلوں کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اسی طرح 1925ء میں لوکارنو معاہدات ہوئے۔ ان معاہدات میں باہمی حفاظت اور امدادِ باہمی کے امور کو طے کیا گیا۔ اسی طرح 1928ء میں برین کیلاگ Brian Kellogg معاہدہ ہوا، اس میں بھی جنگ کا راستہ بند کیا گیا۔ پھر 1928 میں جنیوا معاہدہ ہوا، اس میں بھی فیصلوں کو قبول اور لاگو کرنے کی بات کی گئی، لیکن یہ تمام تر معاہدات لیگ آف نیشن کو اپنی مہم میں ناکامی سے نہ بچاسکے اور اس کے آنکھوں کے سامنے کئی جنگیں پھوٹ پڑیں، ان میں سے 1933ء کی چین جاپان

جنگ ،1936 میں اٹلی اور حبشہ کی جنگ،1938ء میں جرمنی اور آسٹریا کی جنگ، 1938 میں چیکو سلواکیا کی جنگ، پھر1939ء میں پولینڈ کی جنگ، یہاں تک کہ1939 میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔

یہ وہ تبدیلیاں تھیں جو عالمی تعلقات میں واقع ہوئی۔ چنانچہ یہ کانفرنسوں سے عالمی تنظیم میں تبدیل ہو گئے جو عالمی امن کو یقینی بنائے، لیکن ان میں اس ارتقاء سے کوئی تبدیلی نہیں آئی کیونکہ بڑی طاقتوں کی آپس میں مالِ غنیمت پر لڑائیاں ہوتی رہیں، یہاں تک کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد بڑی ریاستوں نے محسوس کیا کہ آپس کے تعلقات کے انتظام کیلئے ایک عالمی تنظیم کی تشکیل ہی بہترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ شروع میں وہ ممالک جو جنگ میں داخل ہوئے تھے انہوں نے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ پھر اس میں توسیع کی گئی اور اس کو عالمی تنظیم بنایا گیا جس میں دنیا کے تمام ممالک کے لئے داخل ہونے کا موقع فراہم کیا گیا اور اسی تنظیم کے معاہدے کے ذریعے عالمی تعلقات کو منظم کیا جانے لگا۔ اس طرح عالمی تعلقات اب دنیا پر تسلط، مال غنیمت کی تقسیم اور کسی دوسری بڑی طاقت کے ظہور کو روکنے کیلئے بڑی طاقتوں کی کانفرنس کی بجائے، ان طاقتوں کے درمیان تعلقات کے انتظام اور ان کے تسلط کی ضمانت فراہم کرنے والی عالمی تنظیم میں تبدیل ہو گئے۔ اور پھر یہ ایک ایسی عالمی ریاست کی شکل اختیار کر گئے جو دنیا پر مسلط ہو کر اس کے معاملات چلائے۔

1815ء میں ویانا کانفرنس کے بعد چار بڑی ریاستیں پروشیا، روس، جرمنی اور برطانیہ عالمی صورتِ حال کو تشکیل دے رہی تھیں۔ جب فرانس نے ان ممالک کو ان کے منصب سے ہٹانے کی کوشش کی اور دنیا کا نقشہ تبدیل کیا، عالمی صورتحال تبدیل کی اور عالمی سپر پاور بن گیا، تو بڑی ریاستوں نے دوسری ریاستوں کے ساتھ مل کر اس پر دھاوا بول کر اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور پھر اس کو دنیا پر تسلط حاصل کرنے میں اپنے ساتھ ملالیا۔ یوں یہ پانچ ریاستیں عالمی صورتحال کی نمائندہ بن گئیں۔ برطانیہ نے آہستہ آہستہ اُبھرنا شروع کیا تا آنکہ وہ سپر طاقت بن گیا اور جب جرمنی نے اس سپر طاقت کے ساتھ مزاحمت کی کوشش کی اور اسلامی ممالک کے تیل پر کنٹرول حاصل کرنا چاہا تو برطانیہ، فرانس اور روس اکٹھے ہو کر اس کے خلاف لڑے اور اس کی تمام خواہشات کو خاک میں ملادیا، ساتھ ہی دنیا کے بہت سے علاقوں کو نو آبادیات بنالیا۔ برطانیہ نے بڑا حصہ لے لیا

اور فرانس کو دستر خوان کے چند ٹکڑوں پر ٹرخادیا اور اسے راضی کرنے کے لیے چند کالونیاں اس کو بھی دیدیں۔ اب عالمی صورتِ حال کی نمائندگی اٹلی کے ساتھ برطانیہ اور فرانس کررہے تھے، تاہم برطانیہ اب بھی سپر طاقت رہا۔ پھر لیگ آف نیشن وجود میں آگئی۔ اس کو ایجاد کرنے کا حقیقی مقصد سپر طاقت کے عہدے کی حفاظت اور دوسری ریاستوں کو اس کے ساتھ مزاحمت کرنے یا سپر طاقت بننے سے روکنا تھا، اگرچہ اس کو ایجاد کرتے وقت دلیل یہ دی گئی تھی کہ عالمی امن کی حفاظت کی جاسکے، پھر جب جرمنی نے ایک بار پھر سپر طاقت کے ساتھ مزاحمت کی کوشش کی اور بڑی طاقت بن گئی تو شروع میں برطانیہ اور فرانس یکجا ہوگئے اور پھر ان کے ساتھ روس اور امریکہ نے مل کر جرمنی پر دوسری جنگ عظیم مسلط کرکے اس کا کام تمام کردیا۔

مگر اس بار جنگ کا نتیجہ برطانیہ کے خلاف تھا۔ چنانچہ وہ جنگ میں چکنا چور ہوگیا اور جس کو کامیابی ملی وہ امریکہ تھا۔ اس لئے عالمی قوت کی باگ ڈور برطانیہ کے ہاتھ سے نکل کر امریکہ کے ہاتھ میں آگئی۔ چنانچہ امریکہ سپر پاور بن گیا اور اب عالمی صورتِ حال کی نمائندگی کی شکل یوں ہوگئی کہ امریکہ سپر طاقت تھا اور سوویت یونین اس کے ساتھ مقابلہ کررہا تھا اور برطانیہ اور فرانس اب دوسرے درجے کے ممالک بن گئے، یعنی عالمی صورتِ حال میں ثانوی درجہ کے حامل ہوگئے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد عالمی صورتحال میں ایک نیا عامل یہ پیش آیا کہ دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی جس سے عالمی تنازعات کی تیزی دگنی ہوگئی اور ایک ایسی عالمی صورتحال وجود میں آئی جو اس سے پہلے اس شکل میں موجود نہیں تھی۔ ہاں جنگ عظیم اول سے پہلے اگرچہ عالمی صورتِ حال متعدد گروہوں سے مل کر بنی تھی، مگر یہ صحیح معنوں میں گروہ نہیں تھے اور جنگ عظیم دوم سے قبل اگرچہ عالمی صورتِ حال جمہوری محاذ اور مطلق العنان نازی اور فاشسٹ محاذ میں منقسم تھا، لیکن اس کے باوجود یہ تقسیم آئیڈیالوجی (مبدأ) کی بنیاد پر گروہوں کی شکل میں نہیں تھی۔ کیونکہ نازی ازم اور فاشزم میں سے کوئی ایک بھی آئیڈیالوجی نہیں، نہ یہ کبھی آئیڈیالوجی کے مرتبے کو پہنچ سکتے ہیں، اس لئے جنگ عظیم دوم سے پہلے گروہ آئیڈیالوجی کی بنیاد پر نہیں تھے۔ جبکہ جنگِ عظیم دوم کے بعد دنیا دو گروہوں یا بلاکوں میں تقسیم ہوگئی: مغربی بلاک اور مشرقی بلاک۔ مغربی بلاک میں امریکہ سپر طاقت سمجھا جاتا تھا اور مشرقی بلاک میں روس (سوویت یونین) کو سپر طاقت سمجھا جاتا تھا۔

یہ دونوں گروہ آئیڈیالوجی کی اساس پر رسہ کشی کرتے رہے اور متضاد مفادات پر ان کی لڑائیاں ہوتی تھیں لیکن یہ عالمی بنیاد پر تھے، کیونکہ صرف آئیڈیالوجی دو گروہوں میں تقسیم کا مرکز نہ تھی، بلکہ اس کیساتھ عالمی مفادات بھی تھے، لیکن یہ عالمی مفادات مشرقی بلاک میں اشتراکی آئیڈیالوجی اور اس آئیڈیالوجی کے فروغ کے لازمی تقاضوں کے مطابق تھے۔ اور مغربی بلاک میں یہ مفادات آئیڈیالوجی کے فروغ کی پالیسی اور قومی ووطنی مفادات کے مطابق تھے، یہ قومی مفادات سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کے مطابق ہی ہیں، جو مفاد کو زندگی کے تمام اعمال کیلئے پیمانہ بناتی ہے۔ اس لئے مغربی بلاک میں بعض ایسے ممالک بھی ملتے ہیں جن کی کوئی آئیڈیالوجی نہیں تاہم ان کے مفادات مغربی بلاک کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ جبکہ مشرقی بلاک میں ایسا نہیں تھا، اس لئے کہ مشرقی بلاک کے تمام ممالک کمیونسٹ تھے اور بلاک کا حصہ تھے، ان میں کوئی غیر کمیونسٹ ملک نہیں تھا، کیونکہ آئیڈیالوجی ان کا مرکز تھی جبکہ مغربی بلاک ڈھیلاڈھالا تھا۔ اس لئے مغربی بلاک میں رخنے ڈالنا ممکن تھا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ ریاستیں اس سے نکل کر مشرقی بلاک میں شامل ہو جائیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ مغربی بلاک سے ایک اور گروہ جنم لے، جو ان دونوں سے مختلف ہو، جس کی ایک الگ صورتحال ہو اور جو جنگ وامن کے حالات میں عالمی صورتحال پر اثرانداز ہو سکے۔

جو شخص بھی مغربی بلاک پر گہرائی سے نظر ڈالے گا تو اسے پتہ چلے گا کہ اس میں داخلی طور پر تقسیم موجود ہے جو امریکہ کے عالمی سپر پاور کا منصب سنبھالنے کی نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ جبکہ اس سے پہلے یہ منصب برطانیہ کے پاس تھا اور اس سے پہلے امریکہ عالمی صورتحال سے گوشہ نشین ہو گیا تھا، یہ تقسیم واضح ہے، مخفی نہیں، اس کی وجہ سے ہی عالمی جنگ مؤخر ہوتی گئی۔ اس سپر طاقت نے عالمی سیاست میں مغربی بلاک کے نمائندے کا کردار اس طرح ادا نہیں کیا جیسا کہ برطانیہ کیا کرتا تھا، جب وہ سپر طاقت تھا۔ بلکہ امریکہ نے ایک سپہ سالار کا سا کردار ادا کیا جو لشکر پر زبردستی اپنی سپہ سالاری مسلط کرے، اس لئے اس بلاک کے وہ ممالک جو قوت میں سپر طاقت کے قریب قریب تھے، جیسے برطانیہ، وہ اس پر بہت زیادہ نالاں تھے اور انہوں نے دوسری کمزور ریاستوں سے زیادہ سرکشی اختیار کی۔ اس کی وجہ خود امریکی پالیسیاں ہیں، کیونکہ دوسری جنگ عظیم میں کامیابی کے بعد امریکہ نے تمام ریاستوں سے اختیار چھیننے اور اپنی بالادستی قائم کرنے کا عزم کر لیا۔ اور اپنی طاقت

اور وسائل کی کثرت کے غرور میں مبتلا ہوا۔ آخر کار اس نے اپنے لئے تمام دنیا پر حکمرانی کو ضروری خیال کیا اور یہ کہ قومیں اور ریاستیں اس کے دست نگر رہیں اور اس کی رضاجوئی کریں۔ امریکہ نے سیاسی اور اقتصادی پروگراموں کے ذریعے یورپ کے اندر مداخلت کی اور پھر اس کے بعد ان کی کالونیوں میں فوجی انقلابات اور شورشیں برپا کیں۔ بالخصوص برطانیہ، جو سپر پاور رہا ہے اور جس کی سب سے زیادہ نو آبادیات تھیں، پھر فرانس اور پھر ہالینڈ۔ بجائے اس کے کہ امریکہ کالونیوں پر حملہ کرتا، وہ مارشل منصوبے پر عمل کرتے ہوئے امداد اور قرضے دے کر استعماری ریاستوں پر ہی حملہ آور ہو گیا اور جب ان ممالک پر قابو پالیا، تب وہ ان کی کالونیوں کی طرف متوجہ ہوا اور ان کو بتدریج اپنے تسلط کے تحت لانے لگا اور اس کے لیے امریکہ نے ایسے اسالیب اختیار کیے جو یورپی ممالک کے کنٹرول حاصل کرنے کے اسلوب سے مختلف تھے۔

اس بنا پر مغربی بلاک کی ریاستوں میں اختلاف نے جڑ پکڑ لیا۔ یہ اختلاف نیا نہیں تھا بلکہ پہلے سے موجود تھا۔ مغربی بلاک کے اندر اس اختلاف کا آغاز جنگِ عظیم دوم سے پہلے ہو چکا تھا، البتہ یہ اختلاف کسی ایک گروہ کے اندر نہیں تھا بلکہ یہ ابتدا میں یہ دو ریاستوں کے درمیان اقتصادی اختلاف تھا۔ پھر یہ اختلاف ایک ہی گروہ کے اندر سیاسی اختلاف میں تبدیل ہو گیا۔ اس اختلاف کی بنیاد معاشی مسائل تھے، بالخصوص تیل کا مسئلہ کیونکہ امریکہ اور برطانیہ نے تیل سے متعلق آپس میں معاہدات کئے تھے اور برطانیہ کو امریکہ کے تعاون کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہی ان دو ریاستوں کے درمیان اختلاف کا سبب بنا، جس کے نتیجے میں مغربی ممالک کا آپس میں اختلاف پیدا ہوا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب عالمی صورتحال برطانیہ کے حق میں ہو گئی تو فرانس اس کے ساتھ مقابلہ کر رہا تھا اور یہ مقابلہ بالکل واضح تھا، چنانچہ برطانیہ نے فرانس کو کمزور کرنے کیلئے ایک طرف جرمنی کی مدد کی اور دوسری طرف کالونیوں میں قومی اور وطنی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی، چنانچہ اس نے فرانس کیلئے مشکلات پیدا کیں اور اس کو جرمنی کے خطرے سے بچنے پر مشغول کر دیا۔

مگر عالمی صورتحال میں اس وقت اٹلی کا معاملہ رونما ہوا اسی طرح جرمنی کے معاملے نے سر اُٹھایا جو اتنا شدید تھا کہ برطانیہ اور فرانس کے لئے چیلنج بن گیا۔ نیز روم اور برلن کا معاملہ پیش آیا۔ چنانچہ برطانیہ کیلئے یہ ضروری تھا کہ امریکہ کو اس کی گوشہ نشینی سے نکالے، اس نے امریکہ کو مشرق کے تیل کا لالچ دیا اور ان کے

درمیان تیل کے معاہدے ہوئے۔ لیکن امریکہ نے جب تیل کی تلاش وجستجو شروع کی تو امریکی کمپنیوں کو نہ صرف اقتصادی فائدے کی نسبت سے بلکہ خود امریکہ کی نسبت سے بھی مشرقی تیل کی قیمت کا اندازہ ہوگیا، چنانچہ امریکہ نے تیل کے ذخائر اور اس کے مراعات کو برطانوی کمپنیوں سے چھیننا شروع کیا اور اس پر برتری حاصل کرنا شروع کی، چنانچہ امریکی اور برطانوی کمپنیوں کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی۔ امریکی کمپنیاں جب مشرق کی طرف نکلیں، تو امریکہ نے گوشہ نشینی چھوڑ دی۔ پھر دوسری جنگ عظیم ہوئی اور امریکہ سامراجی (استعماری) دور کی سپر پاور بن گیا جبکہ برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ پیچھے رہ گئے۔ جہاں تک ہالینڈ کی بات ہے تو اپنی کمزوری کے سبب اس کا معاملہ ختم ہوگیا۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے تو اس نے مشرق میں اپنا کچھ اثر ورسوخ کھو دیا اسی طرح بحر متوسط Mediterranean Sea میں بھی اس کے اثر ورسوخ کو زوال آگیا اور بعض چھوٹی ریاستوں میں بھی۔ جس کی وجہ سے اس کی عالمی پوزیشن (حیثیت) انتہائی نچلی سطح پر آگئی، دوسری طرف امریکہ پوری دنیا میں اس کے اثر ونفوذ کو ختم کرنے کے لیے مسلسل اس کے پیچھے لگا رہا۔ جہاں تک فرانس کی بات ہے، تو جب مشرق بعید اور افریقہ میں اس کی کالونیاں ختم ہوگئیں تو یہ بھی کمزور ہوگیا۔ اگرچہ ڈیگال نے اس کی ترقی اور عالمی سطح پر اس کے اثر ونفوذ کو واپس دلانے کیلئے کوششیں کیں مگر وہ اس کو عالمی سٹیج پر اس کی سابقہ حیثیت نہ دلا سکا۔ تاہم پھر بھی یہ بڑی ریاستوں میں سے مانا جاتا ہے۔

ان تمام باتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سرد جنگ کے دوران مغربی بلاک کی تقسیم اور انتشار نے امریکہ کے علاوہ اس کے اندر موجود تمام ممالک کو کمزور کر دیا۔ امریکہ ان ممالک سے ان کی کالونیاں چھین کر ان کا صفایا کرنے اور اپنی قوت وطاقت کی وجہ سے سپر طاقت ہی رہا اور اس کی قوت بڑھ گئی۔ تاہم برطانیہ اپنے حلیف امریکہ پر اثر انداز ہونے اور اس کو سپر پاور کے منصب سے ہٹانے کیلئے ایک عرصے تک سیاسی داؤ پیچ اور جزوی عسکری کاروائیاں سرانجام دیتا رہا۔ پھر اس کے بعد جب اسے اپنے کمزوری اور اپنی قوت کی کمی کا اندازہ ہوا، بالخصوص امریکہ جیسے جنگی صلاحیتوں اور اقتصادی وسائل کی حامل دیو قامت ریاست کے مقابلے میں، تو اس نے امریکہ پر اثر انداز ہونے کی بجائے اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کی کوشش پر انحصار کرنا شروع کر دیا۔ اس لئے مغربی کیمپ بحیثیت ایک گروہ کے منتشر اور باہم دست وگریباں ہے جس کی تمام

ریاستیں تنازعات اوراختلافات کا شکار ہیں اور ایک دوسرے سے منافع میں مسابقت کی کوشش کرتی ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتی رہتی ہیں۔

جہاں تک مشرقی بلاک کا تعلق ہے، تو یہ گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی کی اوائل تک صرف آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر قائم تھا۔ اس کی فکری و عسکری قیادت روس (سوویت یونین) کر رہا تھا، چنانچہ روس کی حیثیت ایک طرف استاد اور سرپرست کی تھی، دوسری طرف ایک محافظ اور سپہ سالار کی۔ اس لئے اس بلاک کے ممالک میں کوئی ایسی ریاست نہیں تھی جو روس (سوویت یونین) کے ساتھ فکری اور عسکری قیادت کے حصول میں نبرد آزمائی کرے، بلکہ کوئی بھی ایسی ریاست نہیں تھی، جو سوویت پالیسی پر اعتراض کرنے کی ہمت کرے۔ ایسی صورتحال میں اگر ضروری ہوتا تو اس اعتراض کو فوجی طاقت کے ذریعے ختم کیا جاتا۔ اسٹالن کے دور سے مشرقی بلاک کی پالیسی داخلی طور پر بیک وقت ریاستی نظام کو مضبوط کرنے اور دفاعی واقدامی عسکری اور جنگی قوت کی تیاری پر مبنی تھی اور اس کی خارجہ پالیسی اس بنیاد پر تھی کہ اشتراکیت اور سرمایہ داریت کا اکٹھے رہنا ممکن نہیں۔ اس لئے اس بلاک کی نظر میں سرمایہ داریت کو ہمیشہ سیاسی حریف کی نظر سے دیکھنا ضروری تھا کیونکہ یہ درحقیقت فکری حریف ہے۔ جب دوسری جنگ عظیم چھڑی تو روس (سوویت یونین) نے برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے ساتھ اس جنگ میں تعاون کیا اور وہ ایک عرصہ تک شانہ بشانہ رہے مگر یہ ایک وقتی اور خاص حالت تھی جو جنگ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم ہوگئی اور روس اور مغربی ممالک کے درمیان سرد جنگ پھر شروع ہوگئی، جبکہ سیاسی روابط بھی باقی رہے۔ یہ سیاسی روابط اقوام متحدہ میں، عالمی کانفرنسوں میں، سفارتی نمائندگی، اور سفارتی تعلقات کی شکل میں تھے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ کمیونسٹ پالیسی میں کوئی تبدیلی آگئی، بلکہ یہ اس کے بیشتر سیاسی اسالیب میں سے ایک اسلوب تھا۔ جہاں تک مغربی بلاک کے مقابلے میں کمیونسٹ پالیسی کا تعلق ہے، تو اصل میں یہ اُس فکر میں سے ہے جس کی بنیاد پر سوویت یونین کھڑا تھا۔ یعنی جو اشتراکی آئیڈیالوجی بتاتی ہے کہ سرمایہ داریت اور اشتراکیت پر امن طریقے سے ایک ساتھ نہیں رہ سکتے، اور یہ کہ بالآخر ایک کا دوسرے پر غلبہ ضروری ہے۔ اشتراکیت کی تمام کتابیں کہتی ہیں کہ دونوں مبادی (آئیڈیالوجیز) کے درمیان کشمکش کا خاتمہ ناممکن ہے۔ سٹالن اور لینن دونوں کی یہی رائے تھی، اس میں ان کا کوئی اختلاف نہیں تھا، تمام

کیمونسٹ (مفکرین) اس فکر پر متفق تھے اور کسی کیمونسٹ سیاست دان کیلئے یہ جائز نہیں تھا، خواہ وہ حکمران ہو یا کوئی اور، کہ سرمایہ داریت اور اشتراکیت کے درمیان پُرامن طریقے سے ایک ساتھ رہنے کی پالیسی پر چلے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے وہ اشتراکیت کی خارجہ پالیسی سے منحرف تصور کیا جائے گا۔

آئیڈیالوجی، پالیسی اور عالمی پہلوؤں سے دونوں بلاکوں کی یہی حقیقت ہے، مگر 1961 سے دونوں بلاکوں کے اندر عالمی پہلو سے ایسی تبدیلی واقع ہوئی جس نے ان کی حقیقی صورتحال ہی تبدیل کر دی۔ یوں عالمی صورتحال کے اندر بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں بلاکوں کے اندر بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے دوسرے نصف، یعنی 1956 سے کچھ تحریکیں اور اضطرابات شروع ہوئیں جنہوں نے بڑھتے بڑھتے دونوں بلاکوں کو مکمل طور پر توڑ پھوڑ دیا اور یہ دو بلاک اب دو ریاستوں یعنی امریکہ اور سوویت یونین میں تبدیل ہوگئے، جبکہ باقی ریاستیں کسی شمار قطار میں نہ تھیں۔

جہاں تک کیمونسٹ بلاک کا تعلق ہے، تو کیمونسٹ ریاست غیر قومی بنیادوں، یعنی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ اس بنیاد پر کہ پوری دنیا میں اور پوری دنیا کی کیمونسٹ ریاست ہوگی، اس بنیاد نے اسے دو امور اپنے سر لینے پر مجبور کیا۔ پہلا امر یہ کہ وہ اشتراکیت کے فروغ کیلئے داخلی طور پر ہمیشہ تیار رہے اور اشتراکیت کو پھیلانے کے لیے اقتصادی طاقت اور فوجی طاقت کی تیاری میں لگی رہے۔ یہ امر سیاسی اور اقتصادی دونوں پہلوؤں سے لوگوں پر مسلسل دباؤ کا تقاضا کرتا ہے، اسلئے کیمونسٹ ریاست روسی قوم کیلئے ایک مسلسل اور بھیانک خواب تھا اور اقتصادی پہلو سے روسی عوام عیش و آرام سے، بلکہ بعض بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم تھے۔ یہ سب کا سب دنیا میں اشتراکیت کے فروغ کے لئے کیا گیا۔ دوسرا امر جو کیمونسٹ ریاست نے اپنے سر لے لیا، وہ یہ کہ تمام مغربی حکومتوں کے ساتھ پکی دشمنی کا معاملہ کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ سرمایہ دار ممالک ہیں اور یہ کہ ان کے ساتھ ہمیشہ سرد جنگ بھڑکائی جاتی رہے اور ہمہ وقت حقیقی جنگ کیلئے تیاری کی جائے۔ اس صورتحال نے دنیا کو واضح طور پر دو دشمن گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ جن کے درمیان ہر وقت عملی جنگ کا خطرہ موجود تھا۔ مگر اشتراکیت کے بیشمار مفاسد کی وجہ سے اس کے علمبردار اپنے نظریات پر آخر تک قائم نہ رہ سکے، اس لئے گذشتہ صدی کی پانچویں دہائی کے اواخر میں ایک نئے مکتبہ فکر کو حکومت ملی جو اشتراکیت کی ایسی جدید تعبیر

کرنے لگا جو روس کے وطنی مفادات کے مطابق تھی۔ یہ تعبیر و تشریح اشتراکیت کے بجائے وطنیت کے زیادہ قریب تھی۔ چنانچہ داخلہ پالیسی میں انھوں نے لوگوں کیلئے سیاسی پہلو سے آسانی پیدا کر دی اور اقتصادی لحاظ سے بھی ان پر دباؤ کم کر دیا اور انہوں نے آہستہ آہستہ عام ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کی اجازت دینا شروع کر دی، جبکہ خارجہ پالیسی میں اس مکتبہ فکر نے امریکہ سے مفاہمت کرنے اور اس کے ساتھ مضبوط تعلقات بنانے کی کوشش شروع کی اور امریکہ وروس کے درمیان جنگ بندی کیلئے تیز رابطے شروع ہوئے۔ بڑھتے بڑھتے ان روابط نے ان تمام عالمی معاملات کا احاطہ کر لیا جن میں ان دونوں کے درمیان اختلاف ہو سکتا تھا۔ اور جب یہ رابطے گہرے ہو گئے تو روسی صدر خروشیف اور امریکہ کے صدر کینیڈی کے درمیان جون 1961ء کو ویانا میں ایک اہم ملاقات ہوئی اور اس میں تمام عالمی مسائل پر مشتمل معاہدہ ہوا۔ اس طرح روس (SU) عالمی پہلو سے ایک اہم فکر (نظریہ) سے دستبردار ہو گیا، یعنی اشتراکیت اور سرمایہ داریت کے درمیان دائمی دشمنی کی فکر۔ اور سرمایہ دارانہ معنوں میں پر امن طور پر اکٹھے رہنے کی فکر کو اختیار کر لیا۔

جہاں تک سرمایہ دارانہ بلاک کا تعلق ہے، تو امریکہ یہ جان چکا کہ برطانیہ اس کے خلاف کاروائی کرتا ہے اور مال غنیمت پر اس کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔ اور دیکھا کہ مشرقی اور مغربی بلاکوں کے درمیان قائم سرد جنگ کی صورتحال امریکہ کی طاقت کی پامالی کا سبب ہے، یہ ایسی صورتحال ہے کہ نہ تو جنگ ہے کہ اقتصادی ترقی سے ہٹ کر فوجی تیاریوں میں مشغول ہو جائے اور نہ امن کی حالت ہے، کہ فوجی و عسکری تیاریوں سے ہٹ کر اقتصادی ترقی کی طرف توجہ دی جائے۔ بلکہ یہ جنگ اور امن کی ایک درمیانی قسم کی حالت ہے جہاں ایک خیالی خطرے کیلئے عسکری تیاری میں اس کے قومی پیداوار کا خطیر حصہ ضائع ہو جاتا ہے، یعنی ایسی جنگ جس کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ واقع ہو گی یا نہیں۔ اس کے ساتھ اس نے یہ بھی دیکھا کہ جنگ کی اس آگ کا اصل محرک برطانیہ ہے اور یہ بھی جان لیا کہ برطانیہ کا مقصد یہ ہے کہ امریکہ کو ایسے حالات میں باقی رکھا جائے جن کے ہوتے ہوئے اس کے وسائل اور دولت خرچ ہوتے ہوتے اس کو کمزور کر دیں اور نتیجتاً عالمی توازن میں گڑبڑ پیدا ہو۔ امریکہ نے یہ بھی جان لیا کہ اس کا فائدہ (سرمایہ دار) برطانیہ کے خلاف (کیمونسٹ) روس کے ساتھ قریبی تعلقات میں ہے۔ چونکہ سرمایہ داریت کے کئی مفاسد (برائیاں) ہیں اور سرمایہ داروں کے

نزدیک منفعت ہی سب سے بڑی قدر (پیمانہ) ہے، ان کے نزدیک اقدار متعین نہیں، بلکہ مادی مفادات کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں، اس لئے امریکہ بھی روس (سوویت یونین) اور اپنے درمیان اختلافات کو کم کرنے اوراس کے ساتھ مذاکرات کیلئے کوشش کرنے لگا۔ یہ سلسلہ گذشتہ صدی کے چھٹی دہائی کے نصف سے شروع ہوا، یعنی کینڈی سے پہلے آئزن ہاور کے دور میں۔ کینیڈی نے اقتدار میں آتے ہی امریکہ روس کے درمیان مفاہمت کے اقدامات کی تکمیل میں جلدی کی۔ چنانچہ اس کے اقتدار کا ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہی گزرا تھا کہ جون 1961ء میں خروشیف اور کینیڈی کے درمیان ویانا میں میٹنگ ہوئی جس میں ان تمام عالمی مسائل کے بارے میں ایک ہمہ گیر معاہدہ ہوا جن میں ان دونوں کے درمیان اختلاف ہو سکتا تھا۔ اس طرح امریکہ ایک اہم فکر سے دستبردار ہو گیا جسے اس نے نصف صدی سے قبول کئے رکھا تھا، یعنی اشتراکیت کا خاتمہ اور دنیا کے نقشے سے اس کو مٹانا۔ امریکہ مسلسل سوویت یونین کے ساتھ مفاہمت کرنے لگا جسے پرامن طور بقائے باہمی (peaceful coexistence) کا نام دیا گیا۔ یہ سلسلہ دو دہائیوں سے زیادہ عرصے تک جاری رہا، یہاں تک کہ اسّی کی دہائی میں ریگن امریکہ کا صدر بنا، جس نے سوویت یونین کو ختم کرنے کیلئے کاروائی کرنے کا نظریہ دوبارہ زندہ کیا۔

اس طرح دونوں بلاکوں کے سربراہان کے مفادات اس طور پر ایک ہوئے کہ دونوں عالمی سطح پر بااثر رہیں گے اور اپنے علاوہ کسی اور ریاست کو نمودار ہونے سے روکیں گے اور ایسا لگتا ہے کہ دونوں کا چین کے گرد گھیرا تنگ کرنے، برطانیہ کو اس کی کالونیوں سے مار بھگانے، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید سے اس کے اثر ونفوذ کا خاتمہ کرنے اور جرمنی کو دوبارہ ایٹمی پاور بننے سے باز رکھنے کی پالیسی پر اتفاق ہوا تھا۔ پھر انہوں نے پُر امن طور پر اکٹھے رہنے کا معاہدہ کیا، یا بالفاظ دیگر جسے وہ ہم آہنگی (concord) کا نام دیتے ہیں، اسی طرح ان کے درمیان مسائل کے حل کیلئے عسکری قوت کی طرف عدم رجوع، دنیا کی آپس میں تقسیم، ہر ایک کے زیر اثر علاقوں کی تعین اور ایک دوسرے کے زیر اثر علاقوں کے اندر تعاون کرنے پر اتفاق ہوا، بالفاظ دیگر دونوں عالمی اتحادیوں کی شکل میں ایک قوت بن گئے۔ یوں ان معاہدوں کے نتیجے میں عالمی صورتحال تبدیل ہو گئی۔

عالمی صورتِ حال کے اندر تبدیلی کچھ یوں ہوئی کہ اب دنیا دو مخالف گروہوں پر مشتمل نہیں رہی، جو ایک دوسرے کی سیاسی اور اقتصادی حریف ہوں اور جن کے تعلقات متعدد مسائل کا شکار ہوں، جیسا کہ 1961ء سے پہلے کی حالت تھی۔ بلکہ اب دنیا کے صرف فکری طور پر دو گروہ رہ گئے، چنانچہ اشتراکی فکر اس زمانے میں اشتراکی ممالک کی نمائندگی میں باقی رہی اور سرمایہ دارانہ فکر سرمایہ دار ممالک کی نمائندگی میں باقی رہی۔ چونکہ دونوں فکر میں یکسانیت اور ہم آہنگی ممکن نہیں، اس لئے لا محالہ اس پہلو سے دنیا کے دو گروہ تھے۔ لیکن عالمی پہلو سے دونوں گروہ ختم ہو چکے تھے، اب دنیا پوری کی پوری ایک طاقت بن گئی تھی جس کی نمائندگی امریکہ اور روس کر رہے تھے۔ اب صرف یہ دونوں جن (دیو) ہی دنیا پر حکمرانی کر رہے تھے، جبکہ امریکہ سپر طاقت کے منصب پر فائز تھا۔

یوں مشرقی و مغربی دونوں بلاک ختم ہو گئے اور دنیا میں عالمی بلاکوں کا وجود نہ رہا اور عالمی صورتحال میں بنیادی تبدیلی آ گئی۔ اس کی حالت جنگِ عظیم اول سے پہلے والی حالت جیسی ہو گئی، یعنی الگ الگ حکومتیں جن میں سے ہر ایک مال غنیمت لینے اور دوسری ریاستوں کو کمزور کرنے کی کوشش کرتی ہے، اب کشمکش بلاکوں کی بجائے ریاستوں کے درمیان ہونے لگی۔ البتہ ویانا کانفرنس کے بعد ہم آہنگی (concord) کے وقفے کے دوران اور جنگ عظیم اول سے پہلے کے حالات کے درمیان فرق یہ تھا کہ عالمی صورتِ حال کے حوالے سے اب صرف دو بڑی ریاستیں ہی فیصلے کرنے لگیں اور باقی ریاستیں ان دونوں کے شر سے اپنی جان بچانے اور کوئی ایسا اتحاد بنانے کی کوشش میں مصروف ہو گئیں، جو دونوں ریاستوں کے سامنے قوت بن کر کھڑا ہو سکے۔ جبکہ جنگ عظیم اول سے پہلے کے حالات اس سے قدرے مختلف تھے، جب بڑی ریاستیں اس وقت طاقت کے اعتبار سے ہم پلہ ہونے لگی تھیں، اگرچہ سپر طاقت سب سے زیادہ طاقتور تھی۔ یہ صورتحال طاقت کے توازن میں خلل اور مالِ غنیمت پر شدید قسم کی لڑائی میں تبدیل ہو گئی تھی، اور اسی سے پہلی جنگ عظیم نے جنم لیا تھا۔

جہاں تک اس وقفے کا تعلق ہے جو امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان مفاہمتی معاہدے (détente) کے نتیجے میں وجود میں آیا، تو دونوں ریاستوں کی مجموعی طاقت دنیا کی کسی بھی دوسری ریاست سے کئی گنا زیادہ تھی، بلکہ دنیا کی تمام ممالک کی اجتماعی قوت سے بھی زیادہ تھی، اس لئے عالمی جنگ اپنے

مشہور معنی کے اعتبار سے نہیں چھڑ سکی بلکہ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ دوسری ریاستوں کا اتحاد کسی ایسی کشمکش کو جنم دے گا جو عالمی جنگ کا باعث بنے۔ اس طرح دوسری جنگ عظیم سے پہلے اور معاہدے(détente) کے وقفے کے درمیان والی عالمی صورتحال کی یہی حالت تھی کیونکہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے متفرق حکومتیں تھیں، اگرچہ محاذ(fronts) بننا شروع ہوگئے تھے مگر بہر حال شروع میں ہم پلہ ریاستیں موجود تھیں، پھر اس توازن میں بگاڑ آگیا، چنانچہ جرمنی، اٹلی اور جاپان طاقتور ممالک بن گئے جبکہ برطانیہ اور فرانس کی طاقت میں اضافہ نہ ہوا، اورامریکہ غیر جانبدار تھا۔ طاقت کے توازن کے اندر اس بگاڑ نے اٹلی، جرمنی اور جاپان میں سے ہر ایک کو ممالک پر بذریعہ جنگ قبضہ کرنے پر اُبھارا، جس نے بالآخر شدید کشمکش میں تبدیل ہو کر دوسری جنگ عظیم کو جنم دیا۔ جبکہ معاہدے(détente) کے وقفے کی حالت اس لحاظ سے قدرے مختلف تھی کہ اب عالمی صورتِ حال کی نمائندگی دو دیو ہیکل ریاستیں کر رہی تھیں، یہ ایسی حالت تھی جو کسی عالمی جنگ کی اجازت نہیں دیتی تھی، ہاں یہ ممکن تھا کہ چند ریاستیں ان دو ریاستوں سے تنازعہ کریں یا چند ریاستیں دیگر چند ریاستوں کے ساتھ تنازعہ کریں۔ تاہم اس قسم کی لڑائیوں سے اگرچہ علاقائی جنگیں چھڑ جاتی، لیکن یہ دونوں بڑی ریاستیں جب چاہتی جنگ کو روک سکتی تھیں۔

تاہم مفاہمتی معاہدے(détente) کی پالیسی، جو امریکہ اور روس کے درمیان 1961 کے معاہدے کے ذریعے جاری ہوئی تھی، اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اشتراکیت اور سرمایہ داریت کے درمیان کشمکش ختم ہوگئی ہے۔ اس کے کچھ خاص اسباب اور وجوہات تھیں، دونوں فریقین کو سرد جنگ اور ایک ایسے خطرے کے لیے تیاری نے تھکا کر رکھ دیا تھا جس کے وقوع اور عدم وقوع کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا، اس لئے وہ آپس میں نرمی کی طرف لوٹ آئے تھے اور دنیا کو آپس میں تقسیم کیا تاکہ دونوں اپنے اندرونی امور پر توجہ دے سکیں۔ تاہم ویتنام کی جنگ کے اختتام کے بعد détente کی پالیسی اپنی اہمیت کھونے لگی۔ چنانچہ فرانس کو جب اس کی کالونیوں سے نکالا گیا، تو وہ یورپ کے ساتھ جاملا، تاکہ یورپ کے ساتھ مل کر قوت حاصل کرے۔ اور جہاں تک برطانیہ کی بات ہے تو اسے اپنی کمزوری کا احساس ہوا اور اس نے ممکنہ حد تک بچاؤ کیلئے یورپ کے ذریعے قوت حاصل کرنے کی کوشش شروع کی ۔ دوسری طرف سوویت یونین ایک دیو قامت

اسٹریٹجک فوجی طاقت بن گیا۔ اس نے خلائی تسخیر کے میدان میں برتری حاصل کی اور اپنے ناگزیر دائرہ(vital domain)سے دور کے علاقوں تک اپنی موجودگی بڑھانے میں کامیاب ہوا، اس طرح وہ ایک مؤثر عالمی قوت بن گیا۔

کنزرویٹو اور لبرل پارٹیوں جیسے بڑے سیاسی گروہوں کی طرف سے نرمی کی پالیسی کو آڑے ہاتھوں لیا گیا تو امریکہ اس پالیسی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ سوویت یونین نے اس پالیسی کے سائے میں عام تباہی پھیلانے والی طاقت حاصل کرلی تھی، جو امریکیوں کیلئے ایک خوف اور خطرے کا باعث بن گئی۔ امریکہ کے حتمی امن کے دن ختم ہوگئے تھے اوراب اس کا امن باہمی تحفظ پر قائم تھا، یعنی ایک کی قسمت دوسرے پر منحصر تھی۔ اس پالیسی کے ضمنی اثرات یہ تھے کہ یورپی ممالک امریکہ سے علیحدہ ہونے لگے اور انہوں نے سوویت یونین کے ساتھ معاملات کیلئے امریکی اثرات سے آزاد ہو کر مستقل پالیسی بنانی شروع کر دی تھی۔ انہی حالات نے کسنجر کو 1973 کو یورپ کا سال کہنے پر آمادہ کیا اور اس کا سبب یہ تھا کہ 1973 میں جب ویتنام کے حوالے سے پیرس معاہدے پر دستخط ہوئے تو اس وقت امریکہ اور روس(سوویت یونین) فرانس کو اس کی بہت سی کالونیوں سے نکال چکے تھے اور برطانیہ کو بھی دنیا بھر میں اپنے بہت سے فوجی اڈے خالی کرنے پر مجبور کر کے بہت سی کالونیوں سے نکال دیا تھا، دوسری طرف چین کی سرگرمیوں کو بھی محدود کیا تھا، اس طرح مفاہمت کی پالیسی کو مزید جاری رکھنے کا جواز ختم ہو گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ اس معاہدہ کے نتیجے میں پہلے سے بڑھ کر ایک بڑی عسکری طاقت کی حیثیت سے باہر آیا۔ برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کو ان کی کالونیوں سے نکال کر ان کی جگہ لینے کی وجہ سے اس نے ایک خاطر خواہ سیاسی اثر بھی حاصل کرلیا، اس لئے مفاہمتی پالیسی امریکہ کے حق میں بارآور ثابت ہوئی۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ امریکہ کی نسبت سے اس کے منفی پہلو نہیں تھے، مگر اسکے منفی پہلو، مثبت پہلوؤں کے مقابلے میں کچھ نہ تھے، لیکن اس معاہدہ نے 1973 میں اپنا جواز کھو دیا۔ چنانچہ امریکہ نے مفاہمتی پالیسی سے پیدا شدہ منفی اثرات کو زائل کرنے پر توجہ دی۔ اس نے اپنی ترجیحات میں یہ رکھا کہ: سویت یونین کو اس کے ناگزیر دائرے (vital domain) سے باہر اثرورسوخ

پھیلانے سے باز رکھا جائے اور یہ کہ سوویت یونین کو اقتصادی طور پر کمزور کیا جائے اور یورپ کو دوبارہ امریکی چھتری کے نیچے لایا جائے۔

سوویت یونین کے اپنے ناگزیر دائرے سے باہر اثر ونفوذ پھیلانے کی جہاں تک بات ہے، سو یہ اثر ونفوذ کمزور قسم کا تھا جس کی وجہ سوویت یونین کی اقتصادی کمزوری تھی جس کو کسی بھی لمحے اکھاڑ دینا آسان تھا، ہاں اتنی بات تھی کہ یہ (معاہدہ) سوویت یونین کو عالمی مسائل میں شرکت کا حقدار بناتا تھا، یہ بات امریکہ کو ناگوار گزرتی تھی جو مفاہمت کی پالیسی کے ذریعے سوویت یونین کا گھیرا تنگ کرنا چاہتا تھا، نہ کہ اس کو امریکہ کا ہم پلہ بنایا جائے، اس لئے اس نے سوویت یونین کو اس کے ناگزیر دائرے سے باہر اثر ورسوخ کے علاقوں سے نکال دینے کو ضروری خیال کیا۔

جہاں تک سوویت یونین کو اقتصادی طور پر اضطراب میں مبتلا کرنے کی بات ہے، تو امریکہ نے دیکھا کہ اگر سوویت یونین کو اسلحہ کی دوڑ میں کھینچا جائے تو یہ امر اس کو اقتصادی طور پر کمزور کر کے اس کو زوال وانحطاط کی طرف لے جائے گا۔ یہ (پالیسی) ساتویں دہائی کے اواخر میں کارٹر کے زمانے میں شروع ہوئی اور اس میں شدت آگئی، اور یہی وہ نمایاں کارنامہ تھا جس نے ریگن انتظامیہ کی پالیسی کو ممتاز بنایا، کیونکہ ریگن ہی تھا جس نے اسلحہ کی دوڑ کو بھڑکایا۔ وہ انہی پروگراموں کے مطابق چلا جو اس کے پیشرو کارٹر نے وضع کئے تھے۔ ان میں اہم ترین MX موبائل میزائل تھے اور اس کے علاوہ اس نے اسٹریٹیجک دفاع یا سٹار وار میں پہل کرنے کو اپنایا۔ یہ اسٹریٹجی دشمن کے میزائل روکنے والی ڈھال تیار کرنے کیلئے ٹیکنالوجی کے آغاز کا اشارہ تھا۔ اس کی وجہ سے سوویت یونین کو یہ خیال ہوا کہ اگر ایٹمی جنگ شروع ہوگئی تو اس کے ایٹمی اثاثے بے اثر ہو کر رہ جائیں گے۔ نتیجتاً طاقت کے توازن میں بگاڑ آجائے گا اور امریکہ کو ایٹمی جنگ شروع کرنے کا حوصلہ ملے گا، یہ بات سوویت یونین کیلئے اپنے دفاعی نظام کو ترقی دینے کا باعث بنی، کیونکہ سوویت یونین کو دستیاب معلومات کے مطابق اس کیلئے اقدامی (جارحانہ) اسلحہ کے میدان میں امریکہ کا مقابلہ ناممکن تھا، اس لئے اب مقابلہ اقدامی وسائل کو ترقی دینے کی بجائے دفاعی وسائل کو ترقی دینے کی طرف منتقل ہوگیا۔ ریگن کی دفاعی اسٹریٹجی یا سٹار وار کو اگرچہ شروع میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی، لیکن یہ کامیابی اس درجے کی نہیں تھی کہ جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے

کہ میزائل شیلڈ کو تیار کرنے والی ٹیکنالوجی ہاتھ آگئی ہے۔ سائنسی طور پر یہ ثابت ہوا کہ ایسی لیزر بندوقوں کی تیاری تقریباً ناممکن ہے جو مطلوبہ شدت (کثافت) کے ساتھ لیزر شعاعوں کو پھینکیں جو بین البراعظمی بیلسٹک میزائل (ICBM) کو ہوائی کُرّے میں داخل ہونے سے پہلے پہلے خلا میں تباہ کر سکیں، لیکن ریگن نے اس کے باوجود کہ یہ ٹیکنالوجی ترقی کے اعلیٰ مراحل تک نہیں پہنچی تھی، دفاعی اقدام کو اپنانے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح وہ سوویت یونین کو تشویش میں مبتلا کر کے جدید اسلحہ کی دوڑ میں گھسیٹ لایا، اس کی کمزور معیشت جس کا بوجھ اُٹھانے کی قابل بالکل نہ تھی۔ یہ سب اس کے باوجود تھا کہ سٹاروار کی اسٹر ٹیجی اس معاہدہ کی خلاف تھی، جس پر 1972 میں امریکہ اور سوویت یونین نے دستخط کئے تھے، جو اینٹی میزائل ٹیکنالوجی کے متعلق تھا۔ لیکن ریگن اس بات پر اڑا رہا کہ یہ اقدام اس معاہدے کے خلاف نہیں، جس کی وجہ سے سوویت یونین کے ساتھ حالات سنگینی کی طرف گئے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریگن نے اپنے اس عمل کے ذریعے مفاہمتی (détente) پالیسی کے آخری نشانات کو بھی مٹا دیا۔

ریگن کے ان سرگرمیوں نے سوویت یونین کو جدید اسلحہ کے حصول کی طرف کھینچ لیا۔ اس بار اگرچہ یہ دفاعی نظام کی ترقی کیلئے تھا نہ کہ اقدامی نظام کیلئے۔ تاہم یہ سب کچھ سوویت یونین کو معاشی لحاظ سے کمزور کرنے، اس کو 1961 میں ویانا معاہدے کے متفقہ ناگزیر دائرے کی طرف لوٹانے، بلکہ اس کو زوال کی طرف لے جانے کیلئے تھا۔

جہاں تک یورپ کی بات ہے، جس نے مفاہمتی پالیسی کے ذریعے امریکہ کے تسلط سے نکلنے کا فائدہ اُٹھایا، تو ان کو دوبارہ امریکی چھتری کے نیچے واپس لانے کیلئے امریکی سیاستدانوں نے عملی اقدامات کئے، جبکہ یورپ 1973 سے اس چھتری کو چھوڑنے کے نقطے پر پہنچ گیا تھا جس کو کسنجر نے یورپ کا سال کہا تھا، اس وقت یورپی ممالک یہ بات دہرانے لگے تھے کہ ان کے مفادات اور امریکی مفادات جدا جدا ہیں اور صرف امریکی مفادات کی خاطر وہ امریکہ کے ساتھ کسی جنگ میں شامل ہونے سے اپنے آپ کو دور کرنے لگے۔ چنانچہ امریکہ نے 1982ء میں Pershing-2 اور Cruise طرز کے درمیانی رینج کے میزائل یورپ میں نصب کر دیے۔ اس کیلئے جواز یہ پیش کیا کہ سوویت یونین نے یورپ میں اپنے درمیانے رینج کے میزائل نصب کر دیے ہیں اور

انہیں ہٹانے سے انکار کیا ہے۔ اس طرح امریکہ نے دفاع کرنے کی دلیل کی بنیاد پر یورپی ممالک کا امن اپنے امن کے ساتھ اور ان کی قسمت کو امریکہ کی قسمت کے ساتھ اسطرح جوڑ دیا کہ یورپ اب اپنے آپ کو اس سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔

ریگن کی دوسری مرتبہ صدر کے عہدے پر کامیابی کے ساتھ 1985 میں گورباچوف سوویت یونین کا نمائندہ بنا۔ اس کو اقتدار ملتے ہی سوویت یونین یکے بعد دیگرے امریکہ کو راستہ دینے لگا، یہاں تک کہ سوویت یونین سقوط کے راستے پر ہچکولے کھانے لگا۔ اس لئے ریگن یہ کہنے میں حق بجانب تھا، جب وائٹ ہاوس کو چھوڑتے وقت اس سے پوچھا گیا کہ اس کی نظر میں اس کا اہم ترین کارنامہ کیا ہے، تو اس نے جواب دیا "لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں نے سرد جنگ جیت لی ہے"۔

اس طرح ریگن کے وہائٹ ہاؤس جانے کے ساتھ عالمی صورتحال میں بنیادی تبدیلی واقع ہوئی، مفاہمت (detente) کی پالیسی مکمل طور پر ختم ہوگئی اور سوویت یونین اسلحہ کی دوڑ میں کھچ جانے اور معاشی طور پر کمزور ہونے کے باعث لڑکھڑانے لگا۔ امریکہ کی طرف سے سوویت یونین کے علیحدگی پسند اور مخالف گروہوں کی مدد اس کے علاوہ تھی اور سوویت آئیڈیالوجی پر عالمی سطح پر میڈیا کے ذریعے تنقید جاری تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ کی نظر میں اب مفاہمتی پالیسی نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی، بلکہ امریکہ نے سوویت یونین پر سیاسی، اقتصادی اور آئیڈیالوجیکل حملہ کیا جو اس کے اثر ورسوخ اور ناگزیر دائرے سے باہر اس کی اثر ورسوخ کی کوششوں میں انحطاط پذیری کا باعث بنا اور داخلی طور پر اس کے معاشی زوال کا سبب بنا، جبکہ دوسری جانب سوویت یونین اور مشرقی بلاک کے اندر سوویت پالیسی کی مخالف تحریکیں اُٹھیں۔ پھر دنیا بھر میں اس قسم کی تحریکیں اٹھیں اور یہ سلسلہ گزشتہ صدی کی نوے کی دہائی کے اوائل میں سوویت یونین کے سقوط تک جاری رہا۔ چنانچہ امریکہ اب پہلے کی طرح واحد سپر طاقت بن گیا اور کوئی ایسی ریاست موجود نہ تھی کہ جو طاقت میں اس کے قریب ہو اور اسے چیلنج کر سکے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں ممالک پر جو حالات آتے رہے، وہ کچھ اس طرح ہیں کہ پرانے زمانے میں دنیا پر سلطنتِ عثمانیہ، پروشیا، روس، آسٹریا، برطانیہ اور فرانس کا تسلط تھا۔ یہی وہ ممالک تھے جو عالمی امور

کو کنٹرول کرتے، امن کے مسائل کھڑے کرتے اور جنگ کا فیصلہ کرتے تھے۔ پھر جب امریکہ کا ظہور ہوا تو اس نے ان ریاستوں کی سرگرمیوں کو محدود کیا اور ان کو امریکہ سے دور کر کے قدیم دنیا میں محصور کر دیا۔

ان چھ بڑی ریاستوں میں سے آسٹریا بڑی ریاست کے مقام سے گر گیا۔ چنانچہ عالمی ریاستیں یہ پانچ ہو گئیں: روس، جرمنی، برطانیہ، فرانس اور سلطنتِ عثمانیہ۔ پھر سلطنتِ عثمانیہ کا سقوط ہوا تو دنیا کنٹرول کرنے والی ریاستیں چار رہ گئیں: روس، جرمنی، فرانس اور برطانیہ۔ پھر روس میں کمیونیزم کے ابھرنے اور حکومت پر کمیونسٹ پارٹی کے قبضہ کی وجہ سے روس جنگِ عظیم اول کے بعد گوشہ نشین ہو گیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں شکست کھانے کی وجہ سے جرمنی کا سقوط ہوا تو بڑی ریاستیں دو ہی رہ گئیں: برطانیہ اور فرانس۔ اس وقت برطانیہ امریکہ کے بغیر اکیلا دنیا پر راج کرتا تھا، جبکہ فرانس برطانیہ کا پیچھا کرنے میں ہانپ رہا تھا۔ چوتھی دہائی کے اوائل یعنی 1933 میں جرمنی میں نازی پارٹی نے اقتدار سنبھال لیا اور جرمنی کی ترقی کیلئے کام کیا، یہاں تک کہ جرمنی ایک دفعہ پھر بڑی ریاست بن گیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے اٹلی میں مسولینی نے حکومت پر قبضہ کیا اور اٹلی کی ترقی کیلئے کام کیا، یہاں تک کہ اٹلی دوبارہ بڑی ریاستوں میں سے شمار ہونے لگا۔ پھر جاپان ابھرا اور صنعتی ملک بن جانے کے بعد اس نے اپنے اثر ورسوخ کو بڑھایا۔ چنانچہ وہ بھی بڑی ریاستوں میں سے شمار ہونے لگا۔ سوویت یونین نے طاقت حاصل کی اور اس کا عالمی اثر پیدا ہو گیا اور ایک دفعہ پھر وہ بڑی ریاستوں میں سے شمار ہونے لگا۔ چنانچہ بڑی ریاستیں چھ ہو گئیں: سوویت یونین، جرمنی، برطانیہ، فرانس، اٹلی اور جاپان، جبکہ امریکہ گوشہ نشین رہا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد جرمنی، اٹلی، اور جاپان کو شکست ہوئی، چنانچہ ان ریاستوں کی شان گھٹ گئی، جبکہ امریکہ گوشہ نشینی چھوڑ کر عالمی مسائل میں شرکت کی طرف لپکا، اس نے برطانیہ اور فرانس کے بڑی ریاستیں ہونے کے مرتبے کا پاس رکھا۔ اس طرح بڑی ریاستیں چار ہو گئیں: سوویت یونین، برطانیہ، فرانس اور امریکہ۔ اور جب 1961 میں امریکہ اور سوویت یونین کا معاہدہ ہوا تو برطانیہ اور فرانس بڑی ریاست کے مقام سے گر گئے۔ اس لئے اب بڑی ریاستیں دو ہی رہ گئیں: سوویت یونین اور امریکہ، اور آپس میں معاہدہ کر کے ایک طاقت بن گئے۔ چنانچہ اب دنیا میں صرف ایک ہی بڑی طاقت رہ گئی جو دو ریاستوں سے مل کر بنی تھی اور سوویت یونین کے سقوط سے کچھ عرصہ پہلے تک ان کے علاوہ دنیا کو کنٹرول کرنے والی ریاستیں نہیں رہی تھیں۔

1985ء میں گورباچوف کے سوویت یونین کی قیادت سنبھالنے کے ساتھ ہی، جبکہ ریگن دوسری مرتبہ عہدہ صدارت پر فائز ہوا، سوویت یونین یکے بعد دیگرے امریکہ کو مراعات دینے لگا اور سقوط کے راستے پر ڈانواڈول ہونے لگا۔ اس لئے ریگن یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ جب وائٹ ہاوس کو چھوڑتے وقت اس کے بحیثیت صدر اہم ترین کارنامے کے بارے میں پوچھا گیا، تو اس نے جواب دیا کہ "لوگ یہ کہتے ہیں: میں نے سرد جنگ جیت لی ہے"۔ یہی چیز تھی جو عالمی صورتحال پر ایک ہی سپر طاقت کا تسلط لوٹانے کا باعث ہوئی اور سوویت یونین سپر طاقت کے مقام سے گر گیا۔ اس کے بعد سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا۔ سوویت یونین کی فوجی طاقت اور وسائل روس کو ملے، لیکن روس سیاسی غربت اور نظریاتی شناخت کے فقدان کا شکار تھا جو اس کی پریشانی کا باعث تھا، دوسری جانب وہ کمیونیزم کے چھوڑے ہوئے داخلی اقتصادی اور سیاسی مسائل کا سامنا کر رہا تھا، یہ سب عالمی سیاست پر اس کے اثرانداز ہونے سے پیچھے ہٹنے کا سبب بنا۔

اس طرح امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور بن گیا، یعنی ایسی سپر طاقت جو عالمی سیاست کا نظم ونسق چلا سکتی ہو اور اس منصب پر اس کا کوئی مقابل بھی موجود نہ ہو۔ یورپی مثلث (فرانس، برطانیہ اور جرمنی) کی یہ کوشش تھی اور اب تک کر رہے ہیں، کہ وہ مزاحمت کے میدان میں کود جائیں، جیسا کہ 2003ء میں عراق پر قبضے کے دوران ہوا اور جیسا کہ اسی سال یورپی ممالک کی نیٹو سے الگ ایک آزاد یورپی فوج کی تشکیل کے سلسلے میں ان کی ملاقاتوں میں یہ بات سامنے آئی۔ اور جیسا کہ جون 2004 میں مشرق وسطیٰ کے متعلق امریکی منصوبے کے بارے میں، جو G8 کی سربراہ کانفرنس میں پیش کیا گیا، ان کی بحث ومباحثوں سے بھی یہ واضح ہو گیا۔ مگر یہ ایسی کوششیں نہیں تھیں جنہیں سپر طاقت کے منصب پر مشہور معنی میں مزاحمت کہا جاسکے، بس ان کوششوں کو امریکہ کے ساتھ عالمی سیاست میں کسی قدر حصہ لینے کی کوششیں ہی کہا جاسکتا ہے۔

یہ موجودہ حالات ہیں، اور یہ جاننا ضروری ہے کہ پرانے زمانے سے دنیا پر صرف بڑی ریاستیں حکمرانی کرتی چلی آرہی ہیں، خصوصاً سپر طاقت (اوّل ریاست)۔ اور یہ کہ بڑی ریاستیں کبھی کبھار کمزور ہو جاتی ہیں اور اس کی جگہ دوسری ریاستیں لے لیتی ہیں، اس طرح عالمی صورتحال بدل جاتی ہے۔ یہ بھی جاننا چاہئے کہ عالمی حالات میں تبدیلی بڑی ریاستوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی کا باعث ہوتی ہے، سپر طاقت

اور باقی مزاحم ریاستوں کی حالت میں قوت اور کمزوری کا فرق آجاتا ہے جو سپر طاقت کی صورتحال کو کمزور کر دیتا ہے۔ جیسا کہ برطانیہ کے ساتھ ہوا جب جرمنی نے اس کے ساتھ مزاحمت کی، یا پھر ایک ملک طاقتور ہو جاتا ہے، جیسا کہ امریکہ کے ساتھ ہوا جب اس نے برطانیہ اور فرانس کے اثر کو ختم کیا اور ویانا کی ملاقات کے بعد عالمی اثر کو اپنے اور روس کے لئے باقی رکھا۔ یا پھر ایسا ہو جاتا ہے کہ سپر طاقت کو بغیر کسی مزاحم ریاست کے یہ منصب مل جاتا ہے، جیسا کہ سوویت یونین کے سقوط کے بعد ہوا۔ لہٰذا ان تمام کا باریک بینی سے اور مرحلہ بہ مرحلہ ادراک ہونا چاہئے تا کہ عالمی سیاست کی سمجھ آسان ہو جائے۔

ریاستوں کے درمیان کشمکش کے محرکات

ابتدائے تاریخ سے لیکر قیامت کے آنے تک عالمی کشمکش کے پیچھے دو عوامل ہی کار فرما نظر آتے ہیں۔ سرداری کی محبت (حبِ سیادت) اور فخر، یا مادی فوائد کے حصول کیلئے مسابقت۔ جہاں تک سرداری (قیادت) کی محبت کا تعلق ہے تو اس کا ایک اظہار اپنے لوگوں اور قوم کو سرداری دلانے کی خواہش ہے، جیسا کہ نازی جرمنی اور فاشسٹ (فسطائی) اٹلی میں ہوا۔ سرداری کی محبت کا اظہار آئیڈیالوجی کی قیادت اور فروغ کی شکل میں بھی ہوتا ہے، جیسا کہ اسلامی ریاست کی یہ صورتحال لگ بھگ تیرہ سو سال رہی، یا جیسا کہ گزشتہ صدی میں کمیونسٹ ریاست کے تیس سالہ عرصے کی صورتِ حال تھی، اس کے انہدام سے قبل جو پچھلی صدی کی نوے کی دہائی میں وقوع پزیر ہوا جب اس ریاست کی تشکیل کو ستر سال ہو چکے تھے۔

جہاں تک کسی دوسری ریاست کو اپنی طاقت میں اضافے سے باز رکھنے کے مقصد کا تعلق ہے، جیسا کہ نپولین کے خلاف دوسری ریاستوں نے کیا اور جیسا کہ اسلامی ریاست کے خلاف ریاستوں کا معاملہ رہا اور جیسا کہ نازی جرمنی کے خلاف دیگر ریاستوں کا معاملہ رہا، یہ سب کا سب قیادت (سرداری) کی محبت کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ سرداری کی محبت دوسرے کی بالادستی اور قیادت کے خلاف محاذ آرائی پر ابھارتی ہے۔

اسلامی ریاست اور سوویت ریاست کے زوال کے ساتھ پوری دنیا پر ایک ہی مقصد کا تسلط ہو گیا، اور وہ مادی فوائد کے حصول کی دوڑ ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ اسلامی ریاست بطور سپر طاقت کے دوبارہ وجود میں نہیں آتی، وہ ریاست جو عالمی کشمکش پر اثر انداز ہو گی اور اس کے ساتھ ہی آئیڈیالوجی اور اس کے نشر واشاعت کی محبت کا مقصد بھی لوٹ آئے گا۔

عالمی کشمکش کے عوامل میں سے سب سے زیادہ خطرناک استعماریت کا مقصد ہے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو، کیونکہ اسی نے چھوٹی جنگوں کو بھڑکایا اور یہی دونوں عالمی جنگوں کا باعث بھی بنا، یہی خلیجی جنگوں اور افریقہ کی جنگوں کا سبب بنا، یہی افغانستان اور عراق جنگ کا پیش خیمہ بنا اور دنیا میں استعماریت ہی بحرانوں اور پریشانیوں کا منبع رہی ہے۔

امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس کے درمیان عراق، افغانستان، مشرق وسطیٰ وغیرہ جیسے عالمی مسائل کے حوالے سے موجودہ علانیہ اور خفیہ مقابلے، باہمی دشمنی اور رسہ کشی استعماریت ہی کے تحفظ، مفادات اور وسائل پر تسلط کیلئے ہے۔ اس لئے استعماریت ہی اب عالمی کشمکش کو کنٹرول کرتی ہے جس میں وسائل پر جھگڑے، اثر ورسوخ کے اوپر کشمکش اور تسلط کے حصول کیلئے تمام تر اشکال کے ساتھ مقابلہ بازی شامل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مادی مفادات کے پیچھے بھاگ دوڑ، بالخصوص استعماریت کی لالچ اور ہوس نے ہی بڑی ریاستوں کے درمیان سیاسی کشمکش کو جنم دیا۔ یہ کشمکش علاقائی اور عالمی جنگوں کا سبب بنی اور ان جنگوں کے تدارک کیلئے ہی نام نہاد امن اور عالمی امن کی اصطلاح گھڑی گئی اور امن وسلامتی کے تحفظ کا بہانہ تراشا گیا۔

امن کی حفاظت کا بہانہ دنیا میں نیا نہیں، بلکہ یہ ایک قدیم حقیقت ہے جو انیسویں صدی کے اوائل سے پائی جاتی رہی ہے۔ چنانچہ Aix –La-Chapelle معاہدہ جو 1818 میں اس وقت کی پانچ بڑی ریاستوں کے درمیان طے پایا، اس کا جواز بھی امن کی حفاظت بتایا گیا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے ذریعے ان بڑی ریاستوں نے اپنے آپ کو عالمی برادری کے امن اور نظم وضبط کا چوکیدار بنایا اور موقع ملتے ہی دوسری ریاستوں کے معاملات میں اس لئے مداخلت کی، کہ ان کی دانست میں امن اور نظم وضبط کو خطرات لاحق تھے۔ عالمی برادری میں امن اور نظم وضبط کی حفاظت کے اس بہانے کو بعد میں بڑی ریاستوں کی مداخلت اور جنگ کا ایک ذریعہ بنایا گیا، بلکہ یہ ایک بین الاقوامی نعرہ بن گیا جو استعمار کے تحفظ اور اس کے اثر ونفوذ کے لئے ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔

ان کے دعوے کے مطابق امن کی حفاظت، بڑی ریاستوں کے درمیان اتحاد یا عالمی کانفرنسوں کے ذریعے کی جائے گی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس کی حفاظت عالمی تنظیموں کے ذریعے کی جانے لگی۔ چنانچہ 1919 کے امن معاہدے کی متن میں امن کو برقرار رکھنے کیلئے ایک بین الاقوامی تنظیم کے قیام کو شامل کیا گیا جسے لیگ آف نیشن کہتے ہیں۔ یہ فرض کیا گیا کہ یہ تنظیم امن کی حفاظت کا کام سرانجام دیگی، مگر جن ریاستوں نے اسے قائم کیا تھا، انہوں اپنے معاہدات کو توڑا اور اس کے قیام کے مقاصد کی خلاف ورزی کی۔ اگرچہ تسلیم یہ کیا گیا تھا کہ بڑی ریاستیں اپنی اپنی قیادت سے دستبردار ہوں گیا ور ان کی جگہ مذکورہ تنظیم ہی امن کی حفاظت اور جنگ کی روک تھام کی ذمہ داری سنبھالے گی لیکن بڑی ریاستیں نہ تو اپنی کالونیوں سے دستبردار ہوئیں، اور نہ اپنی حالت بدلی، بلکہ اس کی بجائے انہوں نے اپنی اصل دلچسپی مختلف طاقتوں کے درمیان توازن اور اپنے مفادات کا تحفظ بنالی۔ اس پر مزید یہ کہ جرمنی اور سلطنتِ عثمانیہ کو آپس میں تقسیم کیا جس میں سے برطانیہ نے سب سے بڑا حصہ لیا۔ نتیجتاً جس امن کی خاطر تنظیم عمل میں لائی گئی تھی، وہ برقرار نہ رہ سکا، جس کے باعث متعدد جنگیں ہوئیں جو بالآخر جنگ عظیم دوم پر اختتام پذیر ہوئیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد بین الاقوامی امن وسلامتی کے تحفظ کیلئے پھر ایک عالمی تنظیم کے قیام کی کوششیں شروع ہوئیں۔ چنانچہ برطانیہ، امریکہ، سوویت یونین، جنہوں نے بعد میں فرانس کو بھی اپنے ساتھ شریک کرلیا، ان بڑی ریاستوں نے جنگ کے بعد کی دنیا کو

ایسے جدید طریقے پر تشکیل دینے کے بارے میں غور وخوض کیا جو امن کے استحکام اور جنگوں کی روک تھام کی ضمانت دے۔ اس کے ساتھ انہوں نے مختلف تنظیموں کے درمیان اقتصادی تعاون کی آسانی اور انسانی حقوق کی حفاظت کا بھی اضافہ کیا۔ چنانچہ اسی دن سے اقوام متحدہ ہی امن کا تحفظ کرتی ہے۔ امن کا لفظ اور بین الاقوامی امن ایک عالمی نعرہ بن گیا جسے سب الاپتے رہتے ہیں اور بڑی ریاستوں کی طرف سے امن کی حفاظت کو دیگر ممالک کی آزادی اور استعمار کے طوق سے نکلنے کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے کیلئے ایک دلیل کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس طرح امن کی حفاظت کا یہ تصور بدلتا رہا، حتیٰ کہ موجودہ شکل اختیار کر گیا۔

ایک عالمی تنظیم کے ذریعے امن کی حفاظت کے مسئلے نے تخفیفِ اسلحہ کی ایک داستان ایجاد کی۔ چنانچہ لیگ آف نیشن نے تخفیفِ اسلحہ کے مسئلے کو آگے لے جانے کی کوشش کی اور برطانیہ نے اسے فرانس کو کمزور کرنے کا ایک ذریعہ بنایا جبکہ یورپ میں جرمنی اور فرانس کے درمیان توازن پیدا کرنے کیلئے جرمنی کے مسلح ہونے کی حوصلہ افزائی کی گئی، بہر حال تخفیف اسلحہ کا مسئلہ ناکام ہوا اور دوسری جنگِ عظیم ہوئی۔

اقوامِ متحدہ کا قیام ہوا تو اس نے بھی تخفیفِ اسلحہ کے مسئلہ کیلئے اقدامات کئے، مگر آج تک کوئی بڑی ریاست کسی دوسری ریاست کو اس مسئلے پر ایسا دھوکہ نہ دے سکی جیسا کہ لیگ آف نیشن میں برطانیہ نے فرانس کو دیا تھا۔ چنانچہ اقوام متحدہ بھی اس سلسلے میں بااثر نہ ہو سکی، لوگ اس مسئلے کو محسوس ہی نہیں کرتے، اور اس مسئلے کا بس ایک نام ہی باقی ہے۔

بڑی ریاستوں کے درمیان رسہ کشی نے نام نہاد عالمی کانفرنسوں اور اتحادوں کو جنم دیا۔ کانفرنسوں کی جہاں تک بات ہے تو اس بارے میں سب سے پہلے منعقد کی جانے والی ویانا کانفرنس ہے جو 1815 میں منعقد کی گئی۔ پھر جنگ عظیم اول سے پہلے متعدد کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ ان میں سے ایک برلن کانفرنس ہے جو اسلامی ریاست کے خاتمے اور اس کے علاقوں کی تقسیم کا معاہدہ کرنے کیلئے منعقد کی گئی تھی۔ پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد متعدد کانفرنسوں کا انعقاد کیا گیا۔ ان میں برلن کانفرنس، جنیوا کانفرنس اور پیرس کانفرنس قابلِ ذکر ہیں لیکن امریکہ اور روس (سوویت یونین) کے معاہدے اور ایک عالمی قوت تشکیل دینے کے بعد کوئی

کانفرنس منعقد نہیں کی گئی، سوائے یہ کہ 1969 میں، جب بڑی ریاستوں فرانس، برطانیہ، روس (سوویت یونین) اور امریکہ کے سفیروں نے اقوام متحدہ کی ذمہ داریوں کے تحت مشرق وسطیٰ بحران کے بارے میں نام نہاد بحث کیلئے ایک کانفرنس منعقد کی، لیکن یہ کانفرنس اس لیے نہیں کہلائی گئی کیونکہ یہ اقوام متحدہ کی ذمہ داریوں تک ہی محدود تھی۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد، مشرقی اور مغربی بلاکوں کے درمیان پائے جانے والے مسائل کے حل کیلئے کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا رہا، کیونکہ اقوام متحدہ میں مشرقی بلاک کمزور تھا، اس لئے روس (سوویت یونین) نے مغربی بلاک سے اقدامی بھاگ ڈور ہتھیانے کی کوشش کی اور امریکہ کو اس کے سپر طاقت کے منصب سے ہٹانے کیلئے کام کیا۔ چنانچہ روس مسائل کو اقوام متحدہ سے باہر لانے لگا اور برلن کانفرنس میں برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے درمیان اختلافات کے شگاف کو وسیع کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسی طرح جنیوا کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کرنے میں کامیاب ہوا اور جنیوا کانفرنس میں بھی کامیاب ہوا۔ چنانچہ کانفرنسوں کا اس طرح انعقاد امریکہ کی کمزوری کا باعث ہوا اور روس (سوویت یونین) کیلئے قوت کا سبب ہوا۔ برطانیہ نے بھی اپنے مسائل کے حل کیلئے اپنے اور امریکہ کے درمیان اقوام متحدہ سے ہٹ کر کانفرنسیں منعقد کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ برمودا کانفرنس منعقد کی گئی مگر یہ کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کے بعد مغربی بلاک کے ممالک کے درمیان کوئی کانفرنس منعقد نہیں کی گئی، بس امریکہ اور برطانیہ کے درمیان چند روایتی ملاقاتوں کے انعقاد پر اکتفا کیا گیا۔ امریکہ نے جان لیا کہ اقوام متحدہ کے باہر کانفرنسوں کا انعقاد اس کو کمزور کردے گا جو عالمی سطح پر اس کے منصب کے کمزوری کا باعث بنے گا۔ اس لئے امریکہ اقوام متحدہ سے باہر کانفرنسوں کے انعقاد پر متفق نہیں ہوا، بالخصوص جب کہ امریکہ اور روس (سوویت یونین) کے درمیان 1961ء میں ویانا ملاقات میں معاہدہ، بلکہ گٹھ جوڑ ہو گیا۔

ریاستوں کے درمیان گٹھ جوڑ بہت قدیم ہے۔ دوسری طاقت کے مقابلے میں اپنی طاقت کیلئے ریاستیں گٹھ جوڑ کرتی رہتی ہیں، یا اس لئے کہ ایک دوسرے کو طاقت کے توازن کو سبوتاژ کرنے سے روکا جائے۔ لہٰذا 1818 میں کیا گیا Aix –La–Chapelle معاہدہ، درحقیقت ایک گٹھ جوڑ تھا اور برطانیہ، فرانس اور

آسٹریا و جرمنی کے درمیان جو اتحاد ہوئے وہ قوت کے حصول اور توازن کو برقرار رکھنے کیلئے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم میں فرانس اور برطانیہ کا جرمنی کے خلاف گٹھ جوڑ اور دوسری جنگِ عظیم میں امریکہ، برطانیہ، فرانس اور سوویت یونین کے درمیان جرمنی کے خلاف گٹھ جوڑ ایک بڑی ریاست کے خلاف اتحاد تھا۔ اسی طرح نیٹو معاہدہ، جو دوسری جنگ عظیم کے بعد روس (سوویت یونین) کے خلاف کیا گیا اور وارسا معاہدہ، جو دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی بلاک کے خلاف کیا گیا، یہ سب دوسری قوتوں کے خلاف گٹھ جوڑ تھے۔ چنانچہ عالمی کانفرنسوں جیسے معاہدات، دوسری طاقت کے خلاف قوت حاصل کرنے یا طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کے وسائل میں سے ایک وسیلہ ہوا کرتے تھے۔ یہی وہ اتحاد ہیں جنہیں عالمی کشمکش کے آلہ کار (ذرائع) میں سے سمجھا جاتا ہے۔

بیشتر گٹھ جوڑ، اتحاد اور معاہدات ایسے ہیں جنہیں بڑی ریاستیں چھوٹی ریاستوں کے درمیان یا اپنے اور چھوٹی ریاستوں کے درمیان تشکیل دیتے ہیں۔ اس قسم کے اتحاد براہ راست عالمی کشمکش کے عوامل میں سے شمار نہیں کئے جاتے، البتہ یہ استعماریت کو مضبوط کرنے یا پھر ان اتحادوں کو ایجاد کرنے والی بڑی ریاستوں کو طاقتور بنانے کے وسائل ہیں۔ چنانچہ وہ گٹھ جوڑ جو عراق اور ترکی کے درمیان ہوا تھا اور دوسری جنگ عظیم سے پہلے سعد آباد معاہدہ کے نام سے گٹھ جوڑ، جسے برطانیہ نے ان ممالک کے اندر اپنے اثر ورسوخ کو مستحکم کرنے اور دوسری بڑی عالمی ریاستوں جیسے فرانس اور سوویت یونین کے مقابلے میں اپنا پلہ بھاری کرنے کیلئے منعقد کیا، اور وہ معاہدات جو برطانیہ نے دوسری جنگ عظیم سے پہلے اپنے اور عراق کے درمیان یا اپنے اور مصر کے درمیان منعقد کئے، یہ سب کے سب استعماریت کو مستحکم کرنے کے وسائل تھے نہ کہ جنگ کیلئے۔ وہ گٹھ جوڑ جو برطانیہ نے دوسری عالمی جنگ کے بعد کئے، جیسے بغداد معاہدہ یا جو امریکہ نے کئے، جیسے جنوب مشرقی ایشیائی معاہدہ یا امریکہ کا کویت، پاکستان، مصر، مراکش، ارجنٹائن، جنوبی کوریا، بحرین، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فلپائن، تھائی لینڈ کے ساتھ معاہدہ اور اسی طرح اسرائیل کے ساتھ معاہدہ، امریکہ کا ان سب کو نیٹو سے باہر اسٹریٹیجک اتحادی بنانا استعماریت کے وسائل اور اپنے اثر و نفوذ کو مستحکم کرنے کیلئے تھا، یہ جنگی معاہدات نہیں تھے۔ چنانچہ ان جیسے معاہدات کو عالمی رسہ کشی کے براہِ راست آلات میں سے نہیں سمجھا جاسکتا، بلکہ وہ معاہدات جو بڑی ریاستیں آپس میں کرتی ہیں وہی عالمی رسہ کشی کا آلہ سمجھے جاتے ہیں۔

سوویت یونین اور مشرقی بلاک کے انہدام کے ساتھ نیٹو معاہدے اور الائنس کو ختم ہو جانا چاہئے تھا مگر امریکہ نے اس معاہدے کو باقی رکھا، بلکہ اس کو وسیع کرنے کی کوشش کی اور اس کیلئے عملی جد وجہد کی۔ چنانچہ اس نے مشرقی یورپ کے بہت سے ممالک کو اس میں شامل کیا اور دوسرے ممالک کو شامل کرنے کیلئے بھی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی وجہ درحقیقت معاہدے کے مقاصد میں تبدیلی واقع ہونا ہے کیونکہ اب یہ مشرقی بلاک کے خلاف نہیں تھا بلکہ اب اس معاہدے کا رخ خود مغربی گروہ کے ان ممالک کے خلاف تھا جو اس اتحاد کے ممبر تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ نے جب محسوس کیا کہ یورپی ممالک اس کے پنجے سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس نے اس معاہدہ کو باقی رکھا تاکہ ان کو اپنے زیر نگرانی رکھ سکے، بالخصوص جبکہ نیٹو معاہدہ پر اسی کا غلبہ ہے، تاکہ ان کا امن اور دفاع امریکہ پر منحصر ہو۔

ان دنوں دوسری خلیجی جنگ اور عراق پر قبضہ کرنے میں امریکہ کا ساتھ دینے والے ممالک جو اتحادی ممالک کہلائے گئے، اس اتحاد کا نمونہ ہیں جن کا مقصد خطے میں امریکی اثر ونفوذ اور امریکی انتظامیہ کی انفرادیت کے رجحان کو استحکام دینا ہے۔ اور یہ جدید امریکی استعمار کے وسائل میں سے ایک ہے۔

یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر بالعموم عالمی سیاست کھڑی ہے۔ انہی بنیادوں پر ہر اس ریاست کی پالیسی کی عمارت کھڑی ہے جو عالمی سیاست پر اثرانداز ہوتی ہے۔ ان بنیادوں کی روشنی میں دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے سیاسی اقدامات کو سمجھا جاسکتا ہے اور ان اقدامات کی ایسی تشریح کی جاسکتی ہے جو حقیقت اور واقع کے مطابق ہو یا اس کے قریب ہو۔ چنانچہ وہ سیاسی اقدام جنہیں ایک ریاست بروئے کار لاتی ہے، خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، کو انہی اصولوں کی بنیاد پر یا ان سے نکلنے والے یا اس سے تعلق رکھنے والے اصولوں کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ یعنی کسی عالمی اقدام کی حقیقت، محل وقوع اور اس کے حالات کی سمجھ حاصل کی جائے اور اسے ان اصولوں میں سے کسی ایک کے ساتھ جوڑا جائے تاکہ اس کی نوعیت، محرکات واسباب اور اس کے نتائج کا ادراک حاصل ہو سکے۔

بڑے عالمی مسائل

دنیا میں واقع ہونے والے سیاسی اقدامات بہت ہیں اور یہ متعدد مسائل سے متعلق ہوتے ہیں مگر ان میں سے چھ مسائل اہم ترین ہیں: یورپ کا مسئلہ ،مشرق وسطیٰ کا مسئلہ، وسطی ایشیا کا مسئلہ، برصغیر ہند کا مسئلہ، مشرقِ بعید کا مسئلہ اور افریقہ کا مسئلہ۔

مندرجہ ذیل اسباب کی بناپر بحث کو ان چھ مسائل کے اندر محدود کیا گیا ہے:

پہلا: بڑی ریاستوں کے درمیان جاری کشمکش یا مقابلہ بازی چونکہ ان علاقوں میں ہوتی ہے، اس لئے قدرتی طور پر ان خطوں کے مسائل اہم عالمی مسائل ہیں۔

دوسرا: ان خطوں کی اقوام زبردست بے چینی واضطراب اورآزادی کی جدوجہد کی حالت میں ہیں، اس لئے ان اقوام کے حالات کو کنٹرول میں لاناضروری ہے، خاص طور پر ان میں سے اکثر خطوں میں مسلمان قومیں بستی ہیں جو اسلامی ریاست کے قیام کے لئے اپنے حکمرانوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی شدید خواہش رکھتی ہیں۔

تیسرا: عملی طور پر دنیامیں وقوع پذیر ہونے والے زیادہ تر سیاسی واقعات انہی خطوں میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ نتیجاًیہ دیگر عالمی سیاسی مسائل کے فہم کیلئے ایک بہتر نمونہ ہیں۔

چوتھا: یہ خطے وسائل اور دولت سے مالامال ہیں۔ اس لئے استعماری ممالک اور ذخیرہ اندوز کمپنیاں بھوکے کتوں کی طرح ان پر حملہ آور ہیں، ان پر سخت مقابلہ کرتی ہیں، اور ان پر تسلط اوران کے وسائل اور دولت پر کنٹرول حاصل کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہیں۔

پانچواں: 1823 میں مونرو اعلانیہ کے بعد براعظم امریکہ کے خطے کو اس نوعیت کی کشمکش کے لیے بند کر دیا گیا، اور امریکہ نے یورپ کے بڑے ممالک کو براعظم امریکہ کے اندر مداخلت کرنے اور اس براعظم میں اس کے ناگزیر مفادات کیلئے خطرہ بننے سے روک دیا۔ اس لئے اس براعظم میں عالمی کشمکش معروف معنوں میں موجود نہیں۔ چنانچہ براعظم امریکہ میں امریکہ کے مفادات حقیقی خطرے سے محفوظ ہیں۔ بہر حال گذشتہ صدی کے پچاس کی دہائی کے اواخر اور ساٹھ کی دہائی کے اوائل میں سوویت یونین کے کیوبا کے ساتھ جو تعلقات

بنے، اس پر امریکہ نے خاموشی اختیار کرلی کیونکہ امریکہ آہستہ آہستہ سوویت یونین کواس کے علاقوں اور مشرقی یورپ کے باہر اپنی ذمہ داریوں کی توسیع کی طرف کھینچ لاناچاہتا تھا۔ چنانچہ سوویت یونین کے کندھوں پر اقتصادی اور عسکری بوجھ بڑھ گیا، کیونکہ اب سوویت یونین کوامریکہ کی طرف سے کیوبا کو درپیش خطرات سے حفاظت کی ضرورت تھی۔ چونکہ کیوبا کی حمایت وحفاظت کی وجہ سے سوویت یونین پر بوجھ میں اضافہ ہوناتھا، یہی وجہ تھی کہ کیوبا کے ساتھ سوویت یونین کے تعلقات سے امریکہ نے چشم پوشی اختیار کرلی لیکن جب معاملات بڑھتے بڑھتے ایٹمی اڈوں کے قیام کی سطح تک چلے گئے توامریکہ نے ان اڈوں کو کیوبا سے نکالنے کیلئے بھرپور جدوجہد کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ براعظم امریکہ معروف معنوں میں عالمی کشمکش سے لاتعلق ہے، جبکہ وہاں جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے وہ اندرونی بے چینیاں ہیں۔

اس لئے یہ چھ مسائل ہی اہم عالمی مسائل ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم ان مسائل کے حوالے سے بات کریں، بہتر ہوگا کہ ہم عالمی سیاست پر اثر انداز ہونے والی بڑی ریاستوں کو پہچان لیں۔ کسی بھی مسئلے کی ایک بڑے عالمی مسئلے کی طورپر درجہ بندی، سب سے پہلے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ مؤثر سیاسی اقدامات کا میدان ہو۔ چونکہ بڑی ریاستوں کی طرف سے بروئے کارلائی جانے والے سیاسی اقدامات ہی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، لہٰذا ہر دور کی بڑی ریاستوں کی معرفت بھی ضروری ہے۔

بڑی ریاستیں وہ ہوتی ہیں جو عالمی سیاست پر اثر انداز ہوتی ہیں، یعنی ایسی کاروائیاں کرتی ہیں جو دیگر ریاستوں پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ بڑی ریاست وہ نہیں کہلاتی جس کی آبادی زیادہ ہو یا جو امیر ہو وغیرہ، بلکہ یہاں بڑی ریاست سے مراد وہ ریاست ہے جو عالمی سیاست اور دیگر ممالک پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس بناپر دور حاضر میں یعنی پندرھویں ہجری صدی (1425) مطابق اکیسویں صدی عیسوی (2004) میں سپر طاقت امریکہ ہے، کیونکہ یہ عالمی سیاست پر سب سے زیادہ اثرات رکھتا ہے، بلکہ اکیلا عالمی صورتحال کو کنٹرول کرتا ہے۔ دیگر ریاستیں امریکہ کے ساتھ اس کے منصب یاعالمی صورتحال میں اس کے یک طرفہ رجحان کے خلاف مزاحمت کے درجے تک نہیں پہنچتیں۔ مگر چونکہ روس سوویت یونین کا وارث ہے، جو اپنے انہدام تک بڑی

ریاست سمجھی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں برطانیہ اور فرانس دوسری عالمی جنگ سے قبل بڑی طاقتیں تھیں اور دونوں عالمی سیاست میں موجود رہنے پر مصر ہیں، اور دونوں انفرادی طور پر یا یورپ کی آڑ میں ایسے اقدامات کرتی رہتی ہیں جو عالمی سیاست پر اثر انداز ہوتے ہیں، بلکہ ان کی کاروائیاں امریکہ پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں اگرچہ یہ اثر و رسوخ کمزور ہے اور عالمی سیاست میں امریکہ سے اس کے منصب پر مقابلہ کرنے کے درجے تک نہیں پہنچتا۔ اس تمام کی بنا پر یہ تینوں بڑی ریاستیں کہلائی جاسکتی ہیں، اگر اس اصطلاح کو قدرے نرم طور پر استعمال کیا جائے۔ برطانیہ ایسے اقدامات اٹھاتا رہتا جو عالمی سیاست میں اس کو کچھ نہ کچھ مقام دلاتے ہیں، اسی طرح فرانس اور روس بھی عالمی سیاست میں اپنی موجودگی کو ثابت کرتے رہتے ہیں جیسا کہ عراق کی جنگ کے بحران میں ہوا۔

جہاں تک جرمنی کا تعلق ہے، تو تاریخی حوالے سے اور بحیثیت جرمن قوم جرمنی ایک بڑی ریاست شمار کی جاتی تھی مگر دوسری جنگِ عظیم میں شکست کے بعد کلی طور پر اس کی بڑی ریاست کی حیثیت ختم ہوگئی، جیسا کہ پہلی جنگ عظیم میں اس کی شکست کے بعد ہوا تھا۔ اس لئے جیسا کہ جنگِ عظیم اول کے بعد وہ بہت جلد بڑی ریاست بن گئی، ممکن ہے کہ وہ دوبارہ بڑی ریاست بن جائے، خواہ اس میں کچھ وقت لگے، فرانس کے ساتھ بعض عالمی مسائل میں اس کی سرگرمی اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جہاں تک چین کا معاملہ ہے، تو معروف معنوں میں اس کو عالمی سیاست میں مؤثر کردار کی حامل بڑی ریاست کہنا مشکل ہے کہ جس کا پوری دنیا یا اس کے کئی خطوں پر اثر ہو، باوجود یکہ اس کی آبادی 1.2 ارب ہے، اس کے باوجود کہ روس اس کو اچھی خاصی اہمیت دیتا ہے اور اس کے باوجود کہ امریکہ عالمی سیاست میں اس کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ تاہم دو اسباب کی بنا پر اس کو بڑی ریاست شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک تو اس لئے کہ یہ کبھی بڑی ریاست رہی اور نہ ہی گزشتہ زمانے میں کہیں اس نے عالمی سیاست میں کردار ادا کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ کیمونسٹ ریاست بن جانے کے بعد سے لیکر آج تک اس نے کیمونزم (اشتراکی نظریے) کو فروغ دینے اور دنیا کے مختلف علاقوں پر اثر انداز ہونے کی فکر نہیں کی، بلکہ اس کی ساری توجہ علاقائی سطح پر مرکوز رہی، خاص طور پر جب چین کو افریقہ اور ایشیا کے بعض ممالک میں سیاسی کوششوں میں ناکامی ہوئی، ان سرگرمیوں کا نہ کچھ اثر ہوا، نہ وہ ان کو جاری رکھ سکا اور اپنے اصل دائرے میں واپس آگیا۔

جہاں تک انڈیا کا معاملہ ہے تو اس کی آبادی 93.5 کروڑ سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس کے پاس ایٹمی اسلحہ ہے مگر عالمی سیاست میں اس کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے، اس لئے اس کا بڑی ریاست بن جانے کا خیال دل میں لانا درست نہیں کیونکہ عالمی سیاست میں اس کا کردار بعید از امکان ہے۔ جاپان کا معاملہ یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے جب وہ محور (axis) گروپ کا حصہ تھا تو عالمی سیاست میں اس کا کردار تھا مگر یہ اٹلی کی طرح وقتی تھا، اس لئے ان دونوں کو بڑی ریاستوں میں سے شمار نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک امت مسلمہ کا تعلق ہے تو یہ صلیبی جنگوں تک بڑی ریاست رہی، اور صلیبی جنگوں میں کامیابی کے بعد ایک بار پھر بڑی ریاست بن گئی اور انیسویں صدی عیسوی تک عالمی سیاست پر اثر انداز ہوتی رہی، پھر اس کا عالمی اثر و رسوخ کمزور ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس امت کی ریاست کو پہلی جنگ عظیم کے بعد بیسویں صدی عیسوی میں ختم کر دیا گیا۔

البتہ بڑی ریاست کے اجزائے ترکیبی اس امت کے اندر موجود ہیں۔ اس کی بہار کی نشانیاں گذشتہ صدی کے اواخر سے شروع ہو چکی ہیں۔ اب اس کی صبح طلوع ہونے کو ہے اور یہ دوبارہ بڑی ریاست ہو گی بلکہ اللہ کے اِذن سے سپر طاقت ہو گی۔

اس لئے ان قوموں اور ریاستوں سے واقفیت ضروری ہے کیونکہ یہ دنیا کے بڑے مسائل میں کردار ادا کرتے ہیں۔

پہلا: پہلی چار بڑی ریاستیں: امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس ۔

دوسرا: ریاستوں کی وہ قومیں جو کسی وقت بڑی ریاستیں تھیں اور وہ دوبارہ بڑی ریاستیں بننے کیلئے تیار ہیں: یہ امتِ مسلمہ اور جرمنی ہیں۔

تیسرا: ان اقوام اور ممالک کے ساتھ جاپانی قوم کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے، کیونکہ جاپان ایک اقتصادی طاقت ہے جو اہم عالمی مسائل میں بڑا اقتصادی کردار ادا کرتا ہے۔ اگرچہ معروف معنوں میں جاپان بڑی ریاست نہیں ہے۔

جہاں تک چین کا معاملہ ہے، وہ صرف اپنے علاقائی دائرے میں بڑی ریاست ہے، یعنی اس کو علاقائی بڑی ریاست کہا جاسکتا ہے۔ اس لئے اپنے علاقائی دائرے کے علاوہ وہ دنیا کے مختلف خطوں میں عالمی مسائل میں کمزور کردار کا حامل ہے۔ پس یہاں عالمی کردار کی حامل ریاستوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو میں ہم اس کو زیر بحث نہیں لائیں گے، ہاں چین کے علاقائی دائرے کے مسائل پر گفتگو میں اس پر بات کریں گے۔

آیئے ہم ان اقوام اور ریاستوں پر بات کرتے ہیں، جو کہ مندرجہ ذیل ہے۔

1۔ امت مسلمہ: یہ امت اس وقت وجود میں آئی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد ﷺ کو اسلام کے ساتھ بھیجا، تاکہ لوگوں کو جاہلیت کی تاریکیوں سے نکال کر اسلام کے نور کی طرف لائے۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت کی تو اس امت کی ریاست، اسلامی ریاست وجود میں آئی۔

اسلامی ریاست رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد خلفائے راشدینؓ اور ان کے بعد کے خلفاء کے دور تک برقرار رہی۔ یہ ریاست مسلسل فتوحات میں لگی رہی، دنیا بھر میں خیر پھیلاتی رہی، تاآنکہ گذشتہ صدی کے اوائل میں اس کا خاتمہ کیا گیا اور اللہ کے اذن سے اس کی آمد بہت جلد متوقع ہے۔

ابتدا میں عرب اس کو لیکر اُٹھے، پھر اسلام سارے عالم میں پھیل گیا۔ چنانچہ عرب اور غیر عرب اقوام میں سے مختلف رنگ و نسل کے لوگوں نے اسلام کو گلے لگایا۔ یہ سب کے سب اسلام کے سانچے میں ڈھل گئے، عربی اور عجمی کے درمیان کوئی فرق نہ رہا، سوائے تقویٰ کے۔

چونکہ عرب ہی تھے جو سب سے پہلے اسلام کا پیغام لے کر اُٹھے، اس لئے عرب قوم کا بالخصوص اور امت مسلمہ کا بالعموم تعارف ضروری ہے۔

جہاں تک عرب قوم کا معاملہ ہے، اس قوم کا ذریعہ معاش جنگ تھا۔ یہ جنگوں سے محبت کرتی تھی، اس وجہ سے عربوں میں عسکری مزاج اور دوسروں کی ذمہ داری اُٹھانے کا عنصر پایا جاتا تھا۔ اس لئے یہ اللہ کے نازل کردہ طریقے کے مطابق اسلام کے پیغام کو لے کر اُٹھنے کی قابل تھی، یعنی جہاد اور دعوت کے ذریعے، جو خیر کو پھیلانے کیلئے مادی جنگ کہلاتی ہے، نہ کہ لوگوں کو غلام بنانے کے لئے، چنانچہ یہ لوگوں کو پہلے دلآویز

اور مسحور کن انداز میں اسلام کی تبلیغ کرتے، اگر وہ اس سے متفق نہ ہوتے تو پھر ان کے ساتھ جنگ کرتے اور یہ صرف اس اسلامی فکر کی نشرواشاعت کیلئے ہوتا تھا جس کے وہ علمبردار تھے، اس لئے نہیں کہ ان اقوام کو اپنی کالونیاں بنائیں اور ان کو غلام بنائیں۔ ان کے ہاں یہ فکر تھی کہ وہ شمع کی طرح جل کر دوسروں کو روشنی دیں اور اس کے نمایاں اوصاف میں سے دیگر لوگوں کی ذمہ داری اُٹھانا اور ان کو اپنے مساوی سمجھنا تھا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد امت مسلمہ پوری کی پوری ایک قوم ہوگئی اور ان کے اندر جہادی عسکری مزاج پیدا ہوا کیونکہ جہاد ان کے دین کی چوٹی ہے۔ ان کے اندر لوگوں میں ہدایت پھیلانے کی فکر پیدا ہوئی اور انکے اندر انسانی ہمدردی جڑ پکڑ گئی۔ اس لئے باوجود اس کے کہ امت انحطاط کا شکار ہوگئی اور وقت نے ان کو اپنے ان اسلاف سے کتنا ہی دور کیا جنہوں نے اسلام کو قبول کیا تھا اور اس کے طریقہ دعوت وجہاد کے ساتھ اسلام کو لے کر اُٹھے تھے، مجموعی طور پر امتِ مسلمہ کے اندر جہادی عسکری مزاج اور دوسروں کا بوجھ اُٹھانے اور لوگوں کے اندر خیر پھیلانے کا عنصر اب بھی ان عربوں کی طرح پایا جاتا ہے جو سب سے پہلے اسلام کے پیغام کو اُٹھانے والے تھے۔ کیونکہ اسلام کو قبول کرنے والی تمام اقوام خواہ کسی بھی نسل سے ہوں، اسلام کے سانچے میں ڈھل گئیں۔

2۔ جرمن قوم: جہاں تک جرمن قوم کا تعلق ہے تو اصلیت اور وجود کے لحاظ سے اس کی جڑیں گہری ہیں۔ پیشہ ور، انتہائی خوددار، مضبوط اور بہادر ہیں، لیکن انہیں اپنے آپ پر ضرورت سے زیادہ فخر ہے۔ دوسروں پر حکومت کرنے کا حقدار ہونے کے دعویٰ میں شدید ہیں، عسکریت پسندی اور لڑائیوں سے محبت ان کی طبیعتِ ثانیہ ہے، گویا جنگ ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ جرمن قوم کی عسکریت پسندی نے ہی ان کے پڑوسیوں کے اندر ان سے خوف ودہشت پیدا کی، بالخصوص بڑی ریاستیں، جیسے برطانیہ، فرانس اور روس۔ جرمن قوم نے اندرونی لڑائیوں اور جھگڑوں میں سالہاسال گزارے ہیں اور کئی نسلوں تک اپنے پڑوسیوں، مثلاً فرانس کے ساتھ جنگوں میں اُلجھی رہی، اس کا گزارہ صنعت، بالخصوص جدید جنگی صنعت پر تھا۔ اس لئے اگرچہ اس پر ایٹمی اسلحہ بنانے کی پابندی ہے، وہ اپنے پڑوسیوں کو ڈراتی رہتی ہے اور اپنے مقابل اور دشمن اقوام پر رعب ودہشت ڈالتی رہتی ہے۔ اس لئے مخالف طاقتیں اکثر اس کے خلاف سازشیں کرتی رہتی ہیں تاکہ وہ بڑی ریاستوں کی

صف میں کھڑی نہ ہوسکے۔ اس کے باوجود یہ ایک زندہ قوم ہے، جس کے اندر دوبارہ بڑی ریاست بننے کی صلاحیت موجود ہے، کیونکہ اس کا زندہ پن اکثر اس کی رکاوٹوں پر غالب آجاتا ہے اور جب اس نے دوسری مغربی اقوام کی طرح سرمایہ دارانہ نظام کو اپنالیا تو مفاد اس کا جزوزندگی بن گیا۔ چنانچہ جرمنی جو کہ جرمن قوم کا ملک ہے، ایک استعماری ریاست سمجھی جاتی ہے۔ پہلی جنگِ عظیم سے قبل اس کی کالونیاں موجود تھیں، دوسری جنگِ عظیم میں شمولیت کے وقت اس کی نیت تھی کہ اپنی کالونیوں کو واپس لے لے اور دوسری ریاستوں کی کالونیوں کو بھی چھین لے اور ان کو اپنی نئی کالونیوں کی شکل دیدے۔ اس بنا پر جرمنی کی پالیسی استعماریت ہے۔ یہ صرف ہٹلر کی پالیسی نہیں تھی، جیسا کہ سمجھا جاتا ہے۔ جرمنی آج استعماریت سے زیادہ دور نہیں، سو اس کو اگرچہ وسیع اور بلاواسطہ استعماریت سے محروم رکھا گیا، مگر یہ اقتصادی استعماریت میں تمام ریاستوں کا ہراول دستہ ہے۔ آج اس امر کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے منفرد معاشی غلبے کے ذریعے کس طرح اقتصادی وسعت اختیار کی، بالخصوص مشرقی یورپ کے علاقوں میں۔

جہاں تک اس کے نظام حکومت کا تعلق ہے، باوجود اس کے کہ وہ جمہوریت کی دعویدار ہے، اس پر مطلق العنانیت (autocracy) کی چھاپ واضح طور پر نظر آتی ہے۔ یہ پہلو جرمنی کے ماضی وحال کے تمام حکمرانوں کے اقدامات میں نظر آتا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد جرمنی پر اگرچہ کڑی شرائط لاگو کی گئیں مگر اس نے ان تمام حالات کا جوانمردی سے مقابلہ کیا اور اس قابل ہوا کہ وہ دوبارہ بڑی ریاست بنے۔ اس میں دو عوامل اس کے کام آئے: ایک فکری احساس جو اس کے سپوتوں میں ظاہر ہوا، چنانچہ اس احساس نے ان کو جرمنی کو دوبارہ بڑی ریاست بنانے پر اُبھارا۔ دوسرا عامل یہ کہ برطانیہ جرمنی اور فرانس کے درمیان عالمی توازن کو بگاڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ برطانیہ نے خفیہ طور پر جرمنی کو فرانس کی مزاحمت اور ہمسری حاصل کرنے پر اُبھارا۔ اس امر نے جرمنی کو دوبارہ بڑی ریاست بننے کی قابل بنایا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جرمنی کو کوئی ایسا عامل میسر نہ آیا جو اسے دوبارہ بڑی ریاست بننے میں مدد دے سکے۔ کیونکہ تمام اتحادیوں نے بلا استثناء وہ تمام پابندیاں لگائیں جو جرمنی کے دوبارہ بڑی ریاست بننے کے راستے میں رکاوٹ بن سکتی ہوں اور ان میں سب سے اہم عوامل، جو اس کے

بڑی ریاست بننے میں آج تک رکاوٹ بنے رہے ہیں، یہ ہے کہ اس کے باشندوں نے جنگی صنعت کو چھوڑ کر اقتصادی کاموں میں مشغولیت اختیار کرلی، جس نے اسے عالمی سیاست میں مؤثر کردار ادا کرنے سے روکا۔ اقتصادی پہلو پر توجہ مرکوز کرنے سے جرمن لوگوں کے احساسات اور دلچسپی حربی صنعت سے ہٹ گئی جو ممالک کو بڑی اور مؤثر ریاست بناتی ہے اور عملی سیاسی میدان میں قوت حاصل کرنے کے قابل بناتی ہے۔ دوسرا عامل، روس (سوویت یونین) کا جرمنی سے خطرے کے پیش نظر چوکس رہنا تھا، کہ ایک لمحہ کیلئے بھی اس کے سر سے جرمنی کا خطرہ نہیں ٹلتا تھا اور روس نے جرمنی کے خلاف سخت اور بے رحمانہ پالیسی اختیار کی جو ہر قسم کی اقدار وروایات سے خالی تھی۔ جرمنی کے متعلق پالیسی پر جو چیز حاوی تھی وہ یہ تصور ہے کہ جرمنی کو ہمیشہ کچلا جائے۔ اس لئے روس جرمنی کی ہر چال کو کچل دیتا تھا۔ اس لئے جب 1955 کے بعد امریکہ نے جرمن عسکریت پسندی کو زندہ کرنا چاہا تو اسے ناکامی ہوئی اور برطانیہ بھی جرمنی کو متحد کرنے میں ناکام ہوا۔ اسی طرح فرانس بھی ناکام ہوا جب ڈیگال نے یورپ کی وحدت کی کوشش کی تاکہ اس وحدت کے ذریعے جرمنی کو دوبارہ مسلح کرنے اور اپنی وحدت دوبارہ حاصل کرنے میں تعاون فراہم کرسکے۔ یہ تمام کوششیں اس لئے ناکام ہوئی کہ روس اس کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑا تھا۔

جہاں تک (مشرقی اور مغربی) جرمنی کی وحدت کا معاملہ ہے جو بعد میں وقوع پزیر ہوئی، تو یہ جرمن سیاستدانوں کی پالیسیوں، کاروائیوں اور سیاسی منصوبوں کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ ان رعایتوں کا نتیجہ ہے جو سوویت یونین نے سقوط کے دوران امریکہ کو دیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ نے یہ ٹھان لیا تھا کہ جرمنی کی وحدت کو استعمال کرتے ہوئے یورپ کے اتحاد وہم آہنگی پر حملہ کیا جائے اور وہ اس طرح کہ جرمن اتحاد کیلئے جو یورپی یونین کو سرمایہ فراہم کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے، مسائل پیدا کرکے یورپ کے اتحاد میں رکاوٹ پیدا کرے یا مغربی جرمنی کے ساتھ معاشی لحاظ سے کمزور مشرقی جرمنی کا الحاق کرکے اس کو پسماندگی کا شکار کیا جائے۔ مگر جرمنی اس بحران سے نمٹ گیا اور امریکی پابندیوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے یورپ کی طرف توجہ دینے لگا، بالخصوص فرانس کی طرف، تاکہ مختلف واقعات میں شمولیت اختیار کی جائے اور ان پر اثر انداز ہوسکے۔ جرمنی کا مشترکہ یورپی منڈی EEC میں، جو بعد میں یورپی یونین میں تبدیل ہوئی، مؤثر کردار رہا ہے۔

تاہم جرمنی مسلسل اقتصادی ذرائع سے اس کیلئے کوشاں رہا، جس کا مطلب ہے کہ اقتصادی مدد کی فراہمی کے ذریعے جرمنی کا یورپی ریاستوں بالخصوص مشرقی یورپ میں اثرورسوخ برقرار رہے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس طرح جرمنی عالمی سیاست میں کردار ادا کرسکے گا، کیونکہ عالمی سیاست میں کردار کا دارومدار بنیادی طور پر فوجی طاقت اور ایسی سیاسی کاروائیوں پر ہوتا ہے جن کے ذریعے سیاسی منصوبوں کے حصول اور نفاذ کو ممکن بنایا جاسکے۔ جرمنی نے ابھی یہ کرنا ہے، اگرچہ اس نے فرانس کے ساتھ مل کر اس سمت میں کوشش کی ہے، مگر یہ ایسی کوششیں ہیں جنہیں عمل کے بجائے ردعمل کہنا بجا ہے تاکہ مؤثر انداز میں امریکہ کا سامنا کیا جائے جیسا کہ عراق پر امریکی حملے کے واقعات میں ہوا۔ اسی طرح جرمنی کی فرانس کے ساتھ مل کر نیٹو سے الگ مشترکہ یورپی دفاعی قوت تشکیل دینے کی کوششیں اور برطانیہ کی اس میں شرکت نے امریکہ کی پریشانی میں اضافہ کیا، اگرچہ یہ ابھی ارتقائی مراحل میں ہے۔

یہ تمام اس بات کی دلیل ہے کہ جرمنی عالمی سیاست میں کردار ادا کرنے کیلئے تگ ودو کرنے لگا ہے۔ اس بناپر جرمنی کا دوبارہ بڑی ریاست بننا متوقع ہے، اگرچہ اس میں طویل عرصہ گذر جائے، کیونکہ اگرچہ مصنوعی قوتیں زندہ قوموں کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بننے میں کامیابی حاصل کرلیں، لیکن یہ کامیابی عارضی ہوتی ہے۔ بالآخر زندہ قوم کی ترقی اُن تمام مسائل پر غالب آجاتی ہے جو اس کے پھلنے پھولنے کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

جرمنی کی موجودہ پالیسی کو اجمالی طور پر یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

جرمنی کی پالیسی یورپی نتائج پرستی pragmatism کے اصولوں پر مبنی ہے۔ جرمنی ایک طرف فرانس کے ساتھ جرمن- فرانس محور(German French axis) کی تشکیل میں تعاون کررہا ہے جو مستقبل میں یورپی پالیسی کیلئے سنگ بنیاد تصور کیا جاتا ہے جبکہ وہ دوسری جانب یورپ میں امریکی مفادات کا بھی لحاظ رکھتا ہے اوراس بات کا پاس کرتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ جرمنی کو سٹریٹیجک تحفظ فراہم کرتا رہا ہے۔ جرمنی امریکی مفادات کیلئے خطرہ نہیں بنتا بلکہ ان کو ہمیشہ اپنی اولین ترجیحات میں رکھتا ہے، جبکہ

تیسری جانب جرمن پالیسی اقتصادی خصوصیت پر دھیان دیتی ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ وہ مشرقی یورپی ممالک کی معیشت پر اجارہ داری حاصل کرے اور دیگر یورپی اتحادیوں کو شریک کئے بغیر ان کی معیشت کو استعمال کرے۔

حال ہی میں یہ بات مشاہدے میں آئی کہ جرمن پالیسی عسکری پہلوؤں اور عالمی سیاسی پہلوؤں میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ اس کی مثالیں افغانستان، عراق، بوسنیا اور کوسووا میں نیٹو کی سرگرمیوں میں جرمنی کا بڑھ چڑھ کر شرکت کرنا ہے اور اس کے وزیر خارجہ کی اپنے فرانسیسی اور برطانوی ہم منصب کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں شرکت، جیسا کہ تین رکنی وزرا کا ایران کے دورے کے دوران ایران پر دباؤ ڈالنا کہ وہ ایٹمی تنصیبات کے بغیر پیشگی اطلاع کے معائنے کے اضافی پروٹوکول پر دستخط کو قبول کرے۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ جرمنی نے حزب اللہ اور یہودیوں کے درمیان قیدیوں کے تبادلے کے مسئلے پر کامیاب ثالثی میں سرگرم کردار ادا کیا ہے۔

اس طرح ہم جرمن پالیسی کے اندر ترقی دیکھتے ہیں کہ وہ سابقہ گوشہ نشینی کی صورتِ حال سے نکل رہا ہے جس نے جرمنی کو فقط اپنے معاشی پہلو پر توجہ مرکوز رکھنے پر مائل کیا تھا اور اب ایک سیاسی مبصر یہ دیکھتا ہے کہ جرمنی کے بڑھتے ہوئے سیاسی کردار کا آغاز ایسے انداز میں ہو چکا ہے جو کہ فرانس اور برطانیہ کے ہم پلہ ہے۔

جرمنی اگر دوبارہ جلد از جلد بڑی ریاست بننا چاہتا ہے تو اس کو جنگی صنعت کی طرف فوری توجہ دینا ہوگی اور اس کو اپنا ناگزیر مسئلہ سمجھنا ہوگا۔ اسی طرح فرانس اور برطانیہ کے ساتھ ملاقاتوں میں سیاسی شعور بروئے کار لانا ہوگا کیونکہ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ فرانس اور برطانیہ یورپی یونین کو اپنے عالمی اثر ورسوخ کی تقویت کیلئے استعمال کرتے ہیں اور یہ کہ فرانس، یورپ میں فوقیت حاصل کرنے کیلئے جرمنی کے ذریعے طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے اور برطانیہ فرانس اور جرمنی کے ساتھ ملاقاتوں میں اپنا سیاسی مکر وفریب استعمال کر کے اپنے سیاسی مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا جرمنی اگرچہ فرانس کے ساتھ بالخصوص اور یونین

کی باقی ریاستوں کے ساتھ بالعموم مسلسل ہم آہنگی کی پالیسی اپنائے ہوئے ہے۔ اس کو اس یونین کے اندر ایک سیاسی وزن رکھنے والی جرمن عسکری قوت کے طور پر اپنے آپ کو منوانا ہو گا جسے دوسرے اپنے مفادات کے لیے استعمال نہ کریں۔ اسے چاہئے کہ وہ جرمنی کے نقطۂ نظر سے عالمی صورتحال کو دیکھے، نہ کہ یورپ کے نقطۂ نظر سے، اور یہ کہ وہ یورپ کی تاریخ سے سبق حاصل کرے۔

3۔ جاپانی قوم: جہاں تک جاپانی قوم کا تعلق ہے، تو اس کی نشوونما تجارت اور جہاز رانی میں ہوئی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے علاقوں میں رہائش پذیر رہی ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیات میں سے بہادری اور اپنے کاموں کو احسن طریقے سے سرانجام دینا ہے، اس لئے صنعتی انقلاب کے اُبھرتے ہی اس نے صنعت کی طرف فوراً سبقت کی، چنانچہ یہ ملک اپنے حجم کی کمی کے باوجود بڑی ریاستوں میں سے شمار ہونے لگا اور چین سے اپنا حصہ چھیننے کیلئے جنگ کرنے سے نہ ہچکچایا اور چونکہ وہ امریکہ کو اپنے لئے خطرہ سمجھتا تھا اس لئے اس نے امریکہ کے اوپر حملہ کرنے میں بھی تردد نہیں کیا۔ اسلئے جاپان کو کنٹرول کرنے کے لیے امریکہ کا اہم منصوبہ یہ تھا کہ جاپان کی صنعت جنگی بنیادی پر مبنی نہ ہو، بلکہ تجارتی اور اقتصادی ترقی کی بنیاد پر استوار ہو تاکہ جاپان کے لئے عالمی میدان میں آگے بڑھنے کے راستے میں رکاوٹیں ڈالی جائیں۔ جاپان اس وقت ایک معاشی طاقت ہے جو خاصا وزن رکھتی ہے۔

4۔ امریکی قوم: جہاں تک امریکیوں کا معاملہ ہے، یہ ایک امیر قوم ہے، جو کثیر الوسائل ملک میں رہتی ہے۔ یہ یورپ کی اُن ریاستوں کے ساتھ جو اس قوم کو کالونی بنائے ہوئے تھیں، بالخصوص برطانیہ کے ساتھ، ایک تلخ کشمکش میں داخل ہوئی۔ اس نے اسلحے کے زور پر سمجھ بوجھ اور ویژن کو سامنے رکھتے ہوئے آزادی جیت لی۔ اس امر نے امریکیوں کے اندر کچھ ایسی عادات پیدا کیں جن میں نمایاں pragmatism ہے، یعنی واقعیت پرستی کا تصور۔ یورپی استعمار کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بعد ان کے اندر اعلیٰ اقدار کی طرف میلان اور ان کا احترام پیدا ہوا۔

لیکن امریکی قوم نے بھی دیگر عیسائی اقوام کی طرح سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کو گلے لگالیا۔ چنانچہ ان کے ہاں دو عوامل کی باہم کشمکش شروع ہوئی۔ ایک کفایت شعاری اور ایمانداری، دوسرا مفاد پرستی اور استعماریت۔ برطانیہ نے اس کے پہلے عامل (کفایت شعاری اور ایمانداری) کا فائدہ اُٹھایااور اس کو جنگوں اور معاشی مسائل میں پشت پناہی کیلئے استعمال کیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس عامل کا ان پر غلبہ تھا۔ لیکن جوں ہی دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور امریکی قوم نے خلیج کے تیل کو لوٹ کر استعماریت کا مزہ چکھ لیا، تو اس پر دوسرا عامل غالب آ گیا، یعنی مفاد پرستی اور استعماریت کا عامل۔ سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی نے امریکہ کو متحرک کیا اور وہ اپنی گوشہ نشینی چھوڑ کر استعماریت اور اپنے تسلط اور اثر ونفوذ کی خاطر دنیا کو تابع بنانے کے راستے پر چل پڑا، اور اب اس کو دوبارہ گوشہ نشینی کی جانب لانا صرف طاقت کے بل بوتے پر ہی ممکن ہے کیونکہ اب سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی ہی اس کی زندگی کا راستہ متعین کرتی ہے اور صرف مفاد کا حصول ہی اس کے تمام رویوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اس کی زندگی تکبر اور غرور سے بھری ہوئی ہے۔

امریکا یورپی ریاستوں، بالخصوص برطانیہ کی کالونی ہوا کرتی تھی۔ امریکہ متعدد ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلے انگریز استعمار کے دباؤ کو کم کرنے کی کوشش کی اور پھر امریکہ نے آزادی کیلئے اس کے ساتھ ایک مضبوط جنگ شروع کی جو آخر کار انگریز کو امریکہ سے نکالنے پر منتج ہوئی۔ پھر یہ (امریکی) ریاستیں آپس میں ایک یونین قائم کرنے اور ایک وفاقی ریاست تشکیل دینے پر متفق ہوئیں۔ پھر دیگر ریاستوں کو آزادانہ طور پر یا فوجی طاقت کے ذریعے اپنے ساتھ ملانے لگی اور ان کو اس ریاست کا صوبہ بنالیا، حتیٰ کہ 51 صوبوں پر مشتمل موجودہ طرز کی ریاست وجود میں آگئی، ایک ایسی طاقتور ریاست جو عالمی میدان میں قوت کے ساتھ داخل ہوئی اور اب وہ اس قابل تھی کہ امریکہ کے دونوں براعظموں کو یورپی ریاستوں کے تسلط اور دست برد سے تحفظ فراہم کر سکے، یوں ایک دوسری دنیا وجود میں آگئی جسے لوگ نئی دنیا (نیو ورلڈ) کے نام سے جانتے ہیں۔ اس ریاست کو کثیر الوسائل ملک میں رہنے والی ایک متحرک قوم نے قائم کیا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ان کیلئے ایک نظام حکومت تشکیل دیا جو جمہوری نظام ہونے کے باوجود گہری تفکیر کے ساتھ بنایا گیا، اس حقیقت کے ادراک کے ساتھ کہ حکومت کی عملی شکل کیا ہونی چاہیے۔ اس بات کا بھی ادراک کیا گیا کہ یہ

انسانوں کی حکومت ہو گی جو ان میں سے ہی کچھ افراد چلائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایک مثالی حکومت کو صرف منطقی نقطہ نظر سے نہیں دیکھا، بلکہ اس کی عملی اور واقعاتی شکل کو سمجھا۔ اس بات کو ان کے جمہوریہ کے صدر کے انتخاب کے طریقہ کار، اس کو سپرد کئے گئے وسیع اختیارات، ریاست میں اس کے کردار، ریاست کے باقی اداروں کے محدود اختیارات، نیز حکومت کے اندر موجود مضبوط اتحاد واتفاق میں بخوبی دیکھااور پرکھا جاسکتاہے۔ اس کے باوجود کہ یہ ایک فیڈرل نظام ہے، صدر کے انتخاب اور ریاستی اداروں کی تشکیل میں قوم کو وسیع اختیار دیا گیا ہے۔ چنانچہ مذکورہ عوامل کا ریاست کی مضبوطی اور تیز ترین ترقی پر بڑا اثر پڑا۔ امریکہ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد گوشہ نشینی چھوڑ دی اور دنیا کے معاملات چلانے میں شرکت کی بلکہ وہ انہیں اپنے ہاتھ میں لینے لگا۔ پھر 1961 سے 1979 تک اس کا دشمن روس اس کے ساتھ دنیا کے معاملات چلانے میں شریک ہوا۔ علاوہ ازیں اس نے دوسری بڑی حکومتوں کے عزائم کا راستہ بھی روک لیا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ وہ ہم آہنگی کی پالیسی اور روس (سوویت یونین) کے ساتھ شرکت کے ذریعے اپنے مقاصد تو پورے کر پایا ہے لیکن اس شرکت سے بعض منفی پہلوؤں نے بھی جنم لیا ہے، چنانچہ یورپی ممالک اس سے جان چھڑا رہے ہیں اور روس (سوویت یونین) کے ساتھ تعلقات بنا رہے ہیں اور جب دیکھا کہ سوویت یونین عالمی سیاست کے ہجوم میں گھسنے کیلئے اب جرأتمندانہ، گو ناکام، کوششیں بروئے کار لا رہا ہے تاکہ اس کے ذریعے اپنے آپ کو امریکہ سے آزاد ایک عالمی طاقت کے طور پر مسلط کر سکے، یہ دیکھ کر امریکہ نے روس (سوویت یونین) کے ساتھ معاملات بگاڑنے اور جدید اسلحہ کی دوڑ میں کودنے کا دوبارہ فیصلہ کیا جو نئی سرد جنگ کا باعث بنا۔ امریکہ نے روس (سوویت یونین) اور مشرقی بلاک کے ساتھ ثقافتی، فکری اور اقتصادی جنگ شروع کی اور اس کو معاہدات کی ہتھکڑیوں میں جکڑ دیا، جو بالآخر سوویت یونین کے سقوط اور امریکہ کے واحد سپر طاقت رہنے اور عالمی سیاست میں زیادہ مؤثر قوت بن جانے کا باعث بنا۔

امریکہ میں دو مرکزی پارٹیاں ہیں۔ ڈیموکریٹک پارٹی اور ری پبلکن پارٹی۔ ان دونوں پارٹیوں کے منشور (پروگراموں) بلکہ ان کے اختیار کردہ پالیسیوں کے درمیان فرق بہت کم ہے۔ یہ دونوں پارٹیاں گویا ایک ہی منہج (راستے) پر چلتی ہیں اور ایک سے دوسرے کو حکومت کی منتقلی سے کوئی تبدیلی نہیں آتی، خواہ داخلہ

پالیسی ہو یا خارجہ پالیسی۔ جو تبدیلی آتی ہے وہ حالات کے تقاضے کے پیش نظر ہوتی ہے، نہ کہ ان کے پروگراموں کی وجہ سے۔

ڈیموکریٹک پارٹی کی جڑیں گہری ہیں اور یہ عوامی پارٹی ہے جسے عوام کی بھاری اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔ اس لئے کانگریس کی اکثریت اس کی طرفدار ہوتی ہے۔ جہاں تک ری پبلکن پارٹی کا تعلق ہے، یہ ڈیموکریٹک پارٹی کے بہت بعد وجود میں آئی ہے۔ یہ امیر اور ایسے لوگوں کی پارٹی ہے جو انتہائی دولت مند ہیں۔ اس کے اکثر ارکان صاحبِ ثروت اور ذخیرہ اندوز کمپنیوں کے مالکان ہیں۔ نیز اس پارٹی کے اندر ایک بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے۔ یہ پارٹی اکثریت کو زیادہ توجہ دیتی ہے نہ عوامی حمایت کو۔ یہ صرف صدارتی انتخابی نظام ہی ہے جو اس کا معاون ہے ورنہ یہ پارٹی اس قابل نہ تھی کہ اسے صدارت ملتی، کیونکہ یہ اقلیت کی نمائندہ پارٹی ہے نہ کہ اکثریت کی۔

امریکہ کی حالت بھی دیگر سرمایہ دار ممالک جیسی ہے جس پر ذخیرہ اندوز کمپنیوں اور تاجر لوگوں کا تسلط ہے۔ اس کی سیاست پر یہی لوگ اثر انداز ہوتے ہیں۔ البتہ چونکہ ہر فرد شہری حقوق سے بھرپور طریقے سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور حکومت پر اثر انداز ہو سکتا ہے، خواہ انتخابات کے راستے سے ہو یا احتساب کے راستے سے، اس لئے دوسرے سرمایہ دار ممالک کی بنسبت اس کی حکومت میں یہ چیز زیادہ دکھائی دیتی ہے کہ یہ عوام کی حکومت ہے۔ اس کے دولت کے بے بہا خزانوں، تعلیم یافتہ افراد، دانشوروں، مفکرین، آزادی کے ماحول اور اس پر چھائی ہوئی سرگرمیوں کی فضاؤں کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قوت ایک حقیقی قوت ہے، نہ کہ ظاہری اور یہ کہ اگرچہ یہ کوئی قدیم قوم نہیں بلکہ یہ ان افراد اور گروہوں سے بنی ہے جو دنیا کے مختلف کونوں سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں، مگر شہریت اور ہم وطنی نے ان کو بجا طور پر ایک مضبوط رشتے میں اکٹھا کیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک اجنبی اگر چند سال ہی گزارے اور وہاں کی قومیت حاصل کر کے اسے شہریت کے حقوق مل جائیں تو اسے ریاست، عوام اور ان کے مفادات اپنے اصل وطن سے زیادہ عزیز ہو جاتے ہیں۔ یہ اس قوت کا نتیجہ ہے جو ریاست افراد اور ان کے درمیان تعلقات کی مضبوطی سے حاصل کرتی ہے۔

جہاں تک اس کی خارجہ پالیسی کا تعلق ہے تو یہ مالداروں اور ذخیرہ اندوز کمپنیوں (monopolies) کے مالکان کے ہاتھوں میں ہے، یعنی یہ خالص استعماری پالیسی ہے جہاں اعلیٰ اقدار کی گنجائش نہیں۔ باوجود یکہ اس کے سیاستدانوں کی سادگی کبھی پاگل پن کی حدوں کو چھو لیتی ہے، تاہم وہ دنیا کے دوسرے سیاستدانوں سے زیادہ گہری تفکیر کے حامل ہیں اور جلدی تبدیلی لانے، اسالیب کے تنوع اور مسائل کو حل کرنے پر پوری دسترس رکھتے ہیں اور شاید اعلیٰ ثقافت کے ساتھ استعماریت کا جذبہ، ان کی سیاسی سرگرمیوں پر اثرانداز ہوتا ہے۔ وہ باقی دنیا کو اپنی کھیتی سمجھتے ہیں۔ نیز وہ سمجھتے ہیں کہ جو ممالک ماضی میں کبھی بڑی ریاستیں ہوا کرتی تھیں، وہ اپنے اثرورسوخ سے لطف اندوز ہونے کے اہل نہیں رہے اور یہ کہ اب ان کو ریٹائر ہونا چاہئے اور ان کو بھی باقی دنیا کی طرح طاقتور کے تسلط کو قبول کرنا چاہئے۔

امریکہ کے پاس اس وقت جو ایٹمی اثاثے ہیں، وہ اتنے زیادہ ہیں کہ دنیا کے دوسرے تمام ممالک کے مجموعی ایٹمی اثاثوں سے کئی گنا بڑھ کر ہیں۔ امریکہ کے فوجی اخراجات کا دوسرے ممالک کے اخراجات کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ان پر امریکی برتری کی حدوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ 2002 میں مغربی بڑی ریاستوں کے دفاعی اخراجات مثال کے طور پر مندرجہ ذیل تھے۔

برطانیہ	=	35ارب ڈالر
فرانس	=	32ارب ڈالر
جرمنی	=	23ارب ڈالر
مجموعہ	=	90ارب ڈالر

جبکہ اکیلے امریکہ نے 350 ارب ڈالر خرچ کئے۔ اس کے ساتھ اسلحہ سازی کے معیار کا فرق بھی ہے اور باخبر ذرائع کے مطابق امریکہ یورپ سے ٹیکنالوجی کی ترقی میں دسیوں سال آگے ہے۔ اسی طرح امریکہ اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں پر تسلط رکھتا ہے اور عالمی بنک اور آئی ایم ایف میں سب سے بڑے مالی ذخیرے (financial reserves) پر اس کا تسلط ہے جس کے نتیجے میں اس وسیع سیاسی اثرورسوخ پر جو ورلڈ

بینک اور آئی ایم ایف، ریاستوں پر استعمال کرتا ہے، امریکہ ہی حاوی ہے۔ اسی طرح امریکہ نے عالمگیریت کی پالیسیوں کے بل بوتے پر اپنی تجارت مضبوط کرنے کی کوشش کی، جس کیلئے اس نے عالمی تجارتی تنظیم WTO کو استعمال کیا اور اس کو مساوی کسٹم unified teriffs متعارف کرانے کی دلیل دے کر علاقائی مارکیٹ میں دخل دینے کیلئے ایک آلہ بنانے پر کام کیا۔ یوں اس نے آزاد تجارت کیلئے کام کیا۔ چونکہ وہ بڑی اقتصادی طاقت کا حامل ہے اور اس کے پاس ملٹی نیشنل کمپنیوں یا سمندر پار کمپنیوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے، اس لئے ان منڈیوں کو کھولنے کیلئے جو امریکہ کے لیے بند تھیں یا جنہیں آزاد عالمی تجارت کا حصہ بنانا مشکل تھا، امریکہ نے اس قانونی جواز کا فائدہ اُٹھایا جو WTO نے فراہم کیا تھا۔

اس بے پناہ فوجی، سیاسی، اقتصادی صلاحیتوں نے امریکہ کو دورِ حاضر کی تمام ریاستوں کے معاملات کے اندر مداخلت پر اُکسایا اور امریکہ دنیا کے ہر ملک کی علاقائی سیاست کا ایک جزو بن گیا۔ اس کی یہ کوشش ہے کہ تمام ممالک کے اوپر تسلط کی پالیسیاں استعمال کرے، خواہ ترقی یافتہ ملک ہو یا پسماندہ۔ باوجود یہ کہ اسے اس تسلط میں کبھی کبھار ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن وہ یہ کوشش نہیں چھوڑتا۔

چنانچہ امریکہ دنیا کے تمام مسائل میں کردار رکھتا ہے اور یہ امریکہ ہی ہے جو سلگتے علاقوں میں کشیدگی کی آگ بھڑکاتا ہے۔ چنانچہ اس نے ریاستوں کی نئی درجہ بندیاں کیں، مثلاً "بدی کے محور ممالک" کی اصطلاح یا "دہشتگردی کی پشت پناہی کرنے والی ریاستوں" کی اصطلاح وغیرہ جیسی درجہ بندیاں، جن کے نقصانات سے امریکہ کے اتحادی اور زیر اثر ممالک بھی محفوظ نہ رہے، بلکہ اس نے دنیا کیلئے یہ ضابطہ بنایا کہ یا تو امریکہ کا ساتھ دو یا دہشتگردی کا، غیر جانبدار رہنا اسے قبول نہیں۔

امریکہ بحرانوں کو تخلیق کرتا ہے، مسائل پیدا کرتا ہے، کشیدگیاں ایجاد کرتا ہے اور پھر اس کے بعد ان بحرانوں کا انتظام کرتا ہے اور اس کیلئے حل ڈھونڈتا ہے۔ یہ سب وہ عالمی تسلط کی اسٹریٹجی کا حصہ سمجھتے ہوئے سرانجام دیتا ہے۔

یقیناً امریکہ نے اس وقت اپنی عسکری اور اقتصادی قوتوں کو اپنے سیاسی کاموں میں بہت غلط طریقے سے استعمال کیا ہے، کیونکہ اس کا اثر و نفوذ صرف اقتصادی اور تجارتی پہلوؤں تک محدود نہیں رہا جیسا کہ روایتی

استعماری ممالک کی صورتِ حال رہی ہے۔ اس نے اپنا اثر و نفوذ شہری زندگی کے تمام پہلوؤں تک ایسا پھیلایا کہ تعلیم، میڈیا، معاشرہ، فکر و ثقافت اور امن تک کو متاثر کیا ہے۔

تعلیمی میدان میں اس کا کردار تعلیمی نصاب میں اس کی آئیڈیالوجی سے ہم آہنگ ترامیم سے کافی واضح ہے۔ اس لئے ہم عرب ریاستوں، مثلاً سعودی عرب، کویت، اُردن اور مصر وغیرہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ ترقی اور وقت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگی کے نام پر اپنی تعلیمی نصابوں پر نظر ثانی کر رہے ہیں۔ سعودی عرب نے اپنے سکولوں کی کتابوں سے "الولاء والبراء" کا دینی موضوع نکال دیا جو اس کے نصاب کے اہم ترین موضوعات میں سے تھا۔ اُردن، مصر اور کویت وغیرہ نے یہود و نصاریٰ میں سے غاصب کفار کے ساتھ جہاد و قتال سے متعلقہ مواد یا ان جیسے دیگر اسلامی افکار کو، جو امریکہ کو ناپسند تھے، تبدیل کر دیا۔

ابلاغ (میڈیا) کے میدان میں امریکہ نے عربوں اور مسلمانوں پر میڈیا کے ذریعے اثر انداز ہونے کیلئے سینکڑوں ملین ڈالر کے فنڈ مختص کئے۔ چنانچہ اس نے "ریڈیو سُوا" اور "آزادی" ٹی وی چینل نصب کیے تاکہ عرب ممالک کے ہر گھر میں اپنا زہر پھیلائے۔

سماجی میدان میں امریکہ نے اسلامی اقدار سے دور رکھنے کیلئے عورت پر توجہ مرکوز کی۔ اس مقصد کیلئے فنڈ مختص کیے اور عورت کے موضوع پر کانفرنسیں منعقد کروانے کیلئے دباؤ ڈالا، خواتین کو حکومتوں اور پارلیمنٹ میں داخل کرنے کیلئے دباؤ ڈالا اور عورت کی آزادی کے تصور کی جدید شکلوں اور نئے انداز سے تشہیر کی۔

فکری اور ثقافتی میدان میں امریکہ نے جمہوریت اور pluralism (تکثیریت) کے افکار کیلئے مراکز اور انسانی حقوق کی تنظیمیں قائم کیں۔ یہ مراکز اور تنظیمیں مغربی تصورات پر مبنی اور امریکی انداز میں آزادی کے افکار کی ترویج و اشاعت کرتی ہیں اور امریکہ ہالی ووڈ کی فلموں اور ترقی یافتہ فنی ٹیکنالوجی کی پیداوار کے ذریعے ان تنظیموں اور مراکز کی مدد کرتا ہے جو عرب اور غیر عرب ٹی وی چینلز کی نشریات پر چھائی ہوئی ہیں۔

امن وامان کے میدان میں امریکہ نے عرب اور دیگر اسلامی کے ممالک کے انٹیلی جنس اداروں کو اپنے جاسوسی اداروں سے منسلک کیا، بالخصوص CIA اور FBI کے ساتھ۔ نتیجاً ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی ممالک میں امریکی انٹیلی جنس اہلکار مکمل آزادی کے ساتھ دندناتے پھرتے ہیں اور انہیں قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ سوڈان، یمن، کینیا، تنزانیا، لیبیا اور پاکستان اور دیگر ممالک کی صورتحال ہے۔ اس میں امریکہ کو مطلوب اشخاص کو پکڑوانے اور امریکی سپیشل فورسز کو ان لوگوں کے خلاف مخصوص فوجی کاروائیوں کی اجازت بھی شامل ہے جنہیں امریکہ دہشت گرد کہتا ہے۔

اس طرح امریکی ہاتھ اسلامی وغیر اسلامی معاشروں کی روزمرہ زندگی میں سرایت کیے ہوئے ہیں، وہ جیسے چاہے ان معاشروں کے اندر فساد برپا کرے جیسا کہ وہ مشرق وسطیٰ، افریقہ اور جنوبی ایشیاء میں کرتا ہے، حتیٰ کہ لاطینی امریکہ میں بھی، جہاں اس نے ہیٹی کے منتخب صدر Aristide کو ہٹا کر اس کو ملک بدر کر دیا اور آج (2004 میں) وینزویلا کے صدر ہیوگو شاویز کو گرانے کی کوشش کر رہا ہے، اس طرح امریکہ کمزور ریاستوں کے حکمرانوں کو جھکا کر اور حقیر کر کے ان ریاستوں کی چابیاں اپنی مٹھی میں لے لیتا ہے۔

لیکن یہ امریکی تسلط زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہے گا۔ یہ نیست ونابود ہونے اور زوال کے راستے پر گامزن ہے اور باوجود یہ کہ کرّہ ارض کے کونے کونے میں امریکی موجودگی دیکھی جاسکتی ہے اور اس کے باوجود کہ اسے حکومتوں اور حکمرانوں کا تعاون حاصل ہے، تاہم امریکہ کا اکھڑ پن، غرور و تکبر اور یہودیوں کے حق میں واضح تعصب، نیز دوسروں کے استحصال اور ان کو محکوم بنانے کی وجہ سے امریکہ کے ساتھ لوگوں، بالخصوص مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی نفرت، اور اکثریت کی بڑھتی ہوئی ناپسندیدگی کو دیکھتے ہوئے ہم کہتے ہیں: بڑھتی ہوئی یہ نفرت اور ناپسندیدگی میں اضافہ عنقریب امریکیوں کے خلاف ہر جگہ مقابلہ اور جدوجہد کو جنم دے گا، خواہ اس کے اپنے براعظم میں ہو یا اس سے باہر۔ اس پر مستزاد امریکی غرور و تکبر کی وجہ سے بڑی ریاستیں کو پہنچنے والی اذیت اور ان کے مفادات کو دھچکا، امریکہ کا مفادات پر اکیلا کنٹرول اور دائمی تسلط، نیز عالمی امور چلانے پر امریکی اجارہ داری کی کوششیں اس کے زوال کو دعوت دیتی ہیں۔

بے شک ایک ایسی ریاست کاوجود جو استعماریت اور دوسروں کاخون چوسنے والی سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کو اختیار کئے ہوئے ہو، نیز عالمی قیادت کے منصب پر اس کے ساتھ مزاحمت کرنے والی کسی دوسری قوت کی موجودگی کے بغیر اس ریاست کی بلاشرکتِ غیرے دنیاکی قیادت، دنیاکوایسی مسلسل بدحالی میں دھکیل دے گی جہاں یکے بعد دیگرے مشکلات آتی رہیں گے اور بحرانوں پر بحران پیداہوتے رہیں گے۔ امریکہ کا دنیامیں مچائے ہوئے فساد ، پھیلائی ہوئی تباہی اور مسلسل بحرانوں کی تخلیق کے مشاہدے سے اس بات کی تائیدہوتی ہے۔

سرمایہ دار ممالک، بالخصوص ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پیداکردہ بدحالی اورابتری بدستور رہے گی۔ اس کو صرف اس ریاستِ خلافت کے قیام کے ذریعے ہی ختم کیا جاسکتاہے جو اسلام کی درست اور عظیم آئیڈیالوجی کو نافذ کرتی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ رحمۃ اللعالمین پر اُتارا۔ تب اسلام کاعدل سرمایہ داریت کی مادی فکر اور اس کے استعماری طریقے کی بدصورتی اور ناقص ہونے کو بے نقاب کرے گا۔ اس طرح اسلام کی اعلیٰ طاقت امریکی سرکشی اور تکبر کو کچل کر رکھ دے گی اور اس کو اپنی سابقہ گوشہ نشینی اور اس کی 'نئی دنیا' کی طرف لوٹنے پر مجبور کردے گی، اگر اس کی یہ نئی دنیاباقی رہی۔ پھر دنیامیں خیر کادور دورہ ہو گا اور طویل غربت اور مصائب وبدحالی سہہ لینے کے بعد دنیاگہرے سکون کاسانس لے گی۔

5۔ انگریز قوم: جہاں تک انگریز قوم کا تعلق ہے، توان پر ابتدائے وجود سے ماہی گیری اور کشتی سازی کے فن کاغلبہ رہاہے۔ پھر ان کے اندر جہاز رانی اور تجارت کی نمو ہوئی۔ اس امر نے ان کے اندر منفعت کے شکار کرنے، فائدہ اٹھانے، اور تاجرانہ مزاج کو پیداکیا۔ اپنے ملک کے قلیل رقبہ کو دیکھتے ہوئے اس نے دوسروں سے تعاون حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی، جیساکہ شکاری مچھیرے سمندروں میں ایک دوسرے سے مدد طلب کرتے ہیں اور شاذونادر ہی اکیلے شکار کیلئے نکلتے ہیں۔ پھر جب سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کاظہور ہواتو انہوں نے اس کو گلے لگایا۔ چنانچہ ان کے اندر مفاد پرستی نے گہری جڑیں بنائیں۔ یہ اس بات کی وضاحت کرتاہے کہ کس طرح برطانیہ کی سیاسی زندگی شروع سے لیکر آج تک دوسروں سے مدد حاصل کرنے پر مبنی ہے اور یہ کہ جب کسی کو شکار کرناچاہتاہے تو اس کے لیے دانہ ڈالتاہے، چاہے کسی ملک کو کالونی بناناہو یا کسی

ریاست سے مدد طلب کرنا ہو۔ اس کی ساری سیاست گٹھ جوڑ اور اتحاد بنانے، بلاک بنانے اور استعماریت میں شراکت داری پر قائم رہی ہے۔ اس لئے انیسویں صدی میں اس نے استعمارانہ تسلط میں دوسری ریاستوں کو شریک کیااور اپنے مفادات کے دفاع کی خاطر اور دوسری ریاستوں کی طرف داری حاصل کرنے کے لیے ان ریاستوں کو بعض ممالک کو کالونی بنانے کی کھلی چھوٹ دی۔ اس لئے اس نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد مشرق وسطی میں فرانس کو داخل کیا، تاکہ خطے میں خطرہ کی موجودگی کے وقت فرانس اس کا ساتھ دے اور وہ فرانس کو خطروں کے آگے کھڑا کردے، پس یہ مقولہ بن گیا کہ برطانیہ آخری فرانسیسی فوجی تک لڑے گا۔

اس طرح مچھلی شکار کرنے کی طبیعت نے برطانیہ کے اندر اپنے مفادات کیلئے دوسروں سے مدد حاصل کرنے کا مزاج پیدا کیا۔

ایک اور فطری خصلت جو برطانیہ کے بارے میں مشہور ہے، بلکہ اس کی نمایاں ترین خصلت ہے، وہ قدیم روایات کی تقلید ہے۔ یہ بہت کم تبدیلی یاترقی کرتے ہیں اور وہ بھی بہت تاخیر سے، یاجب تبدیلی ناگزیر ہو۔ چنانچہ انگریز قوم صحیح معنوں میں قدامت پسند ہے۔ اور زمانۂ قدیم سے تاحال اس پر قدیمی خاندانوں، امرااور بڑے بڑے سرمایہ داروں کا غلبہ ہے۔ باوجود یہ کہ وہ جمہوریت کے راستے پر چلنے اور جمہوری قوم ہونے کی دعویدار ہے، مگر باریک بینی سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ عوام کا حکمرانوں کو لانے میں کوئی عمل دخل نہیں بلکہ حکومت کا قیام پرانے خاندانوں اور ذخیرہ اندوز مالکان کے ہاتھ میں ہے، عوام کے ہاتھ میں نہیں۔ اس حوالے سے قدیم وجدید دور میں کوئی فرق نہیں کیونکہ موجودہ زمانے میں بھی اس پر قدیم خاندان اور سرمایہ داروں کا تسلط ہے جیسا کہ ماضی میں تھا۔ قدیم زمانے سے برطانیہ نے اُبھرنے والی ہر عوامی تحریک کا بدترین مقابلہ کیا اور اسی تحریک کے ہم شکل کسی اسلوب کیساتھ اس کا خاتمہ کیا۔ کروم ویلCromwell انقلاب، جس پر انگریز لوگ بہت فخر کرتے ہیں، وہ بھی عوامی انقلاب نہیں تھا۔ وہ عوامی انقلاب کے خلاف پرانے خاندانوں کا انقلاب تھا۔ ان دنوں ایک عوامی انقلاب اُٹھا تھاجو خاندانوں اور سرمایہ داروں کے غلبے کو ختم کرناچاہتا تھا، قریب تھا کہ یہ انقلاب کامیاب ہوجائے لیکن ان خاندانوں نے اس کے خلاف ایک چال چلی۔ وہ Cromwell کو سامنے لائے، تاکہ وہ چند مخصوص حقوق کے مطالبے کے لئے

انقلاب برپا کرے، بہت سے لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو گئے اور اس کے بعض مطالبات کو تسلیم کر لیا گیا، چنانچہ عوامی انقلاب کو کچل دیا گیا اور اس کلی کو کھلنے سے پہلے ہی توڑ دیا گیا۔ برطانیہ پر دسیوں سال سے یہی Conservative (روایت پسند) حکومت کرتے رہے ہیں۔ جہاں تک لیبر پارٹی کا تعلق ہے، تو اس کو صرف برطانیہ کی ضرورت کے وقت ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے یا جب ایسے مسائل سر اٹھائیں جنہیں کنزرویٹو حل نہ کر سکیں، تو ان کو ان مسائل کو سلجھانے میں کام میں لایا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ لیبر پارٹی کے قائدین نے بالکل آخر میں اس حقیقت کا ادراک کیا، چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھال لیا اور دونوں پارٹیوں کے درمیان اقتدار کے انتقال میں بجائے اس کے کہ لیبر پارٹی، کنزرویٹو پارٹی کا ایک آلہ کار ہو، کنزرویٹو اور لیبر پارٹی کے درمیان کردار کے تبادلے کا عنصر غالب ہو گیا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ لیبر پارٹی کا موجودہ صدر اور برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلئیر پارٹی کے مزاج میں تبدیلی لایا اور کنزرویٹو پارٹی کی بہت سی پالیسیوں کے قریب ہوا اور سیاسی تشخص میں ایسا طریقہ اپنایا جو کنزرویٹو پارٹی کے چوٹی کے ممبروں سے بالکل مختلف نہیں، یہاں تک کہ اس نے سابقہ کنزرویٹو لیڈر مارگریٹ تھیچر کو خارجہ و داخلہ پالیسیوں کیلئے ایک آئیڈیل قرار دیا۔ اس طرح لیبر پارٹی کنزرویٹو پارٹی سے زیادہ مختلف نہیں اور برطانیہ میں یہ دونوں پارٹیاں امریکہ کی ڈیموکریٹک اور ریِپبلکن پارٹی کی دو سگی بہنیں ہو گئی ہیں۔

لیبر پارٹی کے اندر جب ایسے اشخاص پیدا ہو جاتے ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ برطانوی حکومت پر قدیم خاندانوں اور سرمایہ داروں کا قبضہ ہے تو ان اشخاص کو ایسے حالات میں رکھا جاتا ہے جو ان کو پارٹی پر اثر انداز نہ ہونے دیں اور نتیجتاً سیاسی اثر سے بھی دور رہیں۔ تیسری دہائی سے لیکر ساٹھ کی دہائی تک لیبر پارٹی کے ممبر Bevin اور ساٹھ کی دہائی میں George Brown، کنزرویٹو پارٹی کا لیبر پارٹی پر تسلط اور حکومت پر قابض طاقت کے تسلط کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے والے اشخاص کو دُور رکھنے کی بہترین مثالیں ہیں۔ کنزرویٹو اپنی قیادت انتخابات کے ذریعے منتخب نہیں کرتی بلکہ اس کا انتخاب سابقہ صدر کرتا ہے جیسا کہ میک ملن نے لارڈ ہیوم کو منتخب کیا اور مارگریٹ تھیچر نے جان میجر کو منتخب کیا۔ ہیتھ اور میجر کو اگرچہ انتخابات کے ذریعے منتخب کیا گیا لیکن یہ صرف ظاہری اور رسمی طور پر تھا کیونکہ ان دونوں کا پہلے سے تعیین کیا گیا تھا، پھر رسمی طور

پر انتخابات کئے گئے۔ اس لئے برطانیہ میں نظام حکومت اگرچہ جمہوری کہلاتا ہے مگر فی الحقیقت یہ تقرر (appointment)ہوتا ہے جوایک مخصوص طبقے کی طرف سے کیاجاتا ہے، یعنی یہ تعیّن قدیم خاندان، سرمایہ دار اوراجارہ داراشخاص کرتے ہیں۔

برطانیہ ایک جزیرہ ہے اور وہاں کے باشندوں کی معیشت کیلئے یہ جزیرہ ناکافی ہے۔ اس لئے طلبِ معاش کیلئے جزیرہ سے ان کانکلنا ان کی مجبوری اور ایک ناگزیر اَمر تھا۔ چنانچہ وہ تاجروں کی بجائے استعماری بن کر نکلے۔ وہ لوگوں کااستحصال کرنے اور ان کی دولت کولوٹنے کیلئے نکلے، اس لئے نہیں کہ ان کے ساتھ خرید فروخت کریں، کیونکہ ان کے پاس تو تجارت کیلئے دولت تھی ہی نہیں۔ چنانچہ وہ دولت ہی ڈھونڈنے کیلئے نکلے۔ جزیرہ سے نکلنے کے بعد ان کی یہی حالت رہی۔ جب انہوں نے سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کواختیار کیا، جس سے مفاد پرستی کو الگ نہیں کیاجاسکتا اوراس آئیڈیالوجی کواپنے مزاج کے عین مطابق پایا، تب ان کے اندر استعماری خیالات پختہ ہوگئے۔ اس طرح یہ درجہ اول کی استعماری ریاست بن گئی۔ چونکہ ان کی آبادی کم تھی اور وہ بڑی اقوام کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے، اس مشکل کے حل کیلئے انہوں نے دوسری ریاستوں اور قوموں کو استعمال کیا۔ اس مدد کو انہوں نے معاہدوں، کانفرنسوں اور اتحاد جیسے گروہوں کی شکل میں ڈھالا۔ اس لئے گروہ سازی کاپہلو، ان کی سیاست کالازمی جزوہے۔ ذہانت اور معاملہ سلجھائی میں اگرچہ یہ دیگر اقوام کی طرح ایک عام قوم ہے، مگر یہ اپنی ذہانت کو آخری حد تک استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے معاملہ فہمی، پالیسیوں کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے میں ان کو برتری حاصل ہے جبکہ مسائل کے حل میں بھی ان کو کافی دسترس حاصل ہے۔ اپنی توسیع کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنی صنعت کو جنگی صنعت کی بنیاد پر قائم کیا، اس طرح سیاست اور حکومت میں گہری سمجھ اور چالاکی جو اکثر اوقات خباثت ہوتی ہے، کواستعمال میں لاکر یہ صحیح معنوں میں ایک ایسی ریاست ہوگئی جو جنگی طاقت اور جنگی سازوسامان سے لیس ایک صنعتی قوت ہے۔

جہاں تک ان کی خارجہ پالیسی کا تعلق ہے، تو اس کی بنیاد استعماریت پر ہے مگر اس کے اندر دوچیزیں نظر آتی ہیں۔ ایک عالمی توازن کی حفاظت، دوسرا عالمی سیاست میں ہر قیمت پر موجودگی۔ اس لئے وہ صلیبی جنگوں میں بالکل واضح طور پر شریک ہوئے اور مقدس اتحاد میں بڑی ریاستوں کے آگے آگے تھے اورجب

نپولین فاتحانہ پیش قدمیوں میں مصروف تھا، اس دوران نپولین کو کچلنے اور فرانس کو سابقہ پوزیشن کی طرف لوٹانے والی طاقتوں کی قیادت کر رہے تھے اور جب جرمنی بسمارک کے زمانے میں متحرک ہوا تو برطانیہ نے برلن کانفرنس میں شرکت کی، جس کا ایک مقصد جرمنی کی قوت روکنا تھا اور جب اس نے جرمنی کی قوت میں غیر معمولی ترقی محسوس کی تو اس کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور دونوں عالمی جنگوں میں اس کے خلاف لڑا۔ امریکہ اور سوویت یونین کے مابین مفاہمت کے دور میں برطانیہ نے دنیا کا نقشہ تبدیل کرنے اور ان دونوں بڑی طاقتوں کو، جو اس وقت دنیا پر حکمرانی کر رہی تھیں، کمزور کرنے کیلئے پوری دنیا کو جنگ میں جھونکنے کی کوشش کی۔ اور جب دونوں طاقتوں کے معاہدے کے بعد اس کو عالمی سیاست سے بے دخل کر دیا گیا تو وہ ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ چنانچہ وہ تعصب پر اُتر آیا اور بڑی شدت کے ساتھ عالمی حیثیت حاصل کرنے اور عالمی سیاست میں شریک ہونے کے لئے کوشش کرنے لگا۔ برطانیہ ریاستوں کے ساتھ معاہدات اور شخصیات کو اپنا ہمنوا بنا کر ان کے ذریعے اثر انداز ہونے، پر انحصار کرتا ہے۔ اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ بھاؤ تاؤ میں اپنے مد مقابل کو بڑا لقمہ کھلا دے۔ سیاست میں اس کا کوئی دوست دشمن نہیں۔ اس کو اگر کسی چیز سے غرض ہے تو وہ صرف مفاد ہے، اس کے علاوہ کوئی چیز اس کے مد نظر نہیں، اور نہ عالمی اخلاق پر اس کو یقین ہے، وہ اس کو فریب اور دغا کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے اور اپنی سیاست میں جھوٹ کو ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر اختیار کرتا ہے، اگرچہ وہ اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لیے اسے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک دفعہ برطانوی وزیر اعظم چرچل، رُوزویلٹ اور سٹالن کے ساتھ جنگ کے معاملے اور جرمنی کے مستقبل کے بارے میں بحث کرنے کیلئے ایک ملاقات میں موجود تھا۔ اس نے انتہائی کھلے انداز میں ان سے جو باتیں کیں ان میں سے ایک یہ بات بھی تھی کہ "جنگ میں سچ اتنا قیمتی ہوتا ہے کہ جھوٹ کی مکمل چوکیداری کے لیے اس کی حفاظت ضروری ہے"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ برطانوی سیاست میں جھوٹ کو کس حد تک ایک بنیادی عنصر کی نظر سے دیکھتا تھا۔

یہ ہے برطانیہ اور اس کی سیاست کی حقیقت۔ ضروری ہے کہ اسے ایک استعماری ریاست کے طور پر دیکھا جائے، ایک ایسی ریاست کی طرح جس کا گزر بسر اپنے عوام کے استحصال پر ہے، حالات اور زمانے کی وجہ

سے ان کی زندگی کا یہ طریقہ تبدیل نہیں ہوا۔ اس نے عوامی انقلابات کے خلاف ایسی چالیں چلیں کہ کسی انقلاب کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ پس اس کی استعماریت کا مقابلہ بھی صرف اس کے انداز وذرائع کی پہچان اور خفیہ اسالیب کے ساتھ کھلم کھلا مقابلے کے ذریعے ہی ممکن ہے، جس کے اندر واضح اور خالص چالاکی کی آمیزش کی گئی ہو۔ اپنے ملک کے اندر اس کی طاقت کا راز شاعر کے اس قول میں ہے "مجھے وہی دوائی دو جو خود بیماری ہے (میری بیماری کا علاج ایک اور بیماری سے کرو)"۔ اور باہر اس کی طاقت دوسروں کو استعمال کرنے میں مضمر ہے، حتی کہ جن کے ساتھ اس کا مقابلہ ہوتا ہے یہ ان کو بھی استعمال کرتا ہے۔ اور اس کو قابو کرنے کا کوئی اور راستہ نہیں سوائے اس کے کہ اس کو روایتی سیاست کے اسلحہ سے پاک کیا جائے اور اس کو تنہا کر کے اس کے ساتھ مقابلہ کیا جائے کہ اس کے ساتھ کوئی اور معاون شریک نہ ہو۔

6۔ فرانسیسی قوم: جہاں تک فرانسیسی قوم کا تعلق ہے، تو یہ وہ قوم ہے جس نے یورپ کے قلب میں ایک مضبوط ریاست تشکیل دی اور وہ تمام یورپی ریاستوں کو یہ فخر جتاتا ہے کہ یہ فرانسیسی قوم ہی ہے جس نے آزادی اور عدل ومساوات کی بلند افکار سے لوگوں کو روشناس کرایا۔ فرانسیسی قوم کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اسی نے سیاست اور فکر میں غیر معمولی شخصیات پیدا کیں۔ تاہم بہر حال یہ ایک استعماری ریاست ہے۔ یہ صرف آزادی کے افکار سے متاثر ہونے کی وجہ سے ممتاز ہے کہ یہ اس کی ذاتی بلند خاصیت ہے جو کہ اب فرانسیسیوں کی ایک عادت اور ایک طبیعت بن چکی ہے۔

فرانسیسی قوم نے جب سے آزادی کی فکر اختیار کی اس کے اندر انتشار کی جڑیں گہری ہوتی گئیں۔ چنانچہ اب یہ ایک قوم یا جماعت ہونے کی بنسبت افراد کے مجموعے کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کے اندر کم ہی مضبوط حکومتیں وجود میں آئیں اور اسی وجہ سے برطانیہ نے فرانس کو یکے بعد دیگرے کئی بار آسانی سے استعمال کیا۔ چنانچہ نپولین کے چلے جانے کے بعد سے لے کر ڈیگال کے زمانے تک فرانس برطانیہ کے نقشِ قدم پر چلتا رہا اور اس کی وجہ اس کے اندر آزادی کی فکر کا مضبوط ہونا ہے، اس حد تک کہ جب وہ امریکہ، ایشیا اور افریقہ کی طرف ایک استعمار کی حیثیت سے بڑھا، تب برطانیہ نے ہی اس کو بھی ان علاقوں میں

پہنچایا تا کہ اس کے ذریعے اپنے لیے طاقت حاصل کرے، اگرچہ استعماری دور میں دونوں ریاستوں کے درمیان مزاحمت منظر عام پر بھی آجاتی تھی۔

اس بناپر کوئی شخص فرانسیسی قوم کے بارے میں آزادی کی خصوصیت سے بڑھ کر کسی اور خصوصیت کا فیصلہ نہیں کر سکتا، فکری آزادی نے اس میں فلسفی، شاعر اور مفکرین وغیرہ پیدا کئے اور سیاسی آزادی نے وقار، فخر اور خود اعتمادی پیدا کی، جس نے نادر شخصیات کی ایک بڑی تعداد پیدا کی لیکن شخصی آزادی نے پیرس کو فحاشی اور فسق وفجور اور شہوت رانی اور حصول لذت کا مسکن بنادیا اور آزادی نے ہی فرانس میں دراڑیں ڈالیں کیونکہ غیر ملکی لوگ بالخصوص برطانیہ والے اس میں گھس آئے۔ اس لئے فرانس کے معاملے میں یہ بے لگام آزادی ہی اس کے مسائل کی اصل بنیاد اور اساس سمجھی جاتی ہے۔

کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فرانس کے اندر اتنی پارٹیاں ہیں اور فلاں پارٹی ایسی اور فلاں ایسی ہے، کیونکہ ان جیسی قوم کے اندر پارٹی کی حقیقی معنوں میں موجودگی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ ہاں اس میں افراد کے مجموعے پائے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو پارٹیاں کہتے ہیں۔ اس لئے فرانس کے اندر کسی مضبوط یا مسلسل حکومت کی موجودگی مشکل ہے کیونکہ ہر فرانسیسی کی اپنی اپنی حکومت ہے اور ہر فرانسیسی حکمران بننے کے لالچ میں ہے۔ اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ فرانس کی داخلہ پالیسی ایسی ہے اور خارجہ پالیسی ایسی۔ اس کی داخلہ پالیسی حکمرانوں کے مزاج اور آزادی کے مفہوم کے مطابق ہوتی ہے اور ان کی خارجہ پالیسی استعماریت اور اپنے اثرونفوذ بڑھانے کیلئے دوسروں پر فرانس کا غلبہ حاصل کرلینے کی طاقت کے مطابق ہوتی ہے۔ فرانس کو استعماری ریاستوں میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے سرمایہ دارانہ مبدأ (آئیڈیالوجی) قبول کیا ہوا ہے۔ چنانچہ مفاد پرستی اس کی زندگی کا بنیادی اور اہم جزو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ استعماریت اور اپنی کالونیوں کی بقاء کا حریص ہے۔

لیکن فرانس کی خارجہ پالیسی کے حوالے سے فکر دینا ضروری ہے۔ اس لئے اس بات کو مد نظر رکھنا چاہئے کہ اس کی پالیسی غیر ملکی سطح پر اپنے لئے اثرونفوذ پیدا کرنے پر مبنی ہے، چاہے کالونیوں کے ذریعے ہو یا

پھر ثقافتی واقتصادی اثر ونفوذ کے ذریعے سے ہو۔ بڑی ریاستوں کے خلاف اس کی سیاسی کاروائیاں اپنی شخصیت کے اظہار اور تسلط اور بڑے پن کے اظہار پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یہ سیاسی داؤپیچ سے ناآشنا ہے بلکہ اکثر ٹکراؤ کا سہارا لیتا ہے۔ اس لئے ان دنوں اس کے اور امریکہ کے درمیان کشمکش کا بآسانی مشاہدہ کیاجاسکتا ہے جبکہ امریکہ کا دیگر ریاستوں، بالخصوص برطانیہ کے ساتھ کشمکش کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ اس لئے اس کی کاروائیوں کا مقابلہ اس کی بڑے پن پر جرح نہ کرنے اور اس کو پہل کرنے کا موقع نہ دینے میں ہے اور یہ کہ اس کو بڑی ریاست نہ سمجھا جائے، سوائے اس محدود کردار کے، جتنا عالمی سیاست میں بڑی ریاستیں اس کو قبول کریں۔

7۔روسی قوم: جہاں تک روسی قوم کی بات ہے، تو یہ ایک چاق وچوبند قوم ہے، ان کے اندر سرگرمی اور طاقت پائی جاتی ہے، مگر یہ سیدھے سادھے لوگ ہیں۔ اس قوم نے اگرچہ پہلے سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی اپنالی تھی، پھر کیمونسٹ اور پھر سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کی طرف لوٹ آئے مگر وہ یورپ سے پیچھے رہے ہیں۔ وہ یورپی اقوام کی سطح تک نہیں پہنچ پائے، چنانچہ روسیوں کے اندر یورپی لوگوں کے مقابلے میں ایسی خامی موجود رہی جس نے ان کے رویے پر منفی اثرات ڈالے۔

اپنے ملک کے اندر روسی قوم ایک جنگجو اور بہادر قوم ہے مگر اپنے ملک سے نکلتے ہی وہ اپنے یہ اوصاف کھو بیٹھتی ہے۔ اس لئے طویل عرصے سے یہ توقع کی جارہی تھی کہ مشرقی یورپ کے ممالک پر سے اس کا تسلط ختم ہو جائے گا، اب سوویت یونین کے خاتمے کے بعد عملی طور پر اس کا تسلط ختم ہو چکا ہے۔ تاریخی حقائق اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ روسی قوم اپنے ملک سے باہر کس بھی واقعے میں کامیابی حاصل نہیں کر پائی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ چیچنیا جیسے چھوٹے ملک میں اس کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا جبکہ اپنے ملک کے اندر اگر اس پر حملہ کیا جاتا ہے تو دشمن پر اس کو کامیابی حاصل ہو جاتی ہے، جیسا کہ نپولین اور ہٹلر کے ساتھ ہوا۔

روس کے اندر قیصروں Caesars کے ادوار میں موجود نظامِ حکومت، کمیونسٹوں کے دور سے مختلف تھا اور موجودہ دور سے بھی مختلف تھا۔ بہر حال یہ تمام ادوار میں استبدادی (autocratic) نظام حکومت رہا۔ چنانچہ قیصر مخصوص طریقے سے جاگیرداروں کا سہارا لیتا تھا۔ بڑے بڑے زمینداروں کا بڑے مالداروں

کے گٹھ جوڑ کے ذریعے اس ملک پر سرداروں کی طرح تسلط ہوتا تھا۔ وہ قیصروں کی خارجہ وداخلہ پالیسیوں کی مکمل حمایت کرتے تھے اور یہ سب مل کر روسی قوم کا بے دریغ استحصال کرتے تھے۔ یہ صورتحال ملکی زوال اور قوم کی پسماندگی کا باعث ہوئی۔

بلاشبہ روس پہلی جنگ عظیم سے پہلے یورپ سے پیچھے تھا اور بعض یورپی ممالک اس کا استحصال کرتے تھے۔ چنانچہ روس کی مرکزی صنعتیں، فرانس، برطانیہ اور بلجیم کے ہاتھوں میں تھیں۔ کان کنی کی اہم فیکٹریاں فرانسیسیوں کے ہاتھوں میں تھیں، Donets basin میں کوئلے کی صنعت غیر ملکیوں کے ہاتھوں میں تھی، تیل کے لگ بھگ نصف کنوئیں برطانیہ اور فرانس کے ہاتھوں میں تھے اور روسی صنعت کے منافع کا بڑا حصہ بیرونی بینکوں، بالخصوص برطانیہ اور فرانس کے بینکوں میں جاتا تھا۔ چنانچہ یہ ملک 1914ء تک نظام حکومت، معیشت، ثقافت اور تعلیم میں پیچھے تھا۔ اس کے باوجود روس بڑی ریاست تھا اور عالمی سطح پر بھی اس کو بڑی ریاستوں میں سے شمار کیا جاتا تھا اور یہ عالمی سیاست پر اثرانداز بھی ہوتا تھا۔ جب کیمونسٹ پارٹی نے حکومت سنبھال لی تو حکومت کی حالت صرف اسلوب کے حوالے سے ہی بدلی۔ کیمونسٹ پارٹی نے جبر و تشدد، قتل وخونریزی، دہشت گردی اور ظلم و ستم کے ساتھ حکومت کرنا شروع کی۔ اس نے لوگوں کی کھوپڑیوں پر اپنے اقتدار کا ڈھانچہ کھڑا کیا۔ روس سپر پاور کو دشمنی کی سوچ چھوڑنے پر مجبور کرنے کے قابل ہوا اور پھر اس کے ساتھ معاہدات کرکے اس کا اتحادی یا نیم اتحادی بن گیا۔ اس طرح روس (سوویت یونین) عالمی معاملات کو چلانے میں سپر پاور کے ساتھ شریک تھا، بلکہ پوری دنیا پر اس وقت دو دیو ہیکل ریاستیں حکومت کرتی تھیں، یعنی روس اور امریکہ۔ جہاں تک کیمونسٹ روس کی پالیسی کا تعلق ہے تو یہ مخصوص نظریے پر مبنی تھی۔ اس کی فکر کیمونیزم کا فروغ تھا اور اس کا طریقہ تخریب وتباہی اور اختلافات کو ہوا دینا تھا۔ اسے جب بھی موقع ملا، اس نے بعض ممالک کے اندر کیمونزم لانے کی کوشش کی۔ اس نے ان ممالک پر جو اپنا نظام حکومت کیمونیزم پر استوار کرتے تھے، تسلط حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔

کیمونزم کے زوال کے بعد روسی قوم اور اس کے قائدین نے اپنے لئے ایک ایسی جدید شناخت کی ضرورت محسوس کی جو قیصر اور کیمونسٹ دور کے روس سے مختلف ہو۔ چنانچہ وہ سرمایہ داریت کی طرف آ گئے،

جیسے کوئی شدید گرمی سے بچاؤ کے لیے آگ کی پناہ لے۔ اس طرح ان کی غربت میں اضافہ ہوتا گیااور روس کا وقار اوراس کاعالمی مقام بھی متزلزل ہوا۔

یوں روس کانظام حکومت سرمایہ دارانہ اور قیصروں کے دور کے مشابہ ہوگیا۔ اس کے باوجود کہ وہ کمیونسٹ دور کے کچھ باقیات محفوظ رہیں، اس کے اندر سرمایہ دار طبقہ اور بڑے بڑے امیر لوگ وجود میں آگئے اور ان کا حکومت پر اثر ہے جیسا کہ قیصروں کے زمانے میں جاگیرداروں کا تھا، مگر اس مرتبہ قیصروں کی جگہ روس پر سابقہ سوویت یونین کے انٹیلی جنس اہلکار KGB اور سابقہ کمیونسٹ سیاسی شخصیات حکومت کررہے تھے جنہوں نے صرف اپنی چمڑیاں بدلیں تھیں اور جدید انداز کے سرمایہ دار بن گئے۔

روس کی خارجہ پالیسی کا زور فقط اس بات پر ہوگیا اس کا ایک کردار ہو، اسے اس کی کوئی فکر نہ تھی کہ خارجہ پالیسی کے حوالے سے اس کا کوئی عالمی نقطۂ نظر ہو۔ اس لئے عالمی میدان میں اس کا وجود ناپید ہو گیااوراس کی فقط یہ کوشش رہی کہ اس کے کردار کو یاد کیاجائے اور یہ کہ اسے عالمی سیاست سے بالکل ہی دور نہ کر دیا جائے۔ اس کی یہ حالت روسی قوم کے پاس آئیڈیالوجی پر مبنی فکری شناخت کے فقدان کی وجہ سے ہوئی ہے۔ روسی قوم اور قائدین کا سیاسی افلاس، روسی پالیسیوں کے مقابلے میں کھڑے ہونے کا موقع دیتا ہے کہ روس کے ساتھ ایسے تجارتی تعلقات بنائے جائیں جو مسلمانوں کو روس میں داخل ہونے کا موقع دیں اور روس کو یہ موقع دیں کہ وہ اسلام کو ایک زندہ دین کی حیثیت سے دیکھ سکیں جو لوگوں کے تعلقات کو عملی طور پر منظم کرتا ہو، نیز اس کی عالمی سیاست پر اثرانداز ہونے کی کوششوں کا اس طرح مقابلہ کیاجائے کہ اسے اس کا موقع ہی نہ دیاجائے اور اس کے ساتھ فقط تجارت کے شعبے میں تعلقات استوار کئے جائیں اور دوسرے میدانوں میں اس کا مقابلہ دیگر سرمایہ دار ممالک جیسا کیاجائے، کیونکہ اس کی خارجہ پالیسی استحصال اور استعماریت پر مبنی ہے، اگرچہ وہ اس کا اظہار صرف اپنے پڑوسی ممالک میں کرتا ہے۔

آخر میں ذکر کی گئی چاراقوام یعنی امریکی، برطانوی، فرانسیسی اور روسی، موجودہ زمانے میں بڑی ریاستیں تصور کیے جانے والی ممالک میں بسنے والی قومیں ہیں، جو دنیا کے مختلف علاقوں میں عالمی سیاست میں

مداخلت اور کمزوری اور قوت کے کمی و بیشی کی نسبت سے ان علاقوں پر تسلط اور ایک دوسرے سے مقابلہ بازی کے عزائم رکھتی ہیں۔ اکیسویں صدی عیسوی میں ان کی عالمی سیاست پر اثر اندازی کی مسلسل چھان بین کے ذریعے ان چاروں ریاستوں کی پالیسیوں کے رہنما اصولوں کا اجمالی خاکہ دینا ممکن ہو جاتا ہے جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

جہاں تک امریکہ کی بات ہے، اس کی قوت سوویت یونین کے اچانک سقوط کے وقت سے تیز رفتاری سے بڑھنے لگی اور یہ دنیا کے معاملات میں سب سے زیادہ مؤثر بڑی طاقت بن گیا، خاص کر سوویت یونین نے جو خلا چھوڑا تھا اس کو کسی اور ریاست کیلئے پُر کرنا ممکن نہیں تھا تا آنکہ امریکہ بلا مزاحم و مقابل سپر ریاست بن گیا اور عصر حاضر کی بڑی ریاستوں میں سے کوئی ریاست آج تک دوسری سپر طاقت کے اس درجے کو نہ پہنچ پائی، جس پر سوویت یونین براجماں تھا۔ اس نادر عالمی صورتحال نے، جس نے امریکہ کو دوسروں پر برتری کا موقع دیا، امریکی سیاستدانوں کو دوسروں کے ساتھ لین دین میں کبر و غرور اور خود بینی پر اکسایا۔ کلنٹن کے دور میں امریکی وزیر خارجہ مسز میڈلین البرائٹ نے شاید اسی حالت کو یوں تعبیر کیا ہے "کہ امریکہ ایک ناگزیر قوم ہے۔ اس کی عالمی ذمہ داریاں ہیں اور ہر وقت کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہے، جس کی بھی وہ ضرورت محسوس کرے۔ سب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم جو چاہے کر لیتے ہیں اور جو چاہے تبدیل کر لیں، ہمارے راستے میں رکاوٹیں نہیں آتیں، کیونکہ دنیا ہماری ہے، دنیا امریکیوں کی ہے"۔

امریکی سیاست میں اس فخر و غرور کی وجہ سے یورپی اقوام جو اس کی اتحادی تھیں، وہ بھی دنیا پر اس کی بالادستی گوارا کر سکیں، نہ البرائیٹ کے متکبرانہ گرجدار لہجے میں بیانات کو۔ اس لئے انہوں نے البرائیٹ کو اپنے پرنٹ میڈیا کے ذریعے جواب دیا اور ناگواری کا اظہار کیا۔ فرانسیسی اخبار (Le Monde Diplomatique) نے البرائٹ کے بیان پر رد عمل ظاہر کرتے ہوئے لکھا: "امریکی تسلط دنیا کے لیے مقدر کا لکھا ہوا نہیں ہونا چاہئے اور امریکہ کو ابھی سے یہ جان لینا چاہئے کہ وہ پانچوں براعظموں پر صرف اپنے مفادات کے مطابق اپنے قوانین نافذ نہیں کر پائے گا، اسی طرح وہ ہمیشہ کے لیے کشمکش اور بحرانوں والے علاقوں میں دنیا کی پولیس بن کر نہیں رہ سکے گا"۔

اس لئے امریکہ اپنی پالیسیوں میں اپنے نقطہ نظر کی وجہ سے اس طرف چلا گیا کہ وہ دنیا کا مالک ہے اور اس کا حقدار اور اہل ہے، وہ برملا یہ اعلان کرتا رہتا ہے کہ وہی دنیا کا قائد ہے جیسا کہ اگست 2004ء میں بش نے امریکی ریاستوں کے اپنے انتخابی دورے کے دوران کہا تھا۔ امریکہ ہمیشہ دنیا کے لیے منصوبوں کا اعلان کرتا رہتا ہے جیسا کہ New World Order، New Middle East Plan، The Greater Middle East Plan، مگر یہ تکبر اور اکھڑ پن بالآخر امریکہ کیلئے وبالِ جان بنے گا بلکہ اس کی علامات ظاہر ہونے لگی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ افغانستان اور عراق کے دلدل میں پھنس چکا ہے۔ اس کے باوجود کہ اس نے نہتے شہریوں پر اندھا دھند اور وحشیانہ بمباری کا ارتکاب کیا، اس نے قید خانوں میں وحشیانہ اور شرمناک کاروائیاں کیں، اس کے فوجیوں کی لاشوں کے تابوت افغانستان اور عراق میں قتل کئے جانے کے بعد امریکہ پہنچ رہے ہیں، اسے رسوائی کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس کا سارا غرور اور ڈھٹائی خاک میں مل گئی ہے۔ علاوہ ازیں ان خطوں کے لوگ اس سے نہایت نفرت کرتے ہیں، کیونکہ اس کے بھیانک جرائم سے انسان، درخت اور پتھر بھی محفوظ نہیں، تعلیمی نصاب، میڈیا اور فکری میدان بھی ان جرائم کی زد میں ہیں۔

یورپ، ایشیا اور افریقہ، امریکہ سے اس لئے ناراض ہیں کہ ان کے وسائل کو اس نے لوٹا اور ان کے علاقوں اور لوگوں پر جارحیت کی، نیز دنیا کے تمام خطوں پر صرف اور صرف امریکی راج قائم کرنے کی کوشش کی۔

اس طرح امریکی پالیسی کو جو چیز ممتاز بناتی ہے، وہ ایک طرف اس کی رعونت، اکھڑ پن، مختلف انواع کے جرائم اور دنیا کو اپنی جاگیر کی نظر سے دیکھنا ہے، دوسری طرف دوست کیا دشمن کیا دنیا کی تمام اقوام کی امریکیوں سے شدید نفرت وبیزاری۔ یہ سب امریکی المیے کے دردناک اختتام اور دنیا کے تمام جابروں کی طرح اس کے زوال وانحطاط کی خبر دیتا ہے۔

برطانیہ کی جہاں تک بات ہے، اس کا ایک پاؤں یورپ میں اور دوسرا امریکہ میں ہوتا ہے، اسے ایک طرف یورپی اور دوسری طرف انگلو سکسونین (Anglo-Saxon) جذبات ورجحانات کے کشمکش کا سامنا ہے اور اسے دونوں کے درمیان توازن رکھنا پڑتا ہے۔

یہی توازن امریکہ اور یورپ کے ساتھ اس کے تعلقات کی بنیاد ہے۔ یہ دونوں طرف منہ مارتا ہے اور دونوں سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ وہ بیک وقت امریکہ اور یورپ دونوں کے ذریعے طاقت حاصل کرتا ہے، نہ تو امریکہ کو چھوڑ سکتا ہے اور نہ یورپ سے الگ ہو سکتا ہے لیکن اس کے بیشتر مفادات یورپ سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ روز بروز یورپ کے زیادہ قریب ہو رہا ہے۔ یورپی یونین میں اس کا داخلہ اس کی دلیل ہے۔ حال ہی میں برطانیہ نے نیٹو سے علیحدہ ایک یورپی فورس کی تشکیل میں شرکت کی، ایسا اس نے فرانس اور جرمنی کے ساتھ تعاون کے سلسلے میں کیا اگرچہ امریکہ نے اس پر شدید اعتراض کیا۔ یہ برطانیہ کی یورپ کے بارے میں پالیسی ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جس پر یورپ سے متعلق اس کے سیاسی اعمال کی بنیاد ہے۔

جہاں تک فرانس کی بات ہے، تو وہ برطانیہ سے مختلف ہے کیونکہ اس کی پالیسی خالص یورپی بنیادوں پر استوار ہے اور اس کو امریکہ کی کوئی پروا نہیں۔ وہ یورپی یونین کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس یونین پر تسلط حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے تاکہ یورپ امریکہ سے بالکل الگ تھلگ متحدہ طاقت کے طور پر اُبھرے اور سیاسی، معاشی، فوجی اور ثقافتی تمام پہلوؤں سے امریکی قوت کے برابر ہو جائے اور صرف معیشت یا روایتی سیاسی تعاون تک محدود نہ ہو۔

فرانس اس پالیسی کو حاصل کرنے کے لیے جرمنی کی قربت کو سنگِ بنیاد تصور کرتا ہے، اس حد تک کہ وہ فرانس جرمنی محور (French-German axis) کو ہی متحدہ یورپ کی پالیسی کے لیے بنیاد سمجھتا ہے۔

یہ ہے فرانس کی یورپی پالیسی، جو کہ واضح، دوٹوک اور آزادانہ نوعیت کی ہے جو فرانس اور جرمنی کو یورپی فورس کا مرکز اور محرک گردانتی ہے۔

جہاں تک روس کی بات ہے، یورپ کیلئے اس کی حالیہ پالیسی دو چیزوں میں نمایاں ہے:

پہلا: یورپی ریاستوں میں شمولیت اور ان کے ساتھ شانہ بشانہ یورپی امور پر بحث میں شرکت کی سنجیدہ کوشش۔ اس حوالے سے روس کو کچھ حد تک کامیابی ملی ہے اور وہ یورپی کونسل، نیز G7 میں داخل ہونے

کے قابل ہوا ہے لیکن یورپی یونین میں داخل ہونے حتیٰ کہ اس داخلے کیلئے نامزدگی کروانے میں اسے ناکامی کا سامنا ہے۔

دوسرا: سوویت اتحاد کے ان ممالک کے ساتھ نمایاں تعلقات قائم رکھنا جو سابقہ ادوار میں اس کا حصہ تھے۔ اسی طرح ان ممالک کے ساتھ جو سوویت بلاک کا حصہ تھے۔ ان تعلقات کی نوعیت پائدار قسم کی سرپرستی کی ہو، تاہم اس معاملے میں اسے بری طرح کی ناکامی ہوئی۔ چنانچہ مشرقی یورپ کے تمام ریاستوں پر سے اس کا تسلط ختم ہوگیا جیسے بلغاریہ، رومانیہ، چیک ری پبلک، سلوواکیہ، پولینڈ، ہنگری اور یوگوسلاویہ کی منتشر ریاستیں۔ روس نے جارجیا، آذربائیجان، آرمینیا، یوکرائن، وائٹ رشیا، مولداویا اور وسطی ایشیا کی مسلمان جمہوری ریاستوں پر سے بھی اپنا کچھ تسلط کھودیا اور صرف قازقستان پر اس کی مکمل گرفت برقرار رہی، جبکہ دوسری طرف تینوں بالٹک ریاستوں، اسٹونیا، لتھوانیا اور لٹویا پر سے پہلے ہی اس کے تسلط کا خاتمہ ہوچکا تھا۔

روس کی یورپی پالیسی کا خلاصہ یہ ہے کہ یورپی نقطہ نظر سے روس جس درجے کی کوشش اور منصوبہ بندی کی وہ اسے یورپ کا اہل نہیں بناتی۔ شاید وہ ایسا کر بھی نہ پائے جس کی وجہ اس کا یوروایشین، یعنی یورپی اورایشیائی ہونا ہے۔ پس وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ مکمل طور پر یورپی ہے۔ نتیجتاً وہ اپنے وسیع ایشیائی میدان سے قطع نظر نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی غیر یورپی ممالک کے ساتھ وابستہ اپنے وسیع تعلقات ومفادات سے چشم پوشی کر سکتا ہے۔ چنانچہ روس اپنے وسیع اور ناگزیر میدان vital space کے تعین میں مشغول ہے، جو اسے منتشر رکھے ہوئے ہے اور نتیجتاً وہ یورپی اطراف پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کر سکتا۔

یوں ہمیں بڑی ریاستوں (امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس) کے لوگوں کے بارے میں معرفت حاصل ہوگئی۔ نیز امت مسلمہ کا تعارف بھی ہوا جو ریاستِ خلافت کی شکل میں عنقریب بڑی ریاست بننے والی ہے۔ اس کے ساتھ ہم نے جرمن قوم کو پہچان لیا جس کا بڑی ریاست بننا متوقع ہے، اگرچہ تاخیر سے ہو۔ اور ہم نے جاپانی قوم کا ذکر بھی کیا کہ وہ بڑے اقتصادی اثرات کا حامل ملک ہے۔

عالمی سیاست پر ان اقوام کا اثر اور عمل دخل اس وقت مزید واضح ہو جائے گا جب ہم نمایاں عالمی مسائل کا جائزہ لیں گے۔

1-یورپ کا مسئلہ

یورپ کا مسئلہ کئی صدیوں سے ایک بڑا عالمی مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق بڑی ریاستوں اوران کے درمیان توازن، عالمی استعماری تسلط اور اس کے عسکری،اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی حجم کے ساتھ ہے۔ یہ قدیم ترین مسائل میں سے ہے اور یہ نام نہاد عالمی امن کیلئے خطرہ بھی ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ قدیم ترین مسئلہ ہے تو یہ اس لئے کہ اسی مسئلے نے عالمی برادری یا جسے عالمی سماج کہتے ہیں، کو جنم دیا اور اسی مسئلے کی وجہ سے عالمی قانون وجود میں آیا۔یورپی عیسائی ریاستوں سے عالمی برادری تشکیل پائی تا کہ یورپ اسلام کا مقابلہ کر سکے۔ اور نپولین پر حملہ کرنے اور فرانس کی توسیع کو روکنے کیلئے مقدس اتحاد وجود میں آیا۔ پھر جرمنی کو مشرق وسطیٰ کے تیل پر قبضے سے روکنے اور اس کی قوت محدود کرنے کیلئے پہلی عالمی جنگ ہوئی۔ پھر جرمنی کا مقابلہ کرنے اور یورپ کے اندر طاقت کے توازن میں گڑبڑ لانے سے اس کو روکنے کیلئے چار بڑی ریاستیں یکجا ہو گئیں: برطانیہ، فرانس، امریکہ اور سوویت یونین۔ ان ریاستوں نے جرمنی کو گرانے اور اس کو دوبارہ بڑی ریاست بننے سے باز رکھنے کیلئے معاہدہ کیا اور یورپ کے اتحاد میں رکاوٹ ڈالنے اور جرمنی کو مضبوط ہونے سے روکنے کیلئے سیاسی تدبیریں کی گئیں جو کئی سال تک یورپی یونین کی تشکیل میں رکاوٹ بنی رہیں۔ اسی طرح دہائیوں تک جرمنی کے اتحاد کو مؤخر رکھا گیا۔ دونوں بڑی طاقتوں نے مفاہمت کے دور (détente) سے قبل اور بعد میں اس مقصد کیلئے کاروائیاں کیں۔ شروع میں فرانس نے اس میں کردار ادا کیا مگر بعد میں اس سے پیچھے ہٹ گیا اور یورپ کو جرمنی کے ذریعے استحکام دلانے کیلئے کوشش شروع کی۔ برطانیہ نے بھی جو بظاہر یورپی اتحاد کیلئے کوشش کر رہا تھا مندرجہ بالا منصوبوں میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس بنا پر یورپ کا مسئلہ اور اس سے متعلقہ دیگر امور بہت پرانے مسائل میں سے ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ مسئلہ عالمی امن کیلئے سب سے بڑا خطرہ ہے تو یہ فرانس، برطانیہ اور جرمنی، نیز سوویت یونین اور امریکا کے درمیان معاہدے سے پہلے اور بعد کے برتاؤ اور رویے سے آشکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح détente کا دورانیہ ختم ہونے کے بعد اور پھر سوویت یونین اور مشرقی بلاک کے سقوط اور وارسا معاہدہ کے تحلیل ہونے کے بعد اِن کے رویے سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ جب دونوں سپر پاورز کے درمیان معاہدہ نہیں ہوا تھا تو فرانس، برطانیہ اور امریکا مغربی بلاک کی نمائندگی کر رہے تھے اور اس وقت یورپ کا مسئلہ دوسری جنگِ عظیم کے فیصلے کی شکل میں ظاہر تھا۔ اسی طرح مغربی یورپ اور جرمنی کے مستقبل کے بارے میں دونوں گروہوں کے درمیان بحث کی شکل میں یہ مسئلہ آشکار ہوا۔ مغربی بلاک یورپ کو متحد دیکھنا چاہتا تھا تاکہ سوویت یونین کا مقابلہ کرے، جبکہ امریکہ خاص طور پر جرمن عسکریت پسندی کو دوبارہ حرکت میں لانے اور ایسی مضبوط جرمن فوج کی تشکیل میں دلچسپی لے رہا تھا جو سوویت اتحاد کے سامنے کھڑی ہو سکے اور جرمنی، فرانس اور برطانیہ کے درمیان ایک نیا توازن پیدا کر سکے۔ جہاں تک سوویت یونین کی بات ہے تو وہ مشرقی بلاک کی نمائندگی کر رہا تھا اور یورپ، بالخصوص جرمنی کی جانب سے یقینی خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے وہ جرمن یونین اور یورپی یونین کا مخالف تھا۔ اسی طرح یورپی فوج اور اس کی دوبارہ جنگی تیاری کا بھی مخالف تھا۔ روس سرد جنگ، سیاسی اقدامات اور سفارتی سرگرمیوں کے بل بوتے پر کامیاب ہو سکا۔ اور یورپ کو کئی دہائیوں تک اپنے مسئلہ کے حوالے سے ایک قدم بھی آگے بڑھنے نہیں دیا۔

تاہم دونوں سپر پاورز کے وجود میں آنے کے بعد اور خروشیف اور کینڈی کے درمیان معاہدے کی وجہ سے حالات بدل گئے کیونکہ امریکہ اور سوویت یونین کی رائے جرمنی کے مسئلے پر ایک ہوگئی۔ اسی طرح یورپ کے مسئلے کے حوالے سے بھی وہ ایک رائے پر متفق ہوگئے۔ یہ تبدیلی اس ملاقات کے فوراً بعد آشکار ہوئی جب اس وقت کے امریکی صدر جان کینڈی نے اپنے بیان میں کہا "سوویت یونین کے خلاف یورپ کی عسکری جنگ سے اس کی خوف زدگی بجا ہے۔ کیونکہ روس نے دو مرتبہ یورپ کے یلغار کا سامنا کیا، پہلی مرتبہ نپولین کے زمانے میں فرانس نے اس پر حملہ کیا اور دوسری مرتبہ جرمنی نے ہٹلر کے زمانے میں اس پر حملہ کیا، اس لئے سوویت یونین کو اس بات کی ضمانت کی ضرورت ہے کہ اس کیلئے یورپ کی طرف سے خطرہ نہ

ہو، مثلاً وسطی یورپ کو غیر مسلح کیا جائے"۔ اس بیان سے بغیر کسی شک وشبہ کے یہ پتہ چلتا ہے کہ یورپ، بالخصوص جرمنی کے مسئلے پر سوویت یونین اور امریکہ کی رائے ایک ہوگئی۔ جب امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان مفاہمت détente کا دور اختتام کو پہنچا، تب بھی یورپ کے بارے میں امریکی رائے نہیں بدلی اور وہ یہ کہ یورپ کی امریکہ سے آزادی کے جذبات پر ضرب لگائی جائے اور عالمی سیاست میں اس کی شرکت کے عزائم کو کنٹرول کیا جائے اور اسے اپنے سابقہ اثر ورسوخ کے علاقوں کی طرف لوٹنے سے باز رکھا جائے۔ اسی طرح جنوب مشرقی ایشیا اور خلیج کے علاقے سے اس کے اثر ونفوذ کا صفایا کیا جائے اور اس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ نیٹو میں ہوتے ہوئے امریکی چھتری تلے رہے، نیز یورپ کی مخصوص عسکری فوج کی تشکیل کی ہر کوشش کے سامنے رکاوٹ ڈالی جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یورپ نے جب محسوس کیا کہ detente کے بعد جنگ کے خدشات دور ہوگئے ہیں اور اس نے اپنا دم خم بحال کرلیا اور اپنی معیشت مستحکم کرلی، تو اسے عالمی سیاست میں دونوں سپر پاورز کے ساتھ شراکت داری کی تڑپ ہونے لگی اور اپنی سیاست کو امریکہ کے ساتھ ماتحتی کی جگہ برابری اور شراکت داری کی بنیاد پر استوار کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے، بالخصوص برطانیہ اور فرانس نے، اپنے پرانے استعمار کے علاقوں کی طرف لوٹنے پر کام شروع کیا، جس کی وجہ سے امریکہ کو بہت دھیان کے ساتھ یورپ کے نقل وحرکت پر نظر رکھنا پڑی۔ امریکہ نے مشرقی بلاک کے سقوط اور وارسا معاہدہ کی تحلیل سے مشرقی یورپی ریاستوں میں پیدا شدہ خلا کو پُر کرنے میں جلدی کی اور ان سے تعلقات قائم کئے تاکہ یورپی یونین کا راستہ بند کیا جائے، بالخصوص جرمنی کو مشرقی جانب توسیع اختیار کرنے سے روکا جائے۔ اس طرح امریکہ نے نیٹو معاہدے کو برقرار رکھا اور نیٹو سے آزاد یورپی آرمڈ فورس کی تشکیل کی مخالفت کی اور ابھی تک کرتا ہے۔ جہاں تک روس کی بات ہے جو سوویت یونین کا وارث بنا، وہ مشرق میں یورپی یونین کی توسیع کے حوالے سے اپنے خدشات کو چھپاتا نہیں۔ اس لئے اس نے ضمانتوں کے حصول کی کوششیں کیں، لیکن اسے مشرقی یورپ کی دستاویزات پر اتفاقِ رائے کے لیے یورپی یونین کے ساتھ ہم آہنگی کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کیونکہ روس کو سوویت یونین اور مشرقی بلاک کے سقوط سے جنم لینے والی عالمی صورتحال اور امریکہ کے مقابلے میں اپنی کمزوری کا احساس تھا۔ اس نے عالمی سیاست پر اثر انداز ہونے کیلئے بھی بعض یورپی ممالک کے ساتھ ہم

آہنگی کی کوشش کی جس کی وجہ سے اسے یورپی یونین اور یورپ کے ممالک کے بارے میں نرم موقف اپنانا پڑا، جبکہ دوسری عالمی جنگ کے کچھ عرصہ بعد اور detente کے دوران اوراس کے کچھ عرصہ بعد کے حالات ایسے نہیں تھے۔

جہاں تک فرانس کی بات ہے، توڈیگال کو اقتدار ملنے کے بعد جب اس نے اقوام متحدہ کا دورہ کیا اور مارچ 1969 میں نکسن کے ساتھ ملاقات کی، اسی وقت سے فرانس یورپ کی وحدت اور یورپ کو دونوں بلاکوں کے درمیان ایک تیسری قوت کے طور پر لا کھڑا کرنے کیلئے کام کر رہا تھا۔ اسی مقصد کے پیش نظر اس نے جرمنی کو صرف اسی حد تک مضبوط کرنے کیلئے کام کیا کہ وہ فرانس کیلئے خطرہ نہ بنے۔ اس نے یورپی ممالک کے درمیان وفاقی یونین کے قیام کیلئے بھی کام کیا بشرطیکہ فرانس کی خود مختاری متاثر نہ ہو اور حتی الامکان برطانیہ کو یورپ سے دور رکھنے کی جدجہد کی، کیونکہ اسے یہ یقین تھا کہ تاریخ کے آغاز سے یورپ کے لئے برطانیہ کی روایتی پالیسی یہ رہی ہے کہ وہ اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لا کر اس کی وحدت میں رکاوٹ ڈالتا رہا ہے۔ لیکن 1969 میں ڈیگال کے استعفیٰ اوراس کے ایک سال بعد اس کی وفات کے بعد فرانسیسی صدر پامپیڈوPompidou نے برطانوی وزیر اعظم ایڈورڈ ہیتھ کے ساتھ 1971 میں طویل اور جامع مذاکرات کئے جس کے بعد پامپیڈو نے مشترکہ یورپی منڈی میں برطانیہ کی رکنیت پر اتفاق کر لیا۔

فرانس اور جرمنی خصوصیت کے ساتھ ہمیشہ سے یورپ کی مشترکہ خارجہ سیاست تشکیل دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں، بالخصوص جرمنی، جس کو اس مزاحمت کا اندازہ ہے جو اسے جرمن قوت کی شکل میں سامنے آنے کی صورت میں درپیش ہو گی۔ اس لئے وہ فرانس کے ساتھ ہم آہنگی اپنا کر یورپی یونین کے دائرے میں بطور ایک طاقت کے ظاہر ہونے کی کوشش کرتا ہے یوں اس نے اپنے بہت سے خاص اہداف کو بھی حاصل کیا، جیسے مشرق کی جانب توسیع۔ اور ان دونوں ریاستوں کو کامیابی ملی، جبکہ 2003 میں عراق جنگ ہو رہی تھی اور ان دونوں نے جنگ کے خلاف ایک ہی موقف اپنایا، جس کی وجہ سے یورپ کی مشترکہ خارجہ پالیسی کیلئے فرانس اور جرمنی کی قطبیت کے محور (polarisation axis) ہونے کی فضا تیار ہوئی۔ ان دونوں ریاستوں

کی نئے یورپی دستور کی تیاری اور نیٹو سے آزاد یورپ کی مشترکہ فوجی سٹاف کی تشکیل کیلئے کوششوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ یورپ کو عالمی سیاست میں ایک مؤثر عالمی طاقت بنایا جائے۔

جہاں تک برطانیہ کی بات ہے تو detente کے دوران اس نے جرمنی کے ساتھ اپنا رابطہ مضبوط کرنے اور جرمنی کی ترقی اور استحکام کے خلاف امریکہ اور روس کی سازشوں سے جرمنی کو آگاہ رکھنے کیلئے کوشش کی۔ پھر 1971ء میں پومپیڈو اور ایڈورڈ ہیتھ کے درمیان طویل اور ٹھوس ملاقات کے بعد اس نے یورپ کی مشترکہ منڈی میں شمولیت کا فیصلہ کیا، اس کے باوجود کہ برطانیہ میں داخلی سطح پر اس کی شدید مخالفت کی گئی۔ برطانیہ نے سوویت یونین کے سقوط سے پہلے اور بعد میں، دونوں سپر پاورز کا مقابلہ کرنے کیلئے یورپ کے ذریعے طاقت حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر امریکہ کے ساتھ واضح دشمنی کا موقف اختیار نہیں کیا۔ اس کی وجہ حالات کی مجبوری اور ضرورت تھی، کیونکہ یورپ ابھی عالمی قوت بننے کے ابتدائی مراحل میں ہے اور یہ ایک پرخطر راستہ ہے، اور شاید اس میں مطلوبہ کامیابی حاصل نہ ہو سکے، خصوصاً جبکہ امریکہ فرانس اور جرمنی کے مقاصد سے بخوبی آگاہ ہے اور اس کیلئے چوکنا رہتا ہے۔ امریکہ جو عالمی مسابقت میں سب سے زیادہ طاقتور ہے، اس کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ جرمن-فرانس منصوبوں کو ناکام کر دے اور امریکہ یہ کر بھی سکتا ہے اور برطانیہ کی پالیسی آج کل یہ ہے کہ اس کا ایک پاؤں یورپ میں اور دوسرا امریکہ میں ہے اور دونوں اطراف میں سے جس طرف بھی اسے فائدہ نظر آئے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یورپی ممالک بالخصوص بڑی ریاستوں کی اقوام کی یہ متضاد حقیقت ایسی مضبوط یورپی یونین کی تشکیل کے راستے میں رکاوٹ ہے جو عالمی سیاست پر بھی اثرانداز ہوتی ہو۔ اس بات کی تائید ان معلومات سے بھی ہوتی ہے جو اس کتاب کی تیاری کے وقت تک ہمیں موصول ہو چکی ہیں۔ یورپی یونین، جو 25 ریاستوں سے مل کر بنی ہے، نے ڈبلن میں 18 جون 2004 میں منعقد کردہ ملاقات کو یورپی یونین کے لئے صدر کا انتخاب کئے بغیر ہی برخاست کر کے آئندہ کے لیے ملتوی کر دیا۔ لیکن اس سب کے ہوتے ہوئے اور اس کے باوجود کہ یورپی ریاستوں میں قومیت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اور انہوں نے مفاد پرست سرمایہ داریت کو بھی اختیار کیا ہوا ہے، یورپی یونین ایک بڑی اقتصادی طاقت کے طور پر اُبھری جو امریکہ کی معاشی قوت کے ساتھ مقابلہ

کرتی ہے اور یورو ڈالر کے ساتھ عالمی لین دین کے حجم کے برابر مقابلہ کرنے لگا ہے۔ باوجود یہ کہ یورپی یونین کے مفادات مختلف ہیں اور امریکہ یونین کے بعض ممالک بالخصوص مشرقی یورپ، جو یکم مئی 2004 میں یورپی یونین میں شامل ہوئے ہیں، کے ساتھ مضبوط تعلقات قائم کر کے یونین کے اندر سرایت کیا ہوا ہے، یورپی یونین نے بین الاقوامی سیاست میں فعال کردار کی بدولت امریکہ کے اقتصادی منصوبوں کیلئے کسی حد تک پریشانی پیدا کی ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر یورپی یونین آپس میں متحد ہو تو وہ اقتصادی اور سیاسی حوالے سے بلکہ کسی حد تک عسکری سطح پر بھی عالمی اثر و نفوذ میں امریکہ کے ساتھ مزاحمت کے قابل ہو جائے گی۔ لیکن یہ ڈھیلا قسم کا اتحاد ہے جو اس کی قوت میں کمزوری لانے کا باعث ہے، کسی بھی اتحاد کی حقیقت یہی ہوتی ہے کہ اسے وحدت کی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

یورپی یونین ایک معاشی دیو ہے جس سے امریکہ ڈرتا ہے اور اس کی طاقت کو گھٹانے اور سکیڑنے کی پوری کوشش کرتا ہے کیونکہ یورپی یونین ہی معاشی میدان میں اس کی حقیقی مقابل ہے۔ 19 اپریل 2003 کو اے ایف پی نے رپورٹ دی کہ "امریکہ وسیع پیمانے پر یورپی یونین کے سرمایہ پر انحصار کرتا ہے تاکہ کرنٹ اکاؤنٹ کے بڑے خسارے کا توازن برابر کیا جائے جو 2000ء میں 500 ارب ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے، جیسا کہ انٹرنیشنل اکانومک انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر Fred Bergsten نے واضح کیا۔ یہ ادارہ واشنگٹن کا نجی مطالعاتی مرکز ہے"۔ 16 اپریل 2003 میں ایتھنز میں دس ریاستوں نے یورپی یونین کی 15 ریاستوں کے ساتھ اتحاد پر دستخط کئے، جو تقریباً ایک سال کے عرصے یعنی یکم مئی 2004 کو مکمل ہوا، جس کی وجہ سے یورپ دنیا کا سب سے بڑا تجارتی علاقہ بن گیا جو 450 ملین افراد پر مشتمل ہے۔

تاہم سیاسی و عسکری میدان میں یورپ امریکہ کی نسبت کمزور ہے اور امریکہ چند عوامل کی بنیاد پر اس کو کمزور کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

1) نیٹو معاہدہ کو باقی رکھ کر، جس کے بارے میں یہ فرض کیا گیا تھا کہ سوویت یونین کی قیادت میں وارسا معاہدے کے اختتام پر نیٹو کو بھی ختم کیا جائے گا، لیکن امریکہ نیٹو کو اس بہانے برقرار رکھنے پر اصرار کرتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر روس وغیرہ سے یورپی ریاستوں کی حفاظت کی جائے۔ اس طرح امریکہ یورپ پر اپنا تسلط برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ یورپی کمیشن کے سربراہ رومانو پروڈی (Romano prodi) نے 19 اپریل 2003 میں کہا: "یورپی یونین کو چاہئے کہ نیٹو کے اندر اس کی آواز لازمی طور پر سنی جائے، یہ تبھی ہو گا جب ہمارے پاس ایک ایسا معاہدہ ہو گا جو یورپی اور امریکی، دو ستونوں پر کھڑا ہو"۔ اس نے مزید کہا "عام نیٹو کی جگہ، جو صرف امریکہ کا فرمانبردار ہے، یہی حقیقی نیٹو معاہدہ ہو گا"۔ اس نے کہا "ہم یہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں کہ بجٹ کی ذمہ داری تو یورپ کو سونپی جائے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری امریکہ لے لے"۔

2) برطانوی پالیسی یہ نہیں چاہتی کہ برطانیہ یورپی یونین میں بالکل گھل کر رہ جائے اور لکسمبرگ کی طرح کی ایک ریاست بن جائے۔ اس لئے اس کا ایک پاؤں تو یورپی یونین میں ہوتا ہے اور دوسرا امریکہ میں۔ اس طرح اس کے مفادات یورپی یونین کو کمزور کرنے کے نقطے پر امریکہ کے ساتھ ایک ہو جاتے ہیں: برطانیہ چاہتا ہے کہ یورپ کو کمزور رکھا جائے تاکہ یورپ میں اس کا اثر و نفوذ چلتا رہے اور امریکہ چاہتا ہے کہ یورپ کو کمزور رکھا جائے تاکہ یہ ایک متحدہ قوت بن کر امریکہ کے ساتھ مزاحمت نہ کرے۔

3) وہ دس ریاستیں جنہوں نے 16 اپریل 2003 میں یورپی یونین میں شمولیت پر دستخط کیے تھے ان میں اکثریت ان علاقوں کی ہے جن میں امریکہ کا اثر و نفوذ ہے، جیسا کہ 19 اپریل 2003 میں پروڈی نے کہا تھا کہ "امن کے مسائل سے متعلق یورپی یونین کی بعض نئی ریاستوں کے امریکہ کے ساتھ مضبوط تعلقات ہیں"۔

4) تیل کے کنوؤں پر امریکہ کے بڑھتے ہوئے تسلط کی وجہ سے تیل کے محتاج یورپی یونین کے ممالک پر اس کے تسلط میں اضافہ ہوا ہے، جبکہ تیسری دنیا کے حکمرانوں پر بڑھتے ہوئے تسلط کی وجہ سے امریکہ

منافع بخش تجارت کا اجارہ دار بن گیا ہے اور اس کے وسائل کو لوٹ رہا ہے جو یورپی ممالک کو ان مواقع سے محروم کیے ہوئے ہے۔

اس لئے ہم کہتے ہیں کہ یورپی طاقتوں کا توازن بکھرا ہوا ہے، وہاں کسی ایک یورپی طاقت کا وجود شاید ہی ممکن ہو سکے۔ یورپ میں بس کچھ طاقتور ریاستیں ہیں جن کا سرغنہ فرانس ہے جو یورپی ریاستوں کے ساتھ کچھ دیگر ریاستوں کو ملا کر ایک گروہ بنانے کیلئے کوشش کر رہا ہے تا کہ ایک یورپی فورس کی تشکیل عمل میں لائے۔ دوسری طرف برطانیہ ہے جسے طاقتور یورپی گروہ بنانے کی کوئی فکر نہیں، اس کو اگر کوئی فکر ہے تو وہ یہ کہ یورپ میں اس کا اثر ورسوخ قائم ہو۔

اس طرح یورپ کے مسئلے کے باہمی اثرات اور ان ریاستوں کے باہمی بین الاقوامی تعلقات یا ان کے اور امریکہ کے درمیان تعلقات یا دوسرے گرم مسائل کے ساتھ تعلقات، یہ تمام تعلقات بقیہ یورپ کو بھی اہم عالمی مقام دیتے ہیں اور ان کے درمیان طاقت کے توازن میں اختلاف اور مفادات و تعلقات کا ٹکراؤ نام نہاد عالمی امن کیلئے خطرے کا باعث ہے۔

اس بنا پر دیگر پانچ مسائل پر یورپ کے مسئلے کے اثر اور ان کے ساتھ اس کے باہمی عمل اور ان مسائل کے ساتھ یورپ کے مسئلے کے بندھے ہونے سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ اس بنا پر یورپ کے مسئلے کو ایسی نظر سے دیکھنا چاہئے جو اس کی اہمیت اور اس زمانے کی حقیقت کے مطابق ہو، کہ یورپ باہم مدمقابل ریاستیں تھیں، پھر ایک مشترکہ معاشی منڈی میں تبدیل ہو گئے، پھر یورپی یونین کی شکل اختیار کی جو اپنے لئے عالمی سطح پر ایک اہم اور معنی خیز وزن پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آگے جب ہم دوسرے مسائل اور یورپ کا ان کے ساتھ تعلق کا جائزہ لیں گے تو یہ حقائق مزید واضح ہو جائیں گے۔

2 ۔مشرق وسطیٰ کا مسئلہ

اس مسئلے کا تعلق اسلام، مغرب کیلئے اس کے خطرے، اس خطے کے اسٹریٹجک محل وقوع، یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مابین گزرگاہوں پر اس کے کنٹرول، یہودیوں اور مغربی مفادات کے دفاع میں یہودیوں کا صفِ اوّل کا کردار ادا کرنے اور استعمار اور اس کے مادی مفادات بالخصوص تیل کے ساتھ ہے۔ بے شک ایک ایسا مسئلہ جس کا تعلق اسلام، اس کے اسٹریٹجک محل وقوع، یہودی ریاست، استعمار اور تیل کے ساتھ ہو، نہ صرف اہل علاقہ اور مسلمانوں کی نسبت سے، بلکہ پوری دنیا کی نسبت سے انتہائی اہمیت کا حامل مسئلہ ہے۔

جہاں تک اسلام کی بات ہے تو یہ بدستور امریکہ اور مغرب کیلئے بڑا خطرہ ہے۔ اور مشرق وسطیٰ کا خطہ طبعی طور پر دنیا کی طرف دعوتِ اسلام کے حوالے سے نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے، اس لئے اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کہ اشتراکیت کے سقوط کے بعد امریکہ نے اسلام کو اپنا واحد اصلی دشمن قرار دیا اور دہشتگردی، مذہبی انتہا پسندی اور قدامت پسندی کے نعروں کو اس خطے کے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف مہم میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور اس کی ہر ممکن کوشش رہی ہے کہ وہ دباؤ، گرفتاریوں، ٹارچر اور سرگرمیوں کو محدود کرنے جیسے اسالیب کے ذریعے، جنہیں علاقے کی ایجنٹ حکومتیں بروئے کار لاتی ہیں، حکومت واقتدار میں اسلامی سیاسی تحریکوں کے آنے کا راستہ بند کردے۔ بش نے تو مسلمانوں کے خلاف کھلم کھلا نئی صلیبی جنگ کا اعلان کیا۔ امریکی وزیر انصاف John Ashcroft نے کہا "خالص بات یہ ہے کہ دہشتگردی خود اسلام کے اندر چھپی ہوئی ہے، یہ فقط اسلام کے ماننے والوں میں سے کچھ لوگوں کے اندر نہیں"۔ اس نے کہا کہ اللہ خود قرآن کے اندر دہشتگردی پر اُبھارتا ہے (معاذ اللہ)۔

جہاں تک مشرقِ وسطیٰ کے اسٹریٹیجک محل وقوع اور سٹریٹیجک گزرگاہوں پر اس کے کنٹرول کا تعلق ہے، تو یہ تین قدیم براعظموں افریقہ، یورپ اور ایشیا کے درمیان سامان اور خام مال کے نقل وحمل کیلئے ایک چوراہا ہونے کے ساتھ ساتھ آبنائے جبل الطارق، آبنائے باسفورس، خلیج عدن، آبنائے ہرمز، نہر سویز، بحر روم، بحر اسود، بحر احمر اور خلیج پر بھی کنٹرول رکھتا ہے۔

اس کی یہی اسٹریٹیجک اہمیت détente کے وقفے سے پہلے مغربی اور مشرقی دونوں بلاکوں کے درمیان حدِ فاصل بنی ہوئی تھی۔ یہ اس لئے کہ مشرق وسطیٰ سابق سوویت یونین کے خلاف مسلط کردہ فوجی دائرہ کے اندر ایک مغربی پٹی تشکیل دیتا ہے اور یہی پٹی مشرق وسطیٰ اور افریقہ کی سمت سے سوویت یونین کا مقابلہ کرنے میں مغرب کا ہراول دستہ تھی۔ اس لئے مغرب نے مشرق وسطیٰ کے اندر فوجی اڈے قائم کئے، جن میں سے بعض ایٹمی اڈے ہیں۔ مغرب نے مشرق وسطیٰ کے ممالک کو فوجی معاہدات کے ذریعے اپنے ساتھ جوڑنے کی متعدد کوششیں کیں اور وہاں کئی ہوائی اڈے اور بڑی سڑکیں تعمیر کیں، چنانچہ مشرق وسطیٰ اپنی جگہ اسٹریٹجک اہمیت رکھتا تھا۔ جبکہ 1961 میں دونوں سپر پاورز کے معاہدے کے بعد اس کی عسکری اہمیت نہیں رہی۔ اس لئے اس میں عسکری معاہدات کو پس پشت ڈال دیا گیا اور ایٹمی اڈوں کو ہٹادیا گیا، دونوں سپر پاورز برطانیہ کے اڈوں کو ہٹانے میں لگ گئے اور عدن، لیبیا اور نہر سویز کے مشرق میں اڈوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہوگئے، نیز قبرص میں سے اس کے اڈوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ پس اس وقت مشرق وسطیٰ کی وہ اسٹریٹجک اہمیت باقی نہ رہی، مگر سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کے انہدام کے بعد اس کی اسٹریٹجک اہمیت پھر لوٹ کر آئی، بالخصوص روس اور یورپ کے مقابلے میں امریکہ کیلئے اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ اس لئے امریکہ خلیج میں دوبارہ اڈے تعمیر کرنے لگا، اس نے افغانستان و عراق پر قبضہ کیا اور بحرین کے بعد پاکستان اور کویت کے اسٹریٹجک اتحادی ہونے کا اعلان کیا۔

پھر حال ہی میں امریکہ نے اس کو اپنے دفاع کیلئے فرنٹ لائن قرار دیا اور "عظیم مشرق وسطیٰ کا منصوبہ" (The Great ME Plan) کے نام سے اس کیلئے ایک منصوبے کا آغاز کیا اور پھر اس کو "مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ منصوبہ" (The ME and Africa Plan) میں تبدیل کیا اور G8 سربراہی کانفرنس میں پیش کیا جو کہ جون 2004 میں سی لینڈ کے علاقے میں منعقد کی گئی تھی۔

تاہم مشرق وسطیٰ کا اہم محل وقوع، جو مغرب میں مراکش و بحر اوقیانوس سے ہوتے ہوئے مشرق میں خلیج میں ایران اور عراق تک اور شمال میں ترکی سے لے کر جنوب میں افریقہ کے صحرائے اعظم تک پھیلا ہوا ہے، یعنی یہ تمام عرب ممالک بشمول ترکی و ایران کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اس کے محلِ وقوع کی

اہمیت اسے استعماری ریاستوں کا ہدف اور لالچیوں کا مطمح نظر بناتی ہے کیونکہ نقل وحمل اور گزرگاہوں کے حوالے سے نہ صرف اس دور میں بلکہ صلیبی جنگوں سے لے کر موجودہ دور تک اس کی بڑی اہمیت رہی ہے۔

جہاں تک یہودیوں کی بات ہے جنہیں فلسطین میں لا کر بسایا گیا، تو یہ مشرق وسطیٰ کے مسئلے کا محور ہے۔ یہ نہ صرف مشرق وسطیٰ، بلکہ پوری دنیا کیلئے عدم استحکام کا باعث ہے۔ اس کا اعتراف خود یورپ کے لوگوں نے ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے کہ عالم اسلام کے 90 فیصد مسائل جو مغرب کیلئے پریشانی کے باعث ہیں، فلسطین یعنی عالم اسلام کے قلب میں یہودی ریاست کے ناپاک وجود کی وجہ سے ہیں۔

جہاں تک اس کے استعماری پہلو سے اہمیت کا تعلق ہے، تو اسی نے مشرق وسطیٰ کیلئے مسائل پیدا کیے اور اس کو بڑی ریاست اور عالمی طاقت کے مقام سے ہٹادیا اور اسے ایک ایسی مغربی کالونی میں بدل دیا جو استعماری مقاصد اور اثر ونفوذ کے پھیلاؤ کیلئے مغربی ریاستوں کی کشمکش کی آماجگاہ ہو۔ کیونکہ یہاں دنیا کے آدھے سے زیادہ تیل کے ذخائر موجود ہیں اور اُردن، عراق، شام، ترکی، اور ایران وغیرہ میں موجود خام مال کے ذخائر ایک بہت بڑی دولت ہیں جو یورپ اور امریکہ کی مجموعی دولت سے دس گنا زیادہ ہیں۔ اس لئے مشرق وسطیٰ کو کالونی بنانے کیلئے یہ ممالک ایک دوسرے پر سبقت لینے اور اکھاڑ پچھاڑ میں لگے رہتے ہیں، اس پر قبضہ کرنے کیلئے خلیج میں امریکہ کی جنگیں ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

چنانچہ ایک ہی مسئلہ میں ان چار محوروں (اسلام، تیل، اسٹراٹیجک محل وقوع اور اسرائیل) کا اکٹھا ہونا اس مسئلے کو سنگین ترین اور پیچیدہ ترین مسئلہ بنانے کیلئے کافی ہے، بلکہ یہ انتہائی توجہ طلب اور مشکل ترین مسئلہ ہے جس کا ہمہ گیر حل بڑی ریاستوں کی دسترس سے باہر ہے۔ یہ کھٹکنے والا اور پیچیدگیوں میں گھرا ہوا مسئلہ ہے جسے بڑی ریاستیں حل نہیں کر سکتیں، اس کو صرف اسلامی ریاست (خلافت) کے قیام کے ذریعے ہی حل کیا جاسکتا ہے۔

مشرق وسطیٰ اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف تک اسلام کے اثر ورسوخ اور اسلامی ریاست خلافت کے زیر سایہ تھا۔ برلن کانفرنس یعنی اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر سے یورپ کی بڑی ریاستیں اس کے ساتھ

لڑنے کی کوشش کرنے لگیں، پس فرانس، برطانیہ، اٹلی اس پر حملہ آور ہوئے۔ یہ لڑائیاں عثمانی ریاست کے انہدام اور خلافت کو صفحہ ہستی سے مٹا کر اسلامی ریاست کے خاتمے تک مسلسل جاری رہیں۔ چنانچہ مشرق وسطیٰ فرنگی استعمار اور اس کے تسلط اور اثرونفوذ کے نیچے آ گیا۔ برطانیہ کا اثرونفوذ مشرق وسطیٰ کے تمام ریاستوں، حتیٰ کہ ترکی اور افغانستان پر بھی چھایا ہوا تھا، جو اگرچہ کالونیاں نہیں تھیں۔ اس لڑائی میں فرانس کا حصہ تھوڑا تھا جو شام کے شمالی حصے جسے آجکل ملکِ شام کہتے ہیں تک محدود تھا، جبکہ اس کا جنوب مغربی کنارہ لبنان بھی اس کی زد میں تھا۔ یہ حالات دوسری جنگِ عظیم کے اختتام تک جاری رہے، پھر فرانس کو بھگا دیا گیا اور برطانوی استعمار نے اس میں ایک جدید اسلوب کو اپنایا کہ اس کے ٹکڑے کر دینے پر توجہ مرکوز کی اور ہر ایک ٹکڑے کو الگ نام سے موسوم کیا۔ اس لئے عالمی جنگ ختم ہونے کے باوجود مشرق وسطیٰ کو مغربی کالونی سمجھا جاتا رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کو برطانوی کالونی کہنا ہی زیادہ صحیح ہے، اس لئے اس کو آزاد دنیا (فری ورلڈ) اور مغربی بلاک کا ہی حصہ سمجھا جاتا رہا اور اس میں مشرقی بلاک کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ برطانیہ کیلئے مشرق وسطیٰ کو ذاتی کالونی بنانے میں دو عوامل کارگر ثابت ہوئے: ایک فرانس کا سیاسی، اقتصادی اور عالمی سطح پر کمزور ہو جانا، جس کی وجہ سے وہ مشرق وسطیٰ کو کالونی بنانے میں برطانیہ کے ساتھ مزاحمت اور برابری نہیں کر سکا۔ دوسرا عامل: پہلی جنگِ عظیم کے بعد امریکہ کا گوشہ نشینی کی پالیسی اپنائے رکھنے پر اصرار، اس لئے برطانیہ نے مشرق وسطیٰ کو پوری انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف تک بلاشرکتِ غیر کالونی بنائے رکھا۔ لیکن 1950 کے بعد حالات نے پلٹا کھایا، چنانچہ برطانیہ اور امریکہ کے درمیان استعماری کشمکش شروع ہوئی جس کے نتیجے میں یہاں جنگوں، بغاوتوں، داؤپیچ اور سازشوں کا تماشا دیکھا گیا۔ اس کشمکش میں اُتار چڑھاؤ آتا رہا، تا آنکہ امریکہ مشرق وسطیٰ میں اقدام کرنے کے قابل ہوا اور برطانیہ کی کمزوری اس حد تک پہنچی کہ اب اس کیلئے کھل کر امریکہ کا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا تاہم وہ حتی الوسع اپنی کالونیوں کی نگرانی پر ضد کرتا رہا اور اس نے خطے میں اپنی موجودگی کیلئے سر توڑ کوشش کی، اگرچہ یہ موجودگی جزوی ہو، اس طور پر کہ امریکہ کے ساتھ اس کے منصوبوں میں شرکت کرے، جیسا کہ عراق پر قبضے کے دوران ہوا۔

اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ اور برطانیہ کے درمیان کشمکش مشرق وسطیٰ پر کچھ اس طور پر مرکوز تھی:

دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے بعد مشرق وسطیٰ کے مسئلے کے حوالے سے امریکی اور برطانوی پالیسیاں باہمی شراکتی داری سے جاری تھیں، جہاں دونوں ریاستیں مل بیٹھتی اور اپنی پالیسیوں پر مشترکہ غور وحوض کرتیں اور باہمی طور پر منصوبوں اور اسالیب کو چلاتی تھیں۔ برطانیہ امریکہ کو بعض فوائد ہڑپ کرنے کی اجازت دیتا رہا، بالخصوص جزیرہ نمائے عرب کے تیل کے حوالے سے اس کا رویہ امریکہ کے ساتھ یہی رہا اور بعض اوقات اس کی بات مان کر اس کو خوش بھی کرتا، لیکن جب بھی وہ اپنے مفادات کیلئے نقصان محسوس کرتا تو امریکہ کے مقابلے میں آجاتا۔

جب فلسطین میں یہود کا مسئلہ اُٹھا، تو امریکہ کی رائے فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی تھی تاکہ اس کو خطے کو کالونی بنانے کیلئے اسے ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کرے، جبکہ برطانیہ نے اُس زمانے میں یہودی ریاست کے قیام کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا اور وہ فلسطین کو یہودی ریاست کے کنٹرول میں دینے یا وہاں یہودیوں کی حکومت ہونے کے درمیان تذبذب کا شکار تھا۔ وہ اسے باقی عرب ریاستوں کو نوآبادیات بنانے کے ساتھ منسلک کرنا چاہتا تھا، اس لئے قطعی فیصلہ نہیں کیا اور اس مسئلے کو اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا۔ پھر جب اقوام متحدہ نے امریکہ کے دباؤ میں آکر یہودی ریاست کے قیام کا فیصلہ کیا، تو برطانیہ نے چپ سادھ لی اور اس مسئلے کو حالات پر چھوڑ دیا، یعنی یہ خطہ مسلمانوں کے درمیان یہودی ریاست کے وجود کو برداشت کرلے گا یا اسے باہر پھینک دے گا، یہودی ریاست کے حوالے سے اس کی پالیسی مستقبل کے حالات کے انتظار کی بنیاد پر قائم رہی۔

جبکہ امریکہ نے اسرائیل کی شیرازہ بندی اور اس کے ارتکاز میں حائل رکاوٹوں کے خاتمہ کے لئے سخت کوشش کی۔ برطانیہ اندر سے اس کے خلاف تھا، چنانچہ امریکہ اور برطانیہ کے درمیان یہودی ریاست کے قیام پر کشمکش شروع ہوگئی۔

اس کے ساتھ امریکہ نے اردن، شام اور لبنان کے ذریعے بحر روم میں پائپ لائن گزارنے کی کوشش کی تو برطانیہ اس کے مقابلے میں آیا، کیونکہ خطے میں برطانیہ عرصہ قدیم سے موجودگی کے باعث اس قابل تھا کہ وہ اس خطے کے حکمرانوں پر اثرانداز ہو سکے، کیونکہ یہ سب کے سب اس کے ایجنٹ تھے۔ پھر امریکہ کو سوجھ گیا کہ اس خطے کی صورتحال کو تبدیل کرنے کیلئے اسی پالیسی کا نسخہ کارگر ہو گا، جو اس نے جنوبی امریکہ میں آزمایا تھا کہ فوجی حکمرانوں کو لایا جائے اور بغاوتیں برپا کی جائیں، چنانچہ اس نے شام میں حسنی زعیم کے ذریعے پہلی بغاوت برپا کی، اس نے امریکہ کو تیل کے پائپ لائن بچھانے کی اجازت دی، امریکہ نے لائن بچھائی اور اس طرح اس مسئلے پر قابو پالیا، لیکن برطانیہ کو جب علم ہوا کہ امریکہ خطے کو کالونی بنانا اور اس کے ہاتھوں سے نکالنا چاہتا ہے تو اس نے سیاسی اسالیب، پینترے بازی اور عوام کے ذریعے سخت مقابلہ شروع کیا۔

حسنی زعیم کے انقلاب اور برطانیہ کی طرف سے امریکہ کے تمام منصوبوں کی مخالفت اور ان کے درمیان جاری خفیہ جنگ کے اعلانیہ کشمکش کے قریب پہنچ جانے کے بعد مشرق وسطیٰ میں موجود امریکی سفارتکاروں نے خطے میں امریکہ کی عسکری واقتصادی مفادات کیلئے خطرہ محسوس کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ امریکی پالیسیوں کا برطانوی پالیسیوں کے پہلو بہ پہلو چلنا، امریکہ کے دوسری جنگ عظیم سے پہلے والی حالات پر باقی رہنے کے مترادف ہے، جب وہ برطانیہ کا ایک آلہ کار تھا جو خطے میں اس کے بقاء اور دفاع کیلئے اسے چھوٹا سا لقمہ تو دیتا تھا، مگر اس کو تمام وسائل سے محروم رکھ کر خطے کا اکلوتا مالک بنا بیٹھا رہتا تھا۔ عرب گروپ میں امریکہ کے معتمد سفارتکاروں نے جب اس صورتحال کو دیکھا، تو انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ واشنگٹن کی پالیسیوں میں بنیادی ترمیمات کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی جدید تشکیل ضروری ہے۔ یوں کہ ان پالیسییوں کی تکمیل اور فروغ کیلئے خطے کے لوگوں سے تعاون کے حصول کو اساس بنایا جائے۔ مگر انہوں نے دیکھا کہ انہیں ڈھیروں مسائل کا سامنا ہے اور پھر اسرائیل کے قیام کا مسئلہ بھی درپیش ہے۔ انہیں اس غیظ وغضب کا بھی اندازہ تھا جو مسلمانوں کے دلوں میں اسرائیل کے خلاف پوشیدہ تھا۔ اس لئے انہوں نے سنجیدہ غوروفکر سے قبل اور خطے کو برطانوی اڈے سے امریکی اڈے میں تبدیل کرنے کے آغاز سے پہلے ان مسائل سے نمٹنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ انہوں نے اس موضوع پر بحث کرنے کیلئے ایک کانفرنس کے انعقاد کی دعوت دی۔

پس نومبر 1950 میں استنبول میں پہلی کانفرنس منعقد کی گئی، اس کانفرنس کی صدارت مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے امور کے لیے امریکی وزارتِ خارجہ کے نمائندے مسٹر جارج میگی Mr George Magi نے کی۔ یہ کانفرنس مسلسل پانچ دن جاری رہی۔ اس خفیہ کانفرنس میں انہوں نے خطے کے انتہائی اہم سیاسی، اسٹریٹجک اور اقتصادی مسائل پر بحث کی۔ اس بحث کے نتیجے میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر امریکہ واقعی مشرق وسطیٰ کو امریکی بنیادوں پر لانا چاہتا ہے تو امریکی پالیسیوں کا برطانوی پالیسیوں کے ساتھ جڑے رہنے کا کوئی جواز نہیں، نیز خطے کو تبدیل کرنے کے لیے امریکہ کو خطے کے لوگوں کے ساتھ تعاون کو ایک اسلوب کے طور پر اپنانا ہو گا۔ کانفرنس میں شامل شخصیات نے صدر جمہوریہ شام شُکری قوتلی کے پائپ لائنز کی اجازت دینے سے انکار اور پھر حسنی زعیم کے ذریعے بغاوت کر کے اس کی اجازت حاصل کرنے کو اپنی رائے کے صحیح ہونے کے لیے دلیل بنایا، بالخصوص جبکہ انگریز نے اسی سال یعنی 1949 میں دوبارہ آکر حناوی کے ذریعے بغاوت کروادی اور حسنی زعیم کو ہٹادیا۔ اس طرح شام دوبارا انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ یہ بھی ان کی اس رائے کی تائید کرتا تھا کہ اگر امریکہ خطے میں کچھ کرنا چاہتا ہے تو امریکی پالیسی کا برطانوی پالیسی سے الگ ہونا ضروری ہے۔ اس کانفرنس کو عرب خطے میں امریکی سیاست کی سمت متعین کرنے کیلئے اہم آلہ تصور کیا جاتا ہے۔ کانفرنس نے وائٹ ہاوس، امریکی وزارت خارجہ، پینٹاگان اور بحریہ سب کو سفارشات پیش کیں اور ان سفارشات سے پہلے ایک اہم ابتدائیہ پیش کیا گیا جو مندرجہ ذیل ہے:

دوسری تازہ عالمی جنگ کے تجربے نے ثابت کیا کہ مشرق وسطیٰ ایک بنیادی اساس ہے جو سوویت یونین کے خلاف طبل جنگ بجانے کے لیے کافی ضروری عناصر پر مشتمل ہے، نیز قفقاز Caucasia میں موجود روسی تیل کے کنوؤں پر دھاوا بولنے کی سوچ میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں اور سوویت جنگی مشینری کو اس کے تیل کے بیش بہا آمدنیوں سے محروم کرنے کیلئے صرف ترکی کے ساتھ فوجی تعاون کے ذریعے کامیابی کے امکانات بھی بہت کم ہیں، چنانچہ اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ شام، لبنان اور فلسطین میں منظم جنگی ہوائی اڈے قائم کئے جائیں، اور کاکیشیا اور باقو میں سوویت تیل کے ذخائر کو گھیرنے اور سبوتاژ کرنے کے کسی بھی اقدام کے

لیے عراق اور مصر کو بڑے ڈپو میں تبدیل کیا جائے، جہاں سے اس کام کے لیے اسلحہ، افراد اور رسد کی تسلی بخش ترسیل ہو سکے۔

علاوہ ازیں 1941 سے لے کر 1944 تک کے تمام عرصے میں یونان، صقلیہ (سسلی) اور اٹلی پر فوج کشی نے اس قسم کی فیصلہ کن جنگی کاروائیوں کی مدد اور راشن کی فراہمی کے حوالے سے مشرق وسطیٰ کی اہمیت بہت واضح کر دی۔ اس قسم کی کاروائیاں جنگ میں اتحادی طاقتوں کی کامیابی اور دشمن افواج کو یورپی قلعہ میں بند رکھنے کی ضمانت تھیں۔

یہ تمہید چند ایسی سفارشات کے ساتھ ختم ہوتی ہے جو کانفرنس میں شریک تمام مندوبین کے اتفاق سے پیش کی گئیں، جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

پہلا: عالم عرب اور امریکہ کے درمیان تمام زیرالتواء مسائل میں برطانوی پالیسیوں سے الگ ہوا جائے۔

دوسرا: عربوں کے قومی مطالبات کی تائید کو مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسیوں کے لئے بنیاد بنایا جائے۔

تیسرا: مصر کے برطانیہ سے مطالبات کو پشت پناہی فراہم کی جائے اور اسی طرح کی تحریکوں کی عراق میں بھی حوصلہ افزائی کی جائے۔

چوتھا: اسرائیل کی مسلسل سفارتی اور اقتصادی پشت پناہی سے ہاتھ کھینچ لیا جائے اور اقوام متحدہ کی فلسطین کی دو ریاستی تقسیم کی اسکیم پر عمل درآمد کی حوصلہ افزائی کی جائے یعنی عرب اور اسرائیلی ریاستوں کے قیام کیلئے، اور عرب پناہ گزینوں کے مسئلے کے حل سے متعلق عالمی سلامتی کونسل کے قراردادوں کو نافذ کیا جائے، جس کیلئے بنیاد یہ ہو کہ وہ اپنے گھروں کو لوٹ جائیں اور ان لوگوں کو معاوضہ دیا جائے جو واپسی کے خواہشمند نہیں ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مصر کے بارے میں خاص طور پر سفارش پیش کی، وہ یہ کہ برطانیہ کو مصر سے نکال کر مصر کو حاصل کر لینا امریکہ کیلئے ضروری ہے اور یہ کہ مصر میں ایک ایسی مضبوط حکومت قائم کی جائے جو پورے خطے کی قیادت کی ذمہ داری سنبھالے، کیونکہ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ مصر مشرق وسطیٰ کا دروازہ ہے۔

یہ تجاویز امریکہ میں حکمران اتھارٹی کے سامنے پیش کی گئیں۔ اس وقت امریکہ میں ڈیموکریٹک پارٹی برسر اقتدار تھی جو عادۃً انگریزوں کی چاپلوسی کیا کرتی تھی اور اس وقت ٹرومین Truman امریکہ کا صدر تھا۔ اس نے دو عوامل کے بل بوتے پر اقتدار حاصل کیا تھا؛ ایک یہودی اثر و نفوذ، دوسرا بعض امریکی حلقوں میں برطانوی اثر و رسوخ۔ اس کے ساتھ ٹرومین نے برطانیہ اور یہودیوں کی بہت سی ذمہ داریوں کو اپنے سر لیا ہوا تھا۔ اس لئے ان قراردادوں کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی امید ان سفارتکاروں کو تھی، البتہ آئزن ہاور کے زمانہ اقتدار میں انہیں اہمیت حاصل ہوئی۔

بہر حال امریکی سیاست نے مشرق وسطیٰ میں سفارتکاروں کی مذکورہ کانفرنس کے بعد سرگرمی دکھائی، چنانچہ امریکہ نے عرب ممالک اور اسرائیل کے درمیان صلح اور اُردن و عراق سے برطانیہ کو نکالنے کے لیے جرأتمندانہ اقدامات کیے۔ اس کیلئے امریکی سفارتکاروں نے شاہ عبداللہ کے ساتھ رابطہ کیا اور ایک معاہدہ طے کرنے کیلئے اس سے مذاکرات کئے۔ ان مذاکرات کا خلاصہ یہ ہے کہ شاہ عبداللہ برطانیہ کو چھوڑ کر امریکہ کے ساتھ چلے اور یہ کہ اسرائیل کے ساتھ صلح کے بدلے امریکہ اس کو عراق اور حجاز کو ضم کرنے کی کھلی چھوٹ دے گا۔ یوں اردن، عراق اور حجاز پر مشتمل ایک ریاست تشکیل دے گا، پھر اس کے ساتھ شام اور لبنان کو ضم کر دے گا اور یہ کہ امریکہ اس نئی ریاست کو قرضے اور ضروری امداد فراہم کرے گا، تاکہ اس کو اقتصادی طور پر بحال کیا جائے۔ شاہ عبداللہ نے اس پر اتفاق کیا اور اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے متحرک ہوا۔ چنانچہ وہ عراق گیا اور وہاں عبدالاِلٰہ اور نوری سعید کے ساتھ ملاقات کی، ان کے ساتھ اس موضوع کے حوالے سے بات چیت کی اور ساتھ دینے کا مطالبہ رکھا، تاہم ان دونوں نے بغداد میں برطانیہ کے سفیر کے ساتھ فوراً رابطہ کیا اور اس کو شاہ عبداللہ کے منصوبوں سے آگاہ کر دیا۔ برطانیہ نے ان کو شاہ کا ساتھ دینے سے منع کیا،

اس لئے انہوں نے شاہ کی پیش کش قبول نہیں کی اور اسے روکا بھی نہیں، اور اس معاملے کو التوا میں رکھا، پھر شاہ عبداللہ اُردن لوٹ آیا اور ریاض الصلح (لبنان کے وزیر اعظم) کو ساتھ دینے اور اس منصوبے میں معاونت کا پیغام بھیجا، ریاض الصلح نے اس پیش کش کو قبول کیا، اور ایسا لگتا تھا کہ وہ پہلے ہی امریکیوں کی طرف ہو گیا تھا۔ پھر انگریز نے ریاض الصلح کو عمان میں اس وقت قتل کر دیا جب وہ بیروت واپسی کیلئے ائیر پورٹ جارہا تھا۔ پھر ایک ہفتہ بعد شاہ عبد اللہ کو القدس مسجد اقصیٰ میں قتل کر دیا گیا۔ یہ اس سازش کے نتیجے میں ہوا جسے گلوب Globنے پلان کیا تھا۔ قتل سے ایک دن قبل امریکی سفیر نے شاہ کو واضح طور پر اس سازش کے بارے میں متنبہ کیا تھا اور سفر کرنے سے احتیاط کرنے کا کہا تھا۔ یوں مشرقِ وسطیٰ کے متعلق یہ امریکی منصوبہ دفن ہو گیا۔ اسی سال یعنی 1952 میں امریکا میں صدارتی انتخابات ہوئے جن میں ری پبلکن پارٹی نے کامیابی حاصل کی اور آئزن ہاور امریکہ کا صدر منتخب ہوا۔ 1953 کے آغاز میں اس کی ذمہ داری سنبھالتے ہی برطانیہ اور امریکہ کے درمیان کشمکش شدید ہو گئی، کیونکہ آئزن ہاور عسکری اور عالمی ساخت میں امریکہ کے اعلیٰ مفاد کو یہودی اور برطانوی دباؤ پر فوقیت و ترجیح دینے کیلئے مشہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کے درمیان تناؤ میں شدت آئی اور اس کا بڑا اہم مظاہرہ اس طور پر ہوا کہ امریکہ نے برطانیہ سے مصر کو چھین لیا اور اس کو وہاں سے نکال دیا۔ اس سے پہلے امریکہ نے شام میں بغاوت کروا کے اپنے ایجنٹ ادیب الشیشکلی کو اقتدار دلایا تھا۔ اس طرح مصر اور شام امریکہ کے ساتھ ہو گئے۔ اُسی وقت سے عرب ممالک برطانوی -امریکی (anglo-american) کشمکش کا کھلا میدان بن گئے اور اس خطے میں کئی ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے ان ممالک کی حیثیت ایک گیند کی سی ہو گئی، جو کبھی امریکہ کے ہاتھ میں آجاتا تھا، تو کبھی برطانیہ کے ہاتھ میں۔ یہ سلسلہ جاری رہا، اور اس نے مصر، شام، اردن، عراق، سعودی عرب اور یمن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، جبکہ اکثر کاروائیاں شام میں کی گئیں، کیونکہ شام ہی اس خطے کا دل ہے، اور تمام عرب ممالک عمومی طور پر شام سے متاثر ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شام میں متعدد سیاسی کاروائیاں وقوع پذیر ہوئیں، جن میں فوجی بغاوتوں کی کثرت مشہور ترین ہے، چنانچہ حسنی زعیم کے قتل ہوتے ہی پتہ چلا کہ انگریز کو اس سے خار ہو گئی تھی، اس لئے اس کی حکومت ختم ہوئی، تا آنکہ برطانیہ نے شام میں جمہوری بنیادوں پر اقتدار کے استحکام کیلئے کام شروع کیا

اور زرخیز پٹی کی تشکیل کیلئے اسے عراق کے ساتھ ضم کرنے کیلئے کام کیا۔ شام میں انتخابات ہوئے اور ملک کا دستور بنایا گیا، عوامی پارٹی اور وطن پارٹی نے اقتدار سنبھالا، انہوں نے اپنے پروگرام میں عراق کے ساتھ اتحاد کے ارادے کا اعلان کیا۔ امریکہ نے برطانیہ کی کوششوں کو ناکام بنانے کی کوشش کی، لیکن اس کا موقع اسے نہیں ملا، یہاں تک کہ ادیب الشیشکلی نے اقتدار حاصل کیا، جس نے سب سے پہلے پس پردہ کنٹرول حاصل کیا، پھر اعلانیہ طور پر اپنے آپ کو جمہوریہ کا صدر بنا کر تسلط حاصل کر لیا۔ چنانچہ شام امریکہ کے ہاتھوں میں چلا گیا اور فروری 1954 تک اس کے ہاتھوں میں ہی رہا۔ تب انگریز ایجنٹوں نے عراق کے تعاون سے الشیشکلی کو ہٹا دیا، اس طرح شام انگریز کے ہاتھوں میں چلا گیا اور پارلیمانی حکمرانی پھر لوٹ آئی۔ ان اوقات میں برطانیہ نے بغداد معاہدے کو علاقے میں فروغ دینا شروع کیا اور 1955 کے آتے ہی یہ خطہ ایک بار پھر شدید اور زبردست برطانوی امریکی (anglo-american) کشمکش سے دوچار ہوا۔ امریکہ نے مصر کو آزادی، وحدت اور سوشلزم کا کھیل کھیلنے کیلئے استعمال کرنا شروع کیا، عبدالناصر امریکہ کی خاطر برطانیہ کے خلاف شدید کشمکش میں کود پڑا۔ چنانچہ امریکہ کی ہدایت پر اس نے سوشلسٹ بلاک سے اسلحے کی بہت بڑی مقدار کا سودا کیا اور قوم کو یہ بتایا کہ وہ یہ اسلحہ اسرائیل کے ساتھ لڑنے اور ان کا خاتمہ کرنے کیلئے لایا ہے، عرب لوگوں میں اس سے بہت ولولہ پیدا ہوا اور پھر اس نے عرب قومیت کا نعرہ لگاتے ہوئے اعلان کیا کہ مصر عرب ریاست ہے اور ریاستِ مصر کے دستور میں بھی اس کو تحریر کیا گیا، اس نے اجتماعی عدل اور وحدت کی دعوت بھی دی، اس کے ان کاموں کی وجہ سے عرب لوگ اس کے گرد اکٹھا ہونا شروع ہو گئے، اس طرح اس کا شمار عرب ممالک کے قائدین میں ہونے لگا۔ یہ سب کچھ امریکہ نے برطانوی مفادات پر حملے کرنے اور لوگوں کے درمیان کنفیوژن پھیلانے کے اسلوب کو اختیار کر کے حاصل کیا، چنانچہ باوجود یہ کہ امریکہ اور روس (سوویت یونین) کے درمیان تلخ دشمنی تھی، امریکہ نے روس کو اس خطے کی طرف متوجہ کرنے کے وسائل استعمال کئے اور خطے میں اس کو ایک بین الاقوامی عنصر بنایا، اور یوں روس کو برطانیہ کے خلاف ایک عالمی عامل کے طور پر استعمال کیا۔ اور باوجود یہ کہ امریکہ سوشلزم کا مخالف ہے، اس نے جمال عبدالناصر کو جو حاکم مصر تھا، سوشلزم اور اس کی طرف بلانے پر قائل کر لیا۔ چنانچہ سوشلسٹ بلاک سے مصر کی اسلحے کی خریداری روس (سوویت یونین) کی خطے میں مداخلت کا باعث بنی اور

عبدالناصر نے قومیت کا نعرہ لگا کر عرب قومیت کو زندہ کیا، حالانکہ یہ تصور ناپید ہو چکا تھا، یا ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس نے عدل اجتماعی سے وجود پانے والی اشتراکیت کو اختیار کیا جس کی وجہ سے بائیں بازو کی سیاست کو فروغ ملا، جو خطے میں رائے عامہ پر حاوی ہو۔ پھر مصر نے غیر ملکی معاہدات کو ہدفِ تنقید بنایا، بالخصوص بغداد معاہدے کو، جس نے عبدالناصر کے امریکی ایجنٹ ہونے کے شبہے کو دور کرنے میں بڑا اثر دکھایا، بالخصوص جبکہ وہ امریکی استعمار پر تنقید کر رہا تھا، اس لئے تمام عرب لوگوں کو اس میں ذرابرابر شک نہ رہا کہ جمال عبدالناصر ہی وہ بڑا نجات دہندہ ہے جسے اللہ نے اس امت کو استعمار کی چنگل سے نجات دلانے کے لئے بھیجا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سب لوگ اس کے حامی بن گئے، ماسوائے ایک گروہ کے، جو اس کو بے نقاب اور اس پر تنقید کر رہا تھا، مگر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا، اس طرح جمال عبدالناصر نے مکمل طور پر رائے عامہ پر تسلط حاصل کر لیا۔ اس تسلط کی بنیاد پر اُردن اور عراق میں انگریز کے ایجنٹ، حکمران ہونے کے باوجود، غیر مستحکم ہو گئے اور شام ولبنان میں انگریز ایجنٹوں کی عوامی سطح پر پذیرائی ختم ہو گئی۔ نتیجتاً امریکہ کو انگریز کو نکال باہر کرنے کیلئے خوش کن اور حیرت انگیز قسم کا موقع مل گیا جبکہ خطے کے لوگ یہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ جو کاروائیاں سرانجام دی جا رہی ہیں، وہ دراصل خطے میں برطانیہ کی جگہ امریکی اثر ونفوذ اور عمل دخل کی راہ ہموار کرنے کیلئے ہیں۔ حالانکہ خطے کیلئے ضروری تھا کہ دونوں ریاستوں، امریکہ اور برطانیہ کی استعماریت کو نکال باہر کرنے کیلئے کام کرے، نہ کہ ایک کے بدلے دوسرے کو لایا جائے۔

اسی زمانے میں شام میں کچھ اندرونی تبدیلیاں آئیں عوام کی طرف سے جن کی حمایت اور حوصلہ افزائی کی بدولت عبدالناصر نے مؤثر کردار ادا کیا۔ بعث پارٹی کا عرب سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ اتحاد ہو گیا۔ اس اتحاد کی وجہ سے فوج میں بعث پارٹی کو جگہ ملی۔ پھر دونوں پارٹیوں نے (آزادی، وحدت، سوشلزم) کا نعرہ بلند کیا۔ اس طرح یہ حکومت پر اثر انداز ہوئے بلکہ عملی طور پر بھی حکومت میں شرکت اختیار کی اوران دونوں پارٹیوں کو عبدالناصر اوراس کی دعوت کے حق میں لوگوں کی حمایت حاصل کرنے اوروحدت اور سوشلزم کی جانب واضح قدم اُٹھانے کا موقع ملا جو ان کا مقصد تھا۔ اس بناپر شام ایسی حکومتوں کا محکوم ہو گیا جن پر بعث پارٹی کو ایک تو اس لئے تسلط دیا گیا تھا تاکہ یہ حکومتیں پارٹی کے شر سے محفوظ رہیں۔ دوسرا حکومتیں لوگوں کے اندر

اس کی وہمانہ مقبولیت سے خائف رہتی تھی۔ اس لئے شام اگرچہ حقیقت میں برطانیہ کے ساتھ تھا، لیکن اس پر سوشلزم اور وحدت کی فکر کا تسلط تھا، کیونکہ دونوں فکریں رائے عامہ پر اثرات رکھتی تھیں۔ پھر عبدالناصر نے سوویز کنال کو قومی تحویل (nationalize)میں لے لیا جس کے نتیجے میں مصر سہ فریقی دشمنی کے زد میں آیا، جس کی بدولت عبدالناصر کی شہرت اور مقبولیت کو چار چاند لگ گئے۔ اس لئے انگریز کے ایجنٹ اسٹیج پر نمودار ہونے کی جرأت نہ کرسکے اوران کی آوازیں اس حد تک دب گئیں کہ کسی کو ان کے بارے میں احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

اگست 1957 میں کچھ افسروں نے ملاقات کی اور شام میں حکومت کے مغرب نواز رویے اوراس کے اندر مغربی اثرونفوذ کی سرائیت پر بحث کی،اور انہوں نے اقتدار پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا،اس طور پر کہ حکومت موجود رہے یعنی صدر جمہوریہ اوروزراء اپنے اپنے عہدوں پر برقرار رہیں جبکہ فوجی افسر امورِ حکومت چلائیں۔ انہوں نے مغربی استعمار سے شام کا تعلق توڑدیا، جو اس جدائی سے پہلے انگریزوں کے ہاتھوں میں تھا، مگر بظاہر اس کو امریکہ کے ساتھ مربوط سمجھا جاتا تھا کیونکہ وہاں غالب افکار وہ تھے جن کا نعرہ عبدالناصر نے بلند کیا، یعنی آزادی، اشتراکیت اوروحدت۔ اور بعث پارٹی نے، جس کی بات کو رائے عامہ میں اولیت دی جاتی تھی، ایسا ظاہر کر رکھا تھا کہ جیسا کہ وہ عبدالناصر کی دوست یا حلیف ہے۔ اس لئے مغرب سے شام کی علیحدگی کو امریکہ کے خلاف اقدام سمجھا گیا، اگرچہ درحقیقت یہ امریکہ سے زیادہ انگریزوں کے خلاف تھا۔ اس کے باوجود انگریز نے اس جدائی کا خاموشی کے ساتھ مقابلہ کیا اور کچھ نہیں کیا، جبکہ امریکہ غصے سے پاگل ہوگیا اورافسروں کو نشانہ بنانے اور شام کو مغربی عملداری میں لوٹانے کیلئے بے تاب ہوگیا۔ اس کیلئے متعدد کوششیں کی گئیں، جو سب کی سب ناکام ہوگئیں۔ جب امریکہ اس مسئلے کے ساتھ نبٹنے سے عاجز ہوگیا، توعبدالناصر اس کے حل کیلئے آگے آیا،اس نے محمود ریاض کو شام بھیجا، جہاں اس نے مصر اور شام کے درمیان اتحاد بنانے کیلئے کوشش شروع کی، جس کے ذریعے مصر شام میں حکومت کو کنٹرول کرے۔ اس طرح امریکہ نے شام کی بھاگ ڈور پر قبضہ کرلیااور عراق ولبنان سے برطانیہ کو نکالنے کے لئے کام شروع کیا۔ 1958 کے آتے ہی لبنان میں انقلاب آیا، جس کے بعد عراق میں انقلاب آیا، نتیجتاً شام، عراق، لبنان اور مصر سب امریکہ کے ہاتھ میں آگئے اور صرف

اُردن انگریزوں کیلئے بچا۔ عبد الناصر نے اردن میں بھی اس کا پیچھا کیا اور برطانیہ کا پورے خطے سے صفایا ہونے والا ہی تھا، مگر برطانیہ ناامید نہیں ہوا اور خطے میں اپنے اڈے یعنی اُردن کے ذریعے کام کرنے لگا۔ 1961 کے آتے ہی شام میں سرگرم کچھ قوتیں اس کے ساتھ مل گئیں، اس نے تمام سیاسی قوتوں، عوامی پارٹی، بعث پارٹی (بعث اور عرب سوشلسٹ پارٹیوں) کو عبد الناصر اور وحدت کے خلاف متحد کیا۔ اس کے نتیجے میں شام مصر سے الگ ہو گیا اور انگریز ایجنٹوں کو شام میں پھر حکومت پر تسلط حاصل ہو گیا۔ ادھر عبد الکریم قاسم نے جب امریکہ کی ایجنٹی کو چھوڑا اور کمیونسٹوں کے ساتھ کام کرنے لگ گیا، تو امریکہ نے عراق میں اس کو اقتدار سے برطرف کر دیا۔ اس کے نتیجے میں عراق میں ایک ایسی امریکی حکومت وجود میں آئی جس کی سرپرستی بعث پارٹی کیا کرتی تھی، جس نے شام واُردن کو عراق کے ساتھ ضم کرنے کیلئے حالات تبدیل کرنے پر کام شروع کیا، جس سے برطانیہ کو خوف لاحق ہوا۔ ادھر دمشق میں برطانیہ کے ایجنٹوں نے ایک جعلی بغاوت کی اور بعث پارٹی کے پردے میں رہ کر حکومت کرنے لگے۔ مگر 1971 میں جب حافظ الاسد مصر چلا گیا اور چار ملکی اتحاد میں داخل ہو گیا تو مصر سے بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ شام آیا، کیونکہ وہاں اسے اس بات کا اطمینان دلایا گیا کہ وہ علوی نصیری ہونے کے باوجود، شام عرب جمہوریہ کا صدر بن سکتا ہے۔ اس وقت یہ دکھائی دیتا تھا کہ اس کے پیچھے امریکہ ہے اور جب تک وہ اس کا ساتھ دیگا امریکہ اس کو سہارا دیتا رہے گا اور مصر میں اپنی پارٹی کے ذریعے شام میں اس کی تائید کروائے گا؛ اور مصر، جس کے پیچھے امریکہ کھڑا تھا، حافظ الاسد کے جمہوریہ شام کے صدر بننے میں حائل رکاوٹوں کا ازالہ کرے گا۔ یہ رکاوٹیں اس کے علوی ہونے کی وجہ سے تھیں، کیونکہ شام کے لوگ اپنی قیادت ایک مسلمان کے بجائے کسی علوی کو دینے کو قبول نہ کرتے۔ اس طرح امریکہ نے حافظ الاسد کیلئے معاملات سنوارے اور اس کی مشکلات ختم کیں اور یہ تب ہی ہوا جب اس نے امریکہ کے ساتھ چلنے پر اتفاق کیا اور پھر اس ارادے کو عملی جامہ پہنایا جانے لگا۔ چنانچہ حافظ الاسد نے جمہوریہ کا صدر بننے کیلئے مرحلہ وار کام شروع کیا، اس نے شمال کا دورہ کیا اور وہاں عوامی رابطہ شروع کیا۔ جب اس نے دیکھا کہ قوم حکمران کا ساتھ دیتی ہے اور بظاہر کوئی مخالفت موجود نہیں، تب اس نے اس کیلئے عملی اقدامات کئے، اس طرح اسے جمہوریہ عربیہ شام کے منصبِ صدارت کیلئے نامزد کیا گیا اور 12 مارچ 1971 کا دن ریفرنڈم کیلئے مقرر کیا گیا۔

یوں حافظ الاسد جمہوریہ کا صدر بن گیا اور شام ایک بار پھر امریکہ کی چنگل میں آ گیا، اور تاحال امریکہ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

یہ شام میں برطانیہ امریکہ کشمکش کی چند مثالیں ہیں اور یہ اس کشمکش کے مشہور مواقع ہیں۔ باقی عرب ممالک کا جہاں تک تعلق ہے تو اُردن انگریز کے تسلط کے نیچے رہا، کیونکہ وہاں کی دو تہائی عوام فلسطینی ہیں، جن کی اکثریت اقوام متحدہ کے راشن اور اُردن سے باہر کام کرنے والے بیٹوں کی کمائیوں پر انحصار کرتی ہے اور تہائی حصہ مشرقی اُردن کے بدو ہیں، جن میں سے کئی فوج میں بھرتی اپنے بیٹوں کی کمائی پر گزارا کرتے ہیں۔ اس لئے امریکہ کو اُردن میں وہ زرخیز زمین نہیں ملی جو اسے شام میں ملی، اس لئے اُردن میں کوئی ایسی سیاسی سرگرمی رونما نہیں ہوئی جو عالمی کشمکش کی مظہر ہو۔ ہاں بغداد معاہدے کے خلاف کچھ مظاہرے ہوئے اور شاہ حسین کی وہ جعلی بغاوت، جو اس نے 1957 میں ملک سے عبدالناصر کے ایجنٹوں کو نکالنے کیلئے کی تھی۔ اس لئے اردن کو اس نظر سے نہیں دیکھا جاتا کہ اس میں کشمکش سے متعلق بڑی سیاسی کاروائیاں واقع ہوئیں، اگرچہ یہ ان اہم علاقوں میں سے ہے، جہاں امریکہ اور برطانیہ کے درمیان کشمکش ہوتی رہتی ہے کیونکہ اس کی زمین تلے اور اس کے بُحَیرہ مردار کے پانیوں تلے حیرت انگیز خزانے موجود ہیں۔

جہاں تک عراق کی بات ہے، تو باوجود یکہ عبدالسلام عارف، جو بعثیوں کا جانشین ہوا، عبدالناصر کا ساتھ دیتا تھا مگر سیاستدانوں اور فوجی افسروں میں سے انگریز کے ایجنٹوں کو حرکت میں آنے کا موقع مل گیا اور انہوں نے معمولی جدوجہد کے ذریعے فوج اور اقتصادی صلاحیتوں پر تسلط حاصل کر لیا۔ اس طرح عراق انگریز کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ پھر امریکہ نے عبدالرحمٰن عارف کے زمانہ میں عراق پر دوبارا تسلط حاصل کر لیا تھا، مگر بعثیوں اور دیگر انگریز ایجنٹوں نے 1968 میں اقتدار پر قبضہ کر لیا، انگریز کا یہ اثر و نفوذ عراق میں 09 اپریل 2003 کو سقوطِ بغداد اور صدام حکومت و بعث پارٹی کے اقتدار کے خاتمے تک جاری رہا۔ اس کے بعد عراق امریکی قبضے میں چلا گیا۔

جہاں تک مصر کی بات ہے تو جب سے عبد الناصر نے اس کا اقتدار سنبھالا، تب سے یہ امریکہ کا سب سے بڑا اڈا بن گیا اور آج تک یہ اہم امریکی اڈا ہے۔ اس میں اب (2004) تک کوئی اہم سیاسی اعمال نہیں ہوئے ہیں، سوائے اس کے جو عبد الناصر کے مرنے کے کچھ دیر بعد ہوا، اس وقت وہاں تین ایسے عناصر پائے گئے کہ مصر کو برطانیہ کے ہاتھ میں واپس لوٹا سکتے تھے:

پہلا: اس میں ایسی کمزور حکومت قائم ہوئی جو خود اپنی حفاظت کرنے کی قابل نہیں تھی، چہ جائیکہ اس خلا کو پُر کرتی جو عبد الناصر چھوڑ گیا تھا۔

دوسرا: مصری فوج اور عوام میں جنگ کا نعرہ لگانے والی تحریکیں اُٹھیں، جو روس (کمیونسٹوں) کو نکالنے اور مکمل آزادی کی آواز اُٹھا رہی تھیں۔

تیسرا: انگریزوں اور مصر کے درمیان تعلقات، برطانیہ کے وزیر خارجہ ڈگلس ہیوم کے دورۂ مصر سے شروع ہوئے تھے جب وہ عبد الناصر کے جنازے پر آیا تھا۔ یہ تعلقات لیبیا کے توسط سے بہت سے انگریزوں کی آمد و رفت کے ساتھ قائم رہے۔ بالآخر اس کو جو رسمی شکل ملی وہ صرف محمد حسنین ہیکل کے دورے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کی بنیاد باضابطہ سرکاری مذاکرات اور مصر کی طرف سے برملا اس بات کا اعلان تھا کہ مصر اور برطانیہ کے درمیان تعلقات کو مستحکم کیا جائے۔ سادات کے آغاز حکمرانی میں اس کی غیر مستحکم پوزیشن کو دیکھتے ہوئے اب مصر کو برطانیہ کی طرف رجوع کیلئے فقط وقت درکار تھا، اس میں کسی کوشش کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر امریکہ سادات حکومت کو تقویت واستحکام فراہم کرنے میں کامیاب ہوا اور 1973 کی جنگ چھیڑ دی، تاکہ اسرائیل کے ساتھ امن کی راہ ہموار کی جائے۔ چنانچہ اس جنگ نے سادات کو ہیرو بنا دیا اور اس کو امور کی بھاگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے میں مدد فراہم دی۔ اس طرح مصر میں عالمی کشمکش ختم ہو گئی اور مصر اب تک بدستور امریکہ کا اہم اور بڑا اڈہ ہے۔

جہاں تک شمالی افریقہ کے ممالک کا تعلق ہے، تو مراکش محمد الخامس کے زمانے میں اپنی آزادی کے وقت سے امریکہ کے تسلط میں داخل ہو گیا تھا اور الجزائر احمد بن بلاّ کے ذریعے امریکی تسلط میں چلا گیا تھا۔ مگر یہ

حالات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے، کیونکہ محمد الخامس مر گیا تو اس کے بیٹے الحسن نے اقتدار سنبھالا اور انگریزوں کی طرف جھکاؤ اختیار کر لیا۔ جبکہ الجزائر میں ابن بلاّ کے خلاف انگریزوں نے ملک الحسن اور محمد خیضر کے ذریعے بغاوت کی، پھر ان کے ساتھ طاہر زبیری اور ابو مدین مل گئے اور ابن بلا کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ یوں امریکہ کو الجزائر سے نکال دیا گیا اور برطانیہ ہی وہاں اثر ونفوذ کا مالک بن گیا۔ جبکہ لیبیا اور تیونس میں امریکہ داخل نہ ہو سکا اور نہ ہی اس نے ان کے اندر سیاسی اعمال کئے، بلکہ انگریزی اثر ونفوذ ان ممالک میں بدستور باقی رہا۔ اس لئے یہ دونوں ملک برطانیہ-امریکہ کشمکش میں شریک نہ ہوئے۔ جہاں تک بات ہے یمن اور خلیجی ممالک کی تو سعودیہ کے علاوہ سب برطانیہ کے اثر ونفوذ کے تابع ہیں۔ ان کے اندر معروف معنوں میں کشمکش موجود نہیں، سوائے یمن کے، کیونکہ اس میں انگریزی نفوذ امریکہ کی طرف سے پابندیوں اور مدوجزر کا سامنا کرتا رہتا ہے۔ جبکہ سعودیہ میں امریکہ شاہی خاندان کے چند افراد کو اپنا بنانے میں کامیاب ہوا، البتہ اس خاندان میں برطانیہ کے بندے بھی باقی تھے، چنانچہ سعودیہ میں برطانوی امریکی کشمکش سعودی خاندان کے افراد کے درمیان کشمکش تک محدود ہے، مثلاً جب فہد بن عبدالعزیز اقتدار تک پہنچا تو سعودیہ امریکی پالیسی میں ڈھلنے لگا۔ لیکن اگر انگریز کے آدمی اقتدار میں آ گئے جیسا کہ (2004 میں) موجودہ ولی عہد شہزادہ عبداللہ تو حجاز ونجد برطانوی اثر ونفوذ میں چلا جائیں گے۔ اگرچہ نائن الیون (11 ستمبر 2001) کے دھماکوں کے بعد امریکہ، شاہی خاندان کے بعض افراد کے تردد کا خوف کئے بغیر، سعودیہ میں طے کردہ حکومتی ڈھانچے میں تبدیلیاں لا کر اپنے اثر ونفوذ کو مضبوط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ خبریں اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ یہ سب کچھ واشنگٹن کے پالیسی سازوں کے جائزے کے تحت ہوا ہے۔

عرب ممالک میں یہ برطانوی-امریکی کشمکش گزشتہ صدی کی پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں بڑی شدت کے ساتھ جاری رہی، جبکہ اس کشمکش کا نچوڑ مسئلہ فلسطین ہے۔ 1964 میں برطانوی حکام کو اس خطے کے بارے میں یہ یقین ہو گیا کہ یہ خطہ کسی اجنبی ریاست کو ہضم نہیں کر سکتا اور یہ کہ فلسطین میں کسی یہودی ریاست کے قیام کا تجربہ ایک ناکام تجربہ ہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ اس میں لبنان جیسی ایک سیکولر ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس کے لیے وائٹ بک کے منصوبے کو زندہ کیا جائے جس کو برطانیہ نے 1939 میں ترتیب دیا تھا

اور اس کو مسئلے کے حل کیلئے اساس قرار دیا تھا۔ اس نے یہودی نمائندوں سے مذاکرات کئے اور اس تصور پر انہیں مطمئن کر لیا اور تیونس کے حکمران حبیب بورقیبہ نے مصر، اردن، لبنان، سعودیہ اور کویت کا دورہ کیا اور عرب نمائندوں اور بعض فلسطینی شخصیات پر اس برطانوی منصوبے کو پیش کیا۔ اس نے اس منصوبے پر رضامندی حاصل کرلی اور برطانیہ نے اس کو نافذ کرنے کی کوششیں شروع کیں لیکن امریکہ اپنے ایجنٹ عبدالناصر کے ذریعے اس منصوبے کی شدید مخالفت کر کے اس کو ناکام بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

ان تمام باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے مسئلے کے حوالے سے عالمی پہلو سے یہ فرض کیا گیا تھا کہ یہ خطے کے لوگوں اور استعماری طاقتوں کے درمیان اکھاڑ پچھاڑ کا مسئلہ ہونا چاہئے، جیسے امریکہ کے ساتھ پیش آیا کہ جب اس نے استعمار کو مار بھگایا اور امریکی ریاست تشکیل دی۔ یہی کچھ دوسری جنگ عظیم کے بعد چین نے کیا، جب اس نے جاپانی استعمار اور اجنبی نفوذ کو نکال باہر کیا اور عالمی مقام و مرتبے کی حامل ایک کمیونسٹ ریاست قائم کی۔ ہر وہ ملک جسے کالونی بنالیا گیا ہو اور اس کے پاس مقامی و بین الاقوامی وسائل موجود ہوں، کے لیے یہ طبعی چیز ہے کہ وہ اجنبی اثر و نفوذ سے آزادی حاصل کرلے اور خود کو ایک عالمی وزن کی حامل ریاست ثابت کرے، لیکن افسوس کہ مشرق وسطیٰ کے مسئلے میں ایسا نہیں ہوا، اور یہ مسئلہ امریکہ اور برطانیہ کے درمیان اس خطے کو کالونی بنانے اور اس کا استحصال کرنے کی شدید باہمی کشمکش کا مسئلہ بن گیا، پس اس خطے کو ایسے نت نئے شکنجوں میں باندھا گیا کہ اس خطے کے لوگ نجات حاصل کرنے کا تصور بھی ذہن میں نہ لائیں۔ پھر گزشتہ صدی کی ستر اور اسّی کی دہائیوں میں یہ کشمکش جاری رہی البتہ اس کی شدت کم تھی۔

مگر پچھلی صدی کی نویں دہائی کے اوائل میں جب سوویت یونین کا سقوط ہوا اور عراق جنگ میں امریکہ کو کامیابی ملی، نیز اس نے کویت اور خلیج کے علاقہ پر بالادستی حاصل کرلی، اور دنیا میں طاقت کے توازن میں تبدیلی آئی تو امریکہ اس خطے کا نیا نقشہ کھینچنے لگا، جس میں برطانوی لوگ دوسرے درجے کے کھلاڑی تھے۔ ان میں امریکہ کے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت نہ تھی اور ان کا پلڑا ہلکا ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ کمزور حیلوں اور سازشوں پر مجبور ہوئے اور اپنے منصوبوں کو آگے بڑھانے کیلئے یورپی یونین پر اعتماد ان کی مجبوری بن گئی۔ یہ منصوبے پھیکے قسم کے تھے جیسے اوسلو معاہدہ، جس کے ذریعے انہوں نے امریکہ کو بائی پاس کرنے کی کوشش

کی، مگر امریکہ نے ان معاہدات کو ایسے رخ موڑا جو اس کے اہداف و مقاصد کو پورا کرے۔ برطانیہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ فلسطین میں سیکولر ریاست کے قیام کے منصوبے کی ناکامی کا اعتراف کرے، پس اُس نے اِس منصوبے کے اختتام کا اعلان کیا اور یہودی ریاست کے پہلو میں عرب فلسطینی ریاست کے قیام کے امریکی منصوبے (two state solution) کو قبول کر لیا اور 1988 میں الجزائر میں منعقدہ فلسطینی وطن کانفرنس میں فلسطین لبریشن آرگنائزیشن PLO کا صدر یاسر عرفات باقاعدہ طور پر سیکولر ریاست کی فکر سے دستبردار ہو گیا اور اسی تاریخ سے اس نے باقاعدہ طور پر تمام عالمی حلقوں میں دو ریاستی تصور کو قبول کرنے کا اعلان کیا۔ شاہ حسین کو بھی اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ قانونی اور انتظامی طور پر نہر اُردن کے مغربی اور مشرقی کنارے کی علیحدگی کا اعلان کرے اور فلسطینی ریاست کے قیام کی ضرورت کا اعتراف کرے۔

اس طرح عملی اور باقاعدہ طور پر سیکولر ریاست کا منصوبہ ناکام ہوا اور صرف امریکی منصوبہ ہی باقی رہا کہ اسرائیل کے پہلو میں فلسطینی ریاست قائم کی جائے اور یہی وہ عالمی مطالبہ بن گیا جس کو اقوامِ متحدہ، یورپی یونین بشمول امریکہ اور روس نے اختیار کیا۔ اس طرح بش کا نقطہ نظر، جو روڈ میپ کہلاتا ہے، کو سامنے رکھتے ہوئے اسرائیل کے بالمقابل فلسطینی ریاست کے قیام کی پشت پناہی کیلئے ان چار اطراف پر مشتمل عالمی چار رکنی quadric گروپ بنایا گیا۔ تاہم امریکہ اس روڈ میپ کے نفاذ میں اب غیر سنجیدہ ہے، کیونکہ یہ سال (2004) امریکی انتخابات کا سال ہے اور اس روڈ میپ سے امریکہ صرف اس خطے کو مشغول رکھنا چاہتا ہے۔ امریکہ خطے کو ایک کے بعد دوسرے منصوبے میں مشغول رکھے ہوئے ہے، یہاں تک کہ اس کے لیے مفادات حاصل کرنے کا مناسب وقت آجائے، تب امریکہ سنجیدگی کے ساتھ یہودیوں سے مطالبہ کرے گا کہ وہ اس کے منصوبوں کو نافذ کریں اور وہ امریکی مطالبے کی تعمیل کریں گے۔ کیونکہ یہودی سنجیدگی سے دیے جانے والے امریکی احکامات سے روگردانی نہیں کر سکتے، بالخصوص جبکہ انہیں پتہ ہے کہ خطے میں اگر ایک طرف امریکہ کے متعارف کردہ منصوبوں کا مقصد اس کے اپنے مفادات کی تکمیل ہے، تو دوسری طرف امریکہ یہودی ریاست کے مفاد کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔

اور جیسا کہ برطانیہ فلسطینی ریاست کے قیام میں امریکہ کے ساتھ چلنے پر مجبور ہوا،اسی طرح وہ عراق جنگ میں شرکت کرنے اور اپنے ایجنٹ صدام حسین کو ہٹانے میں بھی اس کے ساتھ چلنے پر مجبور ہوا۔ اس لیے کہ وہ امریکہ کی رضامندی کے ساتھ اپنے کچھ ان مفادات کا تحفظ کر سکے جو اس کو بڑی ریاست کے مقام پر باقی رکھتے ہیں۔

اسی طرح امریکہ تمام خلیجی ریاستوں اور یمن واُردن میں برطانوی اثرونفوذ کے ساتھ اپنااثر ونفوذ بڑی مضبوطی سے داخل کرنے کے قابل ہوا۔ جبکہ اس نے شمالی افریقہ اور ترکی میں فرانس اور برطانیہ دونوں کے اثرورسوخ کے ساتھ مزاحمت کی۔ اس طرح امریکہ ہی درحقیقت مشرق وسطیٰ کے خطے کی چوبیس سے زائد ریاستوں پر نگران ہے، جبکہ برطانیہ کچھ ٹکڑوں کیلئے امریکہ کے پیچھے دوڑنے اور پردے کے پیچھے سے اس پر وار کرنے پر مجبور ہے۔ اب اسکی وہ جرأت نہیں رہی جو سابقہ زمانہ میں تھی کہ وہ اپنے مخصوص منصوبے پیش کرتا تھاجو خطے میں امریکی منصوبوں سے ٹکراتے تھے۔ اس طرح یہ کہاجاسکتاہے کہ دونوں ریاستوں کے درمیان علی الاعلان کشمکش پچھلی صدی میں اختتام کو پہنچی گئی ہے اورآج یہ کشمکش باقی نہیں رہی، اب یہ مشارکت (پارٹنرشپ) کے اسلوب اور سودے بازی میں تبدیل ہوچکی ہے، جبکہ امریکہ خطے کے اولین رہنما کا تاج پہنے ہوئے ہے جو سب سے بڑا شراکت دار بھی ہے۔ دوسری جانب برطانیہ ایک اچھی کنیز کا کردار ادا کررہاہے تاکہ اس پر روشنی پڑتی رہے اور اس کی نمائش ہوجایاکرے۔ چنانچہ خطے میں یہودی آبادکاری کے منصوبوں کو نافذ کرنے کے لیے برطانیہ کی موجودہ طاقت بلکہ پورے یورپی یونین کی طاقت کمزور ہے، اسلئے ہم برطانیہ اور یورپی یونین کو دیکھتے ہیں کہ وہ امریکی منصوبوں کیلئے بڑھ چڑھ کر آگے آتے ہیں اور اس کے لئے کام کرتے ہیں۔ برطانیہ اور یورپی یونین امریکی کردار کے بغیر کسی چیز کونافذ نہیں کرسکتے، اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ برطانیہ کا خطے میں کردار ختم ہوگیاہے، بلکہ اس کا احساس برتری کہ وہ ایک بڑی ریاست ہے، بدستور موجود ہے اور اس کی سیاسی فراست ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ مزید یہ کہ اس کے دیگر ایجنٹ بھی برابر سانس لے رہے ہیں یعنی برطانیہ کی طاقت ابھی بھی مخفی طور پر موجود ہے اور وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہتی ہے۔

جہاں تک فرانس کی بات ہے تو وہ الجزائر، تیونس اور لبنان میں اپنا کچھ اثر ورسوخ باقی رکھنے کیلئے بدستور مقابلہ کر رہا ہے، کیونکہ ان ریاستوں میں فرانسیسی ثقافت (تہذیب) کے حامل چند لوگ اب تک موجود ہیں، جبکہ مراکش اور موریطانیا میں اس کا اثر ورسوخ مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔

جہاں تک اسرائیل کی بات ہے تو اس نے اپنی پالیسیاں امریکی مفادات کے مطابق ڈھال دی ہیں اور اسی کے مفادات کے اندر گھل مل گیا ہے، خاص کر کے بش جونئیر کی انتظامیہ کے جدید قدامت پرستوں (نیو کنزرویٹوز) کے زمانے میں اسرائیل نے بڑی گرمی اور پھرتی سے ان کا دفاع کیا تو امریکہ نے بھی خطے میں ایک بڑی ریاست کے طور پر اس کے مرتبے اور مقام کی حفاظت کی اور اسرائیل کے دفاع کو اپنا دفاع تصور کیا، اور اسرائیل اس لاڈلے بچے کی طرح رہا، جسے باپ ناراض نہیں کرنا چاہتا۔

جہاں تک عرب ممالک کے حکمران ہیں تو انہوں نے امریکی کی خدمت میں غلامی کی حدود کو چھو لیا اور اپنا وہ اعتماد جو قوم کے ہاں پایا جاتا تھا، گنوا دیا، جس کے باعث ان کے آقاؤں نے انہیں بے کار سمجھا اور ان کو خوب ذلیل کیا، ان سے مزید رعایتوں کا مطالبہ کیا، جس کے نتیجے میں ان کی حیثیت محض اُن ہتھیاروں کی مانند ہو گئی جس کو جب چاہے دشمن کیلئے تبدیل کرنا سہل ہوتا ہے، جیسا کہ صدام کے ساتھ ہوا اور عنقریب اوروں کے ساتھ یہی کچھ ہو گا۔ اس طرح ان حکمرانوں نے اپنی قوم کا سہارا کھو دیا، اور اقتدار میں ان کی بقا اپنے آقاؤں کے رحم وکرم اور تعاون پر ہے۔ ان کی حالت پہلے سے زیادہ بدتر ہو گئی کیونکہ اب وہ دونوں طرف سے آگ کی لپیٹ میں گھر گئے، قوم کا غیض وغضب اور اپنے آقاؤں کی ناراضی۔ چنانچہ ایک طرف سے ان پر قوم کا ہتھوڑا برستا ہے تو دوسری طرف ان کے آقاؤں کا آہرن ہے۔ اس طرح مشرق وسطیٰ ایک ایسا خطہ ہے جہاں ہر لمحہ کسی دھماکے کا امکان ہوتا ہے اور یہ خطہ اس قابل ہے، جہاں ایک حقیقی اسلامی ریاست کی پیدائش ہو جائے، جس کی نشانیاں اب واضح طور دکھائی دے رہی ہیں۔

3۔ مشرق بعید کا مسئلہ

مشرق بعید کا معاملہ مشرق وسطیٰ سے مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ ایک اسٹر ٹیجک اور استعماری مسئلہ ہے، لیکن اس میں صورتحال یکسر مختلف ہے۔ ہم برصغیرِ ہند کو عصر حاضر میں تنہا ایک مسئلہ کے طور پر لیتے ہیں، دوسری طرف مشرق بعید میں پانچ قومیں ہیں جن میں سے ہر ایک کا اپنا ایک مسئلہ ہے۔ ان میں چینی قوم ہے، جاپانی قوم، کورین، چینی ہند Indochina اور انڈونیشی قوم ہے۔ مشرق بعید کے جزوی مسائل پر بحث کرنے سے پہلے اس کے مسئلے کو اجمالاً ذکر کرتے ہیں۔

یہ اسٹر ٹیجک پہلو سے امریکہ اور روس کیلئے اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے اور بحر الکاہل کے پہلو کی جانب سے امریکہ کی سرحد پر کھڑا ہے۔ اس کے اندر امریکہ کیلئے خطرہ پیدا کرنے کے قابل دو بڑی طاقتیں موجود ہیں، جو چین اور جاپان ہیں۔ علاوہ ازیں، یہ دونوں طاقتیں روس کیلئے بھی خطرہ بن سکتی ہیں۔ لہٰذا یہ مسئلہ اس پہلو سے اسٹریٹیجک سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے امریکہ مشرقِ بعید میں اپنی قوت کی موجودگی کو اہمیت دیتا ہے۔ یہ اہمیت اس سے پہلے بھی تھی جب پرل ہاربر کی بندرگاہ پر جاپان کی طرف سے دوسری جنگِ عظیم میں اس پر حملہ کیا گیا اور جب امریکہ نے اس پر حملہ کیا تو مشرقِ بعید اسٹر ٹیجک پہلو سے امریکہ کیلئے اہمیت اختیار کر گیا، اس لئے اس کی جنگی بیڑے اور جنگی طیارے مسلسل اس خطے میں چکر لگاتے رہتے ہیں۔ اور فلپائن تو دوسری جنگِ عظیم سے پہلے سے لے کر آج تک امریکی اڈہ سمجھا جاتا ہے۔ یوں امریکہ کسی ممکنہ خطروں سے بچاؤ کے لیے اس خطے پر انتہائی توجہ دیتا ہے۔ جہاں تک روس کا تعلق ہے تو خطے کے ساتھ چونکہ اس کی پڑوس کچھ ایسی ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی سمندر حائل نہیں، جیسا کہ امریکہ اور خطے کے درمیان واقع ہے۔ اس بنا پر وہ عسکری پیش بندیاں اور احتیاطی تدابیر نہیں کرتا، اگرچہ چین کے ساتھ اپنے سرحدوں کی نگرانی کرتا رہتا ہے اور اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ جاپان اور اپنے درمیان اچھے اور دوستانہ تعلقات رکھے۔

استعماری تناظر سے یہ ماضی میں تقریباً برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور پرتگال تک محدود تھا، کیونکہ امریکہ نے اگرچہ فلپائن پر تسلط کر لیا اور اس کو ایک کالونی بنائے رکھا، مگر جب انیسویں صدی میں استعماریت

پھیلی تو امریکہ نے جدید دنیا سے باہر استعماریت میں حصہ نہیں لیا، اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ پرلے درجے کی وہ ریاستیں ہیں جنہوں نے مشرقِ بعید کو کالونی بنانا شروع کیا جبکہ پرتگال نے اس میں کچھ حصہ ہی شامل کیا۔ جہاں تک برطانیہ کی بات ہے، اس نے جنوب مشرقی چین کے ساحل پر واقع ہانگ کانگ کے جزیرہ کو کالونی بنایا اسی طرح اس نے جزیرہ بورنیو کے شمالی حصہ، سنگاپور اور مالایو کو کالونی بنایا۔ اسی طرح ہندوستان کو نیز برما اور سیلون کو کالونی بنایا۔ اس کی پالیسیاں سب کی سب ان کالونیوں کو محفوظ کرنے کی بنیاد پر قائم تھیں اور جب مغربی بلاک دونوں سپر پاورز کے درمیان معاہدے سے قبل ایک اکائی تھا تو مشرقِ بعید میں برطانیہ کی پالیسی امریکی پالیسی کی مخالف ہوا کرتی تھی، اس کے باوجود کہ وہ اپنی کالونیوں کی حفاظت کیلئے امریکہ کا محتاج ہوتا تھا۔ چنانچہ برطانیہ چین کو اپنی تجارتی منڈی تصور کرتا تھا، اس لئے مشرقی بلاک کے ساتھ اس کی موجودگی کو مشرق بعید میں اس کیلئے کوئی خطرہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خطے میں چین پر حملے اور اس کے ساتھ تصادم کا کوئی جواز اسے نہیں ملا اور اس کی یہ کوشش رہی کہ یہ خطہ پُرامن اور مستحکم رہے، کیونکہ اس خطے میں اگر کوئی بھی تحریک اٹھتی ہے تو اس کیلئے اپنی کالونیوں کے بارے میں پریشانیوں اور تشویش کا سبب ہوگا۔

اس لئے اس نے ان تحریکوں کی مزاحمت کی جو ہالینڈ کو مار بھگانے کیلئے انڈونیشیا میں کھڑی ہوئیں اور کمیونسٹ چین کے ساتھ خوش اسلوبی کا معاملہ کیا اور اس کو تسلیم کیا اور اس کے ساتھ تجارت کیلئے دروازہ کھولا۔ اس طرح مشرق بعید کی پالیسی میں وہ امریکہ مخالف اقدامات کرتا تھا۔ یہ سب برطانیہ نے اپنی کالونیوں کی حفاظت کی خاطر کیا، کیونکہ یہ کالونیاں نہ صرف یہ کہ اس کے سامان کی فروخت کیلئے مارکیٹ تھیں بلکہ یہ خام مال سے مالامال وہ علاقے ہیں جن کا ماضی میں صرف برطانیہ استحصال کرتا تھا، اس پر تنہا برطانیہ براجماں تھا۔ اس لئے مشرقِ بعید میں اس کی پالیسی کا دارومدار خواہ کسی بھی شکل میں ہو، اپنی استعماریت کی بقاء اور خطے میں اثر ورسوخ پر تھی۔

جہاں تک فرانس کا تعلق ہے تو اس نے دوسری جنگ عظیم کے بعد چینی ہند کو واپس لے لیا، جو ویتنام، لاووس اور کمبوڈیا پر مشتمل ہے۔ یہ کالونی بڑی اور امیر ترین فرانسیسی کالونیوں میں سے سمجھی جاتی ہے،

کیونکہ یہ فرانسیسی آمدنی کی بڑے ذرائع میں سے شمار کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقے خام مواد سے مالامال ہیں مگر فرانس اس کالونی کی حفاظت نہیں کر سکا۔ چنانچہ ایک طرف سے چین نے اس پر تسلط حاصل کر لیا دوسری طرف سے امریکہ نے اس پر تسلط حاصل کر لیا، حتی کہ وہ پوری کالونی کو چھوڑنے اور اس سے نکلنے پر مجبور ہوا۔ جہاں تک چین کی بات ہے، تو اس نے ویتنام میں سابقہ تحریک آزادی کو کھڑا کیا اور سہارا دیا، جو ویٹ مینا(Viet Minh) کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس انقلاب نے فرانس پر غلبہ حاصل کیا اور اس کو ویتنام کے اکثر علاقوں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ فرانس عسکری اور سیاسی طور پر ٹوٹ گیا یہاں تک کہ اسے پوری کالونی سے نکلنا پڑا۔ امریکہ فرانس سے چینی ہند کالونی لینا چاہتا تھا۔ وہ بظاہر فرانس کے ساتھ تعاون دکھا رہا تھا جبکہ عین انہی دنوں میں اس کے خلاف مختلف انداز سے انقلاب کی حوصلہ افزائی بھی کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ فرانس خوف اور امید کی کیفیت کے درمیان لٹک گیا، کہ ایک طرف اس کو مغربی بلاک خصوصاً امریکہ کی آشیر باد سے اپنی بقا کی امید تھی اور دوسری طرف اس کی انقلاب کو فتح کرنے کی امیدیں دم توڑ رہی تھیں۔ بالآخر جنیوا کانفرنس منعقد ہوئی اور چینی ہند کے مسئلے پر بحث کی جس کے نتیجے میں فرانس وہاں سے نکل گیا اور اس کی جگہ لاووس، جنوبی ویتنام اور کمبوڈیا میں امریکہ نے لے لی، جبکہ شمالی ویتنام میں اس کی جگہ چین نے لے لی، یعنی نارتھ ویتنام کی ریاست کی مدد کی جس نے آزادی حاصل کر لی تھی، پھر اس نے ساؤتھ ویتنام کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس طرح خطے سے فرانس کا مکمل طور پر صفایا ہو گیا۔

جہاں تک ہالینڈ کا تعلق ہے، تو امریکہ نے انڈونیشی لوگوں کو ہالینڈ کے خلاف انقلاب پر اکسایا۔ پھر انہوں نے ایک سخت گیر انقلاب برپا کیا جس میں باہمی اختلافات کے باوجود امریکہ اور روس معاون رہے، جبکہ برطانیہ انڈونیشی عوام کے خلاف ہالینڈ کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ بالآخر انڈونیشی عوام عسکری طور پر ہالینڈ پر غالب آ گئے اور یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں اٹھایا گیا، امریکہ نے انڈونیشیا کے ساتھ تعاون کیا اور اقوام متحدہ نے انڈونیشیا کی آزادی کا فیصلہ کر دیا۔ اس طرح ہالینڈ انڈونیشیا سے نکل گیا۔ اب صرف مغربی ایریانا رہ گیا، مگر انڈونیشیا نے امریکی مدد سے اس کا پیچھا کیا اور لگاتار اس کا تعاقب کرتا رہا، یہاں تک کہ اس کو نکال دیا۔ اس طرح ہالینڈ پورے خطے سے نکل گیا۔ چنانچہ اس کا کوئی استعماری وجود باقی نہ رہا۔

جہاں تک پرتگال کی بات ہے تو اس نے انڈیا میں (گوا) کو کالونی بنایا، اور جب انڈیا نے دیکھا کہ ہالینڈ کو خطے سے نکال دیا گیا، تو اسے بھی پرتگال کو نکالنے کی ہمت ہوئی۔ چنانچہ برطانیہ اور امریکہ کی حوصلہ افزائی سے انڈیا نے (گوا) پر قبضہ کیا اور پرتگال کو نکال دیا۔ اس طرح یہ انڈیا کا حصہ بن گیا۔

اس طرح خطے میں برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ کوئی استعماری ریاست باقی نہ رہی۔ برطانیہ دونوں بڑی ریاستوں (امریکہ اور سابق سوویت یونین) کے معاہدہ سے قبل اپنی بقا کے بارے مطمئن تھا، جبکہ ان کے معاہدہ اور عالمی صورتحال میں تبدیلی آنے کے بعد، برطانیہ اپنی کالونیوں کے بارے میں بے چین ہوا اور اسے خطرات پیش آنے لگے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ نے خطے میں برطانیہ کی جگہ لینے کیلئے جدید استعماری اسالیب کے ذریعے اس کو نکالنے کی کوشش شروع کی، یعنی استعمار کے خاتمہ اور قوموں کو آزادی دینے کے تصور کے تحت جس کو اقوام متحدہ نے اختیار کیا تھا، چنانچہ امریکہ عوام کو آزادی دینے کیلئے برطانیہ پر دباؤ اور پابندیاں لگانے لگا۔ اس دباؤ کو غیر مؤثر کرنے کیلئے برطانیہ نے عیاری دکھاتے ہوئے جزیرہ بورنیو کے شمالی حصے، سراواک، صباح اور ملایو اور سنگاپور کے درمیان اتحاد قائم کیا جس کے نتیجے میں ملائیشیا کی ریاست وجود میں آگئی۔ اس طرح استعمار کی شکل میں تو تبدیلی کی، لیکن ان ممالک کو بدستور اپنی کالونی بنائے رکھا۔ امریکہ نے فوراً اس کے خلاف سازش کی اور انڈونیشیا کو جزیرہ بورنیو کے شمالی حصے کے مطالبہ پر اکسایا۔ چنانچہ انڈونیشیا نے بورنیو پر حق کا دعویٰ کر دیا اور بورنیو، ملایا اور سنگاپور پر باغیوں کے ذریعے حملے کروائے۔ اس کے علاوہ لوگوں کو برطانیہ کے خلاف انقلاب برپا کرنے پر اکسانے لگا۔ اس طرح انڈونیشیا اور ملائیشیا کے درمیان جنگ کی سی صورتحال پیدا ہو گئی، جسے مقابلے کی پالیسی کا نام دیا گیا۔ یہ صورتحال سالہا سال قائم رہی۔ جب دونوں سپر پاورز کا آپس میں معاہدہ ہو گیا تو اس میں اس معاملے پر بھی اتفاق ہوا کہ دنیا سے فوجی اڈوں کو ختم کیا جائے گا اور برطانیہ کو مشرق بعید سے نکالا جائے گا۔ اس کی وجہ سے برطانیہ پر دباؤ بڑھا تو اس نے فیصلہ کیا کہ سنگاپور سے اپنے اڈے خالی کرے اور مشرقی سوویز اور مشرقِ بعید سے اپنی فوجیں واپس بلائے۔ اس نے انڈونیشیا میں سوکارنو کے خلاف اپنے ایجنٹوں کے ذریعے مزاحمت میں تیزی دکھائی جو غیر متوقع دفاعی پالیسی (encounter policy) کا حصہ تھی۔ پھر امریکہ سوکارنو کو ہٹانے پر مان گیا اور اس کی جگہ فوج میں دوسرے ایجنٹوں کو سوہارتو کی قیادت میں

لے آیا۔ اڈوں سے برطانیہ کے انخلا کے بعد سنگاپور کو ملیشیا سے الگ کر دیا گیا جو اب شمالی بورنیو، سراوک، صباح اور ملایو پر مشتمل تھا۔

ان معاملات کے بعد علاقے میں قدرے خاموشی چھا گئی، جہاں معاملات صرف چین پر حملوں تک محدود تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ دونوں سپر طاقتوں کے مشرق بعید سے متعلق معاہدے میں یہ بھی شامل تھا کہ برطانیہ کو مکمل طور پر نکال باہر کیا جائے کہ اس کی کوئی موجودگی نہ رہے اور گمان تھا کہ دونوں سپر پاورز چین کے مسئلے کو حتمی شکل دینے کے بعد برطانیہ کی موجودگی کے مکمل خاتمے کی طرف بڑھیں گی، مگر معاملات میں تیزی آئی۔ ویتنام جنگ کے فوراً بعد امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان تناؤ بڑھ گیا۔ چین نے دونوں سپر پاورز کے مطالبات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ امریکہ نے یہ گمان کیا کہ وہ ملائیشیا کو اقتصادی منصوبوں اور علاقائی تنظیموں میں داخل کر کے ملائیشیا میں برطانیہ کی جگہ لے لے گا۔ لیکن اس سب کے باعث ابھی تک ایسا نہیں ہو سکا۔ لہٰذا برطانیہ ابھی بھی مشرق بعید میں کچھ اثر رکھتا ہے۔

امریکہ فلپائن کے ساتھ ایسے نیم نوآبادیاتی معاہدوں سے جڑا ہوا ہے جو کہ اردن، عراق وغیرہ کو برطانیہ کے ساتھ جوڑنے والے معاہدات کے مشابہ ہیں۔ فلپائن اگرچہ اصولی طور پر امریکی کالونی نہیں، مگر عملی طور پر اس کی حیثیت امریکی کالونی کی ہی ہے۔ جب امریکہ انڈونیشیا سے ہالینڈ کو نکالنے میں کامیاب ہوا تو اس کی جگہ لینے کی کوشش شروع کی، مگر انڈونیشی لوگوں نے طویل سالوں تک اس کا مقابلہ کیا اور ایک استعمار کو نکال کر دوسرے استعمار کو اس کی جگہ آنے سے انکار کیا۔ اب امریکہ انڈونیشیا کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے لگا اور اس کے خلاف انقلابات برپا کئے اور برطانیہ کی اپنے ایجنٹوں کے ذریعے انڈونیشیا میں گھسنے کی کوششوں پر خاموشی اختیار کی۔ اس نے چینیوں کی انڈونیشیا ہجرت کی حوصلہ افزائی کی، جیسا کہ اس کے اندر کمیونیزم داخل کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ ان اذیتوں کے باعث انڈونیشی حکام دباؤ میں آ گئے اور امریکی قرضوں اور فوجی امداد کو قبول کر لیا۔ یوں انڈونیشیا امریکی اثر و نفوذ کے نیچے آ گیا اور اس کو سوکارنو کے زمانے سے امریکہ کا حاشیہ بردار سمجھا جانے لگا۔ پھر دونوں سپر پاورز (امریکہ اور سوویت یونین) کے معاہدے کے بعد انڈونیشیا میں امریکہ کی

پوزیشن مستحکم ہوگئی اوراس پر صرف امریکہ ہی نے تسلط حاصل کرلیا، بالخصوص فوج اور معیشت پر، جو آج تک جاری وساری ہے۔

انڈونیشیاکے علاوہ، فرانس کو نکالنے کے بعد سے امریکہ نے چینی ہند کے اکثریتی حصے پر تسلط حاصل کرلیااور کوریاجنگ کے بعد جنوبی کوریاپر کنٹرول حاصل کرلیا، اوراب تک اس کی مسلسل یہ کوشش ہے کہ مشرق بعید میں برطانوی کالونیوں میں برطانیہ کو نکال کر اس کی جگہ لے۔ اگر امریکہ کواس میں کامیابی ملتی ہے تومشرق بعید کامسئلہ ایک بین الاقوامی مسئلے سے گھٹ کر امریکی چوپال میں تبدیل ہوجائے گا۔

یہ ہے مشرق بعید کی عمومی صورتحال۔ جہاں تک مشرق بعید کی اقوام کی بات ہے تو یہ قومیں فکری پہلوسے مشرق وسطیٰ کی اقوام سے پست سطح کے لوگ ہیں، مگر دنیابھر میں دوسری جنگِ عظیم سے کچھ عرصہ قبل اوراس کے دوران استعمار سے آزادی کی جو فکر پھیل چکی تھی، اور جنگ کے بعد مزید پھیل گئی، اس فکر نے اس خطے کے لوگوں میں مشرق وسطیٰ کے لوگوں سے بڑھ کر اثر کیا۔ یہ اس لئے کہ یہ فکر کمیونسٹ لے کر آئے جو سرمایہ داریت کے خلاف کمیونیزم کے مقابلے کا جزو ہے۔ اس لئے اس فکرنے روس (سوویت یونین) سے چین کے راستے مشرق بعید کی قوموں میں آکر مضبوط شکل میں سرایت کی، پھر ان اقوام کواکسایا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ چینی ہند کے لوگوں نے فرانس پر اور انڈونیشیا کے لوگوں نے ہالینڈ پر دوسری جنگِ عظیم سے قبل اور اس کے بعد یلغار کی، کورین قوم نے کمیونسٹ فکر کو قبول کرلیااوراس فکرنے ان کومتاثر کیا، حتیٰ کہ ملایو، شمالی بورنیواور سنگاپور نے برطانیہ پر دھاوابول دیا۔ ان انقلابات کی وجہ سے انڈونیشیا کو آزادی ملی، اس نے ہالینڈ کو نکالا۔ اسی طرح شمالی ویتنام اس قابل ہوا کہ اس کوایک مضبوط ریاست کی نظر سے دیکھا جائے۔ برطانیہ ملائیشیا کی یونین کی تشکیل پر مجبور ہوا۔ یہ سب کچھ آزادی کی اس فکر کے بل بوتے پر ممکن ہوا جو اس خطہ کے اوپر چھاگئی تھی۔

امریکہ اور برطانیہ نے اس امر کا ادراک کیا، اس لئے دونوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ خطے میں ان کے اثر و نفوذ پر قدیم استعماری چھاپ ظاہر نہ ہو، بلکہ اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی تعلقات یا ان جیسے دیگر معاہدات میں بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ استعماری ڈکٹیشن کے بجائے بین الاقوامی معاہدات نظر آئیں۔

مشرق بعید کے مسئلے میں دو چیزیں پیش نظر ہونی چاہئیں:

پہلا: شمالی کوریا کے بارے میں امریکہ کا پروپیگنڈہ اور یہ کہ اس کو ایٹمی اسلحہ سے محروم کیا جائے۔

دوسرا: خطے میں بالخصوص انڈونیشیا اور ملائیشیا میں بڑھتی ہوئی اسلامی لہر۔

جہاں تک شمالی کوریا کا مسئلہ ہے تو اس کو امریکہ نے اس لئے اٹھایا تاکہ چین کے حدود پر ایک سلگتے ہوئے مسئلے کو کھڑا کیا جائے۔ سو اس خطے کے اندر امریکی اثر و نفوذ میں مزاحمت اور اس کے مفادات پر اثر انداز ہونے کے خوف کی وجہ سے امریکہ کی مستقل پالیسی یہ ہے کہ چین کا طاقتور ریاستوں یا سلگتے مسائل کے ذریعے گھیراؤ کیا جائے تاکہ اسے اپنے آپ میں مشغول رکھا جائے۔ یہ اس لیے کہ اس کے اپنی سرحدوں کے باہر کوئی ارادے نہیں ورنہ وہ امریکی مفادات پر کنٹرول اور اثر و رسوخ کے لیے مقابلہ کرے گا اور اگر چین کے ارد گرد مضبوط ریاستوں کے قیام کے پیش نظر امریکہ کیلئے کوریا کو ایک بنانا ممکن ہوا جیسا کہ ویتنام میں پیش آیا، تو امریکہ ایسا کر گزرے گا۔

اس لئے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ امریکہ اس مسئلے کو یوں ہی سلگتا چھوڑنا چاہتا ہے، بشرطیکہ چین اس مسئلے کی وجہ سے الجھن میں رہے، صرف یہ نہیں کہ امریکہ کے لئے یہ مسئلہ ہو۔ اس لئے وہ کوریا کے مسئلے میں خطے کے دیگر ممالک کو بھی شامل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لئے مسدس (چھ ممالک کی) ملاقاتیں ہوئیں، یعنی امریکہ، شمالی کوریا، چین، روس، جاپان اور جنوبی کوریا۔

چین کے اندر یا اس کی سرحدوں پر امریکی پالیسی کا مستقل رخ گرم مسائل پیدا کرنے کی طرف ہی ہے اور اس کیلئے مناسب وقت کا انتخاب کرتے ہوئے کبھی اس کو انڈیا کے ذریعے مشغول رکھتا ہے اور کبھی انسانی حقوق کے نام پر اس کے اندر مداخلت کرتا ہے یا پھر چین کی حدود پر کوریا کے ساتھ ماحول میں گرمی

پیدا کر کے اس کو حرکت میں لاتا ہے وغیرہ۔ اس حوالے سے امریکہ ہر مناسب موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ موقع اس کو صحیح وقت پر ملا، جب امریکہ عراق پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا اور افغانستان سے فارغ ہونے کے بعد اس کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ اس کیلئے امریکہ نے عراق پر بڑے پیمانے پر تباہی مچانے والے اسلحے WMD کی تیاری کا الزام لگایا، اور اس میں عراق اور ایران کو ملوث ٹھہرایا گیا جو کہ دونوں مسلم ریاستیں ہیں۔ اور یہ چھپانے کیلئے کہ امریکہ مسلمانوں کے پاس اس قسم کے اسلحے کی موجودگی گوارا نہیں، جبکہ اگر دوسرے لوگوں کے پاس ہو تو وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا، بش کو شمالی کوریا کے ایٹمی اسلحہ کے مسئلے کو اُچھالنے کیلئے زبردست موقع ہاتھ آیا اور اس نے شمالی کوریا کو بھی ایران اور عراق کے ساتھ بدی کے محور (Axis of Evil) ممالک کے فہرست میں داخل کر دیا جیسا کہ اس نے اپنے جنوری 2002 کے بیان میں کہا۔ اس کا مقصد اپنے آپ سے اس الزام کو دور کرنا تھا کہ وہ عراق پر ایک مسلمان ملک ہونے کی وجہ سے چڑھائی کر رہا ہے جو اس کے دعویٰ کے مطابق بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والا اسلحہ رکھتا ہے، بلکہ اس نے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ ایران اور عراق کے ساتھ دوسرے کمیونسٹ ممالک کو بھی بدی کے محور ممالک میں داخل کرتا ہے۔ جبکہ اس وقت عراق پر چڑھائی ہی پیش نظر تھی، جیسا کہ بدی کے محور ممالک کے حوالے سے ایران اور شمالی کوریا کے بارے میں بش کے بیان کے دو ہفتے بعد کولن پاول نے کانگرس کو بتاتے ہوئے کہا "ان ممالک کے خلاف جنگ شروع کرنے کا کوئی پروگرام نہیں اور نہ ہمارے پاس شمالی کوریا یا ایران کے ساتھ مڈبھیڑ کے آغاز کا کوئی منصوبہ ہے"۔

اس لئے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ امریکہ حالات کو اس حد تک لے جائے گا جو شمالی کوریا کے ایٹمی اسلحہ کے مسئلے کو حل کرنے کیلئے مسلح کاروائی کا باعث بن جائیں۔

جہاں تک بڑھتے ہوئے اسلامی پھیلاؤ کا تعلق ہے تو یہ عمومی طور پر مغرب کی بڑی ریاستوں اور بالخصوص امریکہ کیلئے ایک تشویش کا باعث ہے۔ یہ خوف اسلام اور اسلامی بیداری کی صورت میں انہیں مسلسل خطرے کا احساس دلاتا ہے، بالخصوص جبکہ ہم جانتے ہیں کہ اس خطے میں رہائش پذیر 25 کروڑ سے زائد

لوگ مسلمان ہیں۔ چنانچہ انڈونیشیا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے، جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا چوتھا بڑا ملک ہے، یعنی چین، انڈیا اور امریکہ کے بعد انڈونیشیا ہی کا نمبر آتا ہے۔

چنانچہ انڈونیشیا اور ملائشیا خطے میں ایک غیر معمولی قوت کو وجود دے سکتے ہیں جو خطے میں مؤثر طاقتوں سے کسی طور کم نہیں ہوگی۔ یہ تب ہی ہوگا جب انڈونیشیا اور ملائشیا اسلام کو اپنی آئیڈیالوجی اور زندگی کیلئے ایک نظام کے طور پر اپنالیں۔ علاوہ ازیں، مواصلات اور نقل و حمل کی سائنسی ٹیکنالوجی میں ترقی کی بنیاد پر دونوں ممالک باقی اسلامی دنیا سے رابطے میں رہ سکتے ہیں۔

یہ ان اسباب کا بیان ہے جو مشرق بعید کو ایک عالمی مسئلہ بناتے ہیں۔

4۔ وسطی ایشیا کا مسئلہ

جہاں تک وسطی ایشیاء کا مسئلہ ہے، اس کا معاملہ مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید سے مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ جغرافیائی طور پر یہ مشرق وسطیٰ کے ساتھ لگا ہوا ہے اور اس کو مشرق بعید سے بھی الگ نہیں کیا جاسکتا، مگر یہ استعمار کی نوعیت اور اس کے اثر و رسوخ کے اعتبار سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کشمکش اور اس کے اہداف کی نوعیت میں مختلف ہے۔ وسطی ایشیا سوویت یونین کے سقوط تک اس کا حصہ تھا اور وسط ایشیا اور قوقاز Caucus پر کشمکش بھی سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد ہی شروع ہوئی۔ اس لئے وسطی ایشیا اور قوقاز پر کشمکش کے فریق بھی مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید سے مختلف تھے۔ کشمکش کے اہداف کا فرق تو اس طرح تھا کہ اس کشمکش سے امریکہ کا مقصد روس کو اس کے اثر و نفوذ کے علاقوں سے نکالنا اور اس کو قوقاز اور وسطی ایشیا سے نکال کر اس کے ناگزیر علاقوں میں محصور کرنا تھا۔

اس بنا پر یہ مسئلہ 1991 کے بعد رونما ہوا جب سوویت یونین کے حصے بخرے ہونے کے بعد اس کے ملبے پر 15 نئی جمہوری ریاستیں وجود میں آگئیں۔ ان میں پانچ جمہوریتیں وسطی ایشیا میں واقع ہیں، جن کی

آبادی کی اکثریت مسلمان ہے۔ یہ جمہوریتیں ہیں: اُزبکستان جو ان میں سب سے اہم ہے، قازقستان، ترکمانستان اور کرغیزستان ، یہ چار جمہوریتیں ترکی زبان سے ملتی جلتی بولی بولتی ہیں اور پانچویں جمہوریت تاجکستان ہے جو فارسی زبان بولتی ہے۔

یہ پانچ جمہوریتیں ایک انسانی اور جغرافیائی زنجیر تشکیل دیتی ہیں۔ چین کے مغربی (اسلامی) حصے کے ساتھ ان سب پر ترکستان کا نام بولا جاتا ہے (یعنی مشرقی ترکستان چینی علاقے کیلئے اور مغربی ترکستان وسطی ایشیائی علاقے کیلئے)۔ یہ جمہوریتیں کیسپئین سمندر Caspian Sea کے شمال مشرقی جانب واقع ہیں جبکہ اس کے مشرقی جانب چین نے مشرقی ترکستان کے علاقے پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ شمال میں روس، مغرب میں کیسپئین سمندر اور روس ہے، جبکہ جنوب میں افغانستان اور ایران ہیں۔

کشمکش کی تفصیلات میں جانے سے پہلے وسطی ایشیا اور قوقاز کی اسٹریٹجک اہمیت پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ سٹرٹیجک لحاظ سے یہ خطہ ایشیا کے اندر مشرق وسطیٰ تک روس کی توسیع سمجھا جاتا ہے، اس کے اور روس کے درمیان کوئی قدرتی حدود موجود نہیں، روس اور اس خطے کے درمیان کوئی دریا یا سمندر حائل نہیں۔ اسی طرح چین کی نسبت سے ہے۔ چنانچہ اس خطے کو چین کے عقبی دروازے کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس خطے کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہے، اس لئے چین کے اندر صوبہ ترکستان میں موجود مسلمانوں پر ان کے اثر انداز ہونے سے چین کو خوف لاحق رہتا ہے۔ اس اسٹریٹجک اہمیت کے پیش نظر امریکہ نے سوویت یونین کے سقوط کے وقت سے ہی اس خطے کے اندر مداخلت اور ایک طرف روس کو بند رکھنے جبکہ دوسری طرف چین کو اپنے پڑوس میں سرایت کرنے سے روکنے کیلئے منصوبہ بنایا۔

امریکہ کو اپنے بعض اہداف میں کامیابی ملی، چنانچہ اس نے ازبکستان میں فوجی اڈا قائم کیا، اور اس کے فرمانروا کریموف نے اس کے سامنے ذلیل وخوار ہو کر سر تسلیم خم کر دیا۔ اسی طرح امریکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر تاجکستان کے ساتھ عسکری ہم آہنگی اور کرغیزستان کے ساتھ اقتصادی اور ثقافتی تعاون کے آغاز اور اس سلسلے کو قازقستان تک بڑھانے کے قابل ہوا۔ بلکہ امریکہ خطے کے دیگر ریاستوں کو بھی

روس سے لینے اور کاٹ دینے کی مسلسل کوشش میں ہے۔ قوقاز میں بھی امریکہ شیورڈناڈزے کو گرا کر اس کی جگہ تبلیسی میں اپنی ہمنوا حکومت قائم کرنے کے قابل ہوا جو روس کو خطرے سے دوچار کرنے والا ایک زوردار تھپڑ تھا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے روس کی سرحدوں اور ترکی میں موجود نیٹو کے اڈوں کے درمیان حدِ فاصل ختم ہو گئی، کیونکہ امریکہ نے جارجیا میں اپنی ہمنوا حکومت قائم کر لی۔

اگر استعماری نقطہ نظر سے دیکھیں تو وسطی ایشیا، خاص کر کیسپئین سمندر کا خطہ تیل سے مالامال ہے۔ نیز یہ خطہ بہت سی دیگر قیمتی معدنیات جیسے سونا وغیرہ سے بھی مالامال ہے۔ یہ خطہ مشرق وسطیٰ کی مثل قدرتی وسائل اور دولت سے مالامال ہے۔ اس لئے اس خطے پر امریکی سرمایہ داروں کی رال ٹپکتی رہتی ہے۔ وہ خطے میں سرمایہ کاری کے نام پر بڑی بڑی کمپنیوں کو داخل کرنے کیلئے ہر قسم کی تگ ودو کرنے میں جُتی ہوئی ہیں۔ مشرق وسطیٰ کی طرح استعماری پہلو اس خطے کی تباہی وبربادی کا اہم سبب ہے اور استعماریت ہی اس خطے پر جاری کشمکش کا بنیادی سبب بھی ہے۔

وسطی ایشیا اور قوقاز میں استعمار اٹھارویں صدی سے یورپی شہنشاہیت کی بدترین دور میں آیا، جب روس نے ریاست عثمانیہ اور ریاست صفویہ کے دور میں وسطی ایشیا اور قوقاز کے بڑے علاقے کو کاٹ لیا اور ان کو جبراً قیصر کے روس کے ساتھ ملا دیا۔ بالشویک (کیمونسٹ) انقلاب کے بعد روس نے وسطی ایشیا اور قوقاز پر مسلسل آہنی قبضہ برقرار رکھا اور دوسری ریاستوں کے لیے اس میں مداخلت کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑا، مگر سوویت یونین کے سقوط کے ساتھ اور روس کے اندر کمزوری آنے کی وجہ سے امریکہ کو اس خطے میں دخل دینے کا حوصلہ پیدا ہوا بلکہ اس نے روسی اثر ونفوذ کو ہٹانے کی کوششیں کیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سوویت یونین کے سقوط اور مشرقی بلاک کے ختم ہو جانے کے بعد امریکہ اپنے آپ کو دنیا کا اکیلا وارث سمجھ بیٹھا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جبکہ سوویت یونین بھی موجود تھا، امریکہ نے اپنے آپ کو مغربی استعمار کا وارث سمجھا۔ اس طرح جب سوویت یونین کا سقوط ہوا تو وہ خود کو سوویت یونین کا بھی وارث سمجھنے لگا۔ امریکہ غرور اور اکھڑپن میں مبتلا ہے، اس لئے وہ خود کو ہی دنیا کا سب سے زیادہ حقدار سمجھتا ہے، اس لئے وہ تمام ممالک

کو اپنے اثر و نفوذ کے آگے جھکانے کیلئے سر توڑ کوشش کر رہا ہے، اور اس کے لیے وہ بڑی ریاستوں بشمول روس کو ان کے کالونیوں اور اثر و نفوذ والی جگہوں سے نکالنے کی تگ و دو میں ہے۔

سوویت یونین کے انہدام کے بعد روس نے وسطی ایشیا اور قوقاز میں سوویت یونین کا وارث بننے کی کوشش کی۔ اس لئے سقوط کے بعد روس نے آزاد ریاستوں کی کامن ویلتھ کے قیام کے ذریعے سوویت جمہوریتوں کے ڈھانچوں کو دوبارہ منظم کرنے کی کوشش کی، جو سوویت یونین کی سابقہ ریاستوں پر مشتمل تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے قوقاز کے وسیع حصے، جیسے چیچنیا، انگوشتیا اور داغستان وغیرہ کو اپنے زیر تسلط رکھنے کیلئے روس کے وفاقی خدوخال کو بھی باقی رکھا۔

تاہم اوزبکستان اور جارجیا میں امریکی کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اور افغانستان، جو وسطی ایشیا کا براہِ راست پڑوسی ہے، پر قبضہ کرنے میں بھی اسے کامیابی ملی۔ نیز امریکہ نے ایشیائی اسٹریٹیجک اتحادیوں کا بھی اعلان کیا، چنانچہ پاکستان کے اسٹریٹجک اتحادی ہونے کا اعلان کیا اور عراق پر قبضہ کرنے کے بعد وہ وسطی ایشیا میں بھی اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کی تیاری کر رہا ہے، باوجود یکہ امریکی کمپنیاں وسطی ایشیا اور قوقاز میں تیل اور معدنیات کی دریافت میں خاصی دسترس حاصل کر چکی ہیں، ان تمام کامیابیوں کے باوجود یہ سیاسی کشمکش ابھی اپنی ابتدائی دور میں ہے اور کشمکش کے امریکی مفاد کے حق میں اختتام پذیر ہونے میں وقت درکار ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خطہ اگرچہ امریکہ کیلئے ناگزیر ہے مگر یہ روس کیلئے بھی جگر کی حیثیت رکھتا ہے، نیز یہ دنیا کے دیگر ریاستوں کی طرف روس کا دروازہ ہے، اس لئے روس کا اس سے انخلاء آسان کام نہیں۔ اسی لئے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ روس اس پورے علاقے کو مستقبل قریب میں جلد ہی خالی کر چھوڑے گا۔

وسطی ایشیا میں امریکی اسٹریٹجی کو سمجھنے کیلئے امریکی ذمہ داران اور خطے اور اس کے پڑوس میں امریکی ایجنٹوں کے بیانات کو جانچنا ہو گا:

چنانچہ اس سال 2004 کے شروع میں پرویز مشرف نے یہ تصور پیش کیا کہ اس کا ملک تین خطوں، یعنی وسطی ایشیا، جنوبی ایشیا (ہند) اور مغربی ایشیا (مشرق وسطیٰ) کے درمیان تجارت اور توانائی کی پائپ لائنوں

کیلئے ایک گزر گاہ بن سکتا ہے، یعنی ملکِ پاکستان کے درمیان میں واقع ہونے سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور اسلام آباد نے بحیرہ عرب پر بڑی بندر گاہوں کا ایک سلسلہ قائم کیا جو افغانستان کی حدود تک پھیلے ہوئے امریکی ماڈل کی جدید شاہراہوں کے جال کے ساتھ مربوط ہے۔

27 مارچ 2004 کو ملٹری اخراجات کیلئے امریکی سینیٹ کی منتخب کمیٹی کے سامنے اپنے بیان میں پاول نے ان منصوبوں کے بارے میں بریفنگ دی۔ اس نے کہا "قوقاز، وسطی ایشیا، مغربی اور جنوبی ایشیا کے خطے میں ہمارے لئے بہت سے مواقع موجود ہیں، جبکہ اس کو تجارت اور نقل و حمل کے جال کے ساتھ جوڑ دیا جائے، مگر یہ بھی اس وقت ممکن ہو گا جب ہم وہاں امن قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں"۔ اس نے مزید کہا "پاکستان اس معاملے پر غور کر رہا ہے اور اپنے ڈھانچے اور بندر گاہوں کو از سرِ نو تشکیل دے رہا ہے... اور ہم اپنے سعودی اور جاپانی شراکت داروں کے تعاون سے افغانستان میں شاہراہوں کے جال بچھانے کے عمل کو برابر جاری رکھیں گے"۔

امریکہ خطے کو عسکری، سیاسی یا اقتصادی معاہدات پر قائل کرنے کے لیے سفارتی دوڑ دھوپ کر رہا ہے جو پاک افغان سرحد سے شروع ہوتے ہیں اور تہران و کابل سے گزرتے ہیں تاکہ اسٹریٹیجک اتحاد کے نقشے کو از سرِ نو ترتیب دینے کیلئے راہ ہموار کی جائے۔ اسلام آباد کے سیاسی ذرائع واشنگٹن اور اسلام آباد کے عسکری اداروں کے درمیان ایسے نئے معاہدوں کے امکان کو ظاہر کر رہے ہیں جو دہشت گردی کے خلاف جنگ سے وسیع تر ہوں گے اور اب گفتگو یورپی نیٹو کی طرز پر ایشیائی نیٹو کے قیام کے امریکی نقطہ نظر کی ہو رہی ہے جس کی قیادت امریکہ کرے گا۔ اس معاہدہ میں خطے میں واشنگٹن کے روایتی اتحادیوں کے ساتھ ساتھ نئے اتحادیوں اوزبکستان، ترکمانستان، قازقستان اور آذربائیجان کو بھی شامل کیا جائے گا اور اس کا مقصد تیل و گیس کی پائپ لائنوں کے جال کیلئے عسکری اور سیکیورٹی کا تحفظ فراہم کرنے والا علاقائی ضابطہ قائم کرنا ہے تاکہ چین یا روس کے کسی بھی قسم کی مداخلت کا سدِباب ہو سکے۔

سابق سوویت جمہوریتوں کے مسائل کے بارے میں ماسکو اور واشنگٹن کا موقف تضادات کا شکار ہے۔ اس کی وضاحت 26 جنوری 2004 کو امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کے دورہ ماسکو سے ہوتی ہے۔ چنانچہ ماسکو میں امریکی سفیر نے پاول کے دورہ سے کچھ عرصہ پہلے یہ بیان دیا کہ پاول کے پیش نظر سابق سوویت ری پبلکس کے مسائل کے بارے میں روس کے ساتھ تبادلہ خیال کرنا ہے۔ سفیر نے اشارہ کیا کہ اس دورے کا ایک اہم مقصد سابق سوویت جمہوریتوں کے بارے میں امریکہ اور روس کے درمیان "مشترکہ نکات" کے بارے میں بحث و تمحیص ہے۔ امریکی سفیر نے یہ اعتراف کیا کہ اس خطے کے اندر دونوں جانب کے تعلقات کی بہتری کے راستے میں کچھ مخصوص "مشکلات" حائل ہیں۔ اور اس وقت ہی ماسکو نے خطے میں دونوں ممالک کے درمیان خطے کو اثر و رسوخ کے لحاظ سے تقسیم کرنے کے کسی قسم کے "سمجھوتے" کی نفی کی۔ امریکی ذرائع نے اس حوالے سے دونوں ممالک کے تعلقات میں مشکلات کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حوالے سے نزاع میں اسی وقت سے شدت آنے لگی تھی جب مغربی میڈیا نے کچھ ایسی معلومات افشا کیں تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سارے انتظامات خطے میں اثر و رسوخ کی تقسیم کے پیشِ نظر روسی امریکی "ڈیل" کیلئے ہو رہے ہیں اور روسی تجزیہ نگاروں نے ماسکو میں تعینات امریکی سفیر کی بات کو دونوں فریقوں کے درمیان معاہدے کا اشارہ سمجھا۔

اور یہ بھی ہر کوئی جانتا ہے کہ ماسکو نے Commonwealth of Independent States (CIS) کے کئی ریاستوں کے اندر امریکی اثر و نفوذ کے بڑھنے، بالخصوص وسطی ایشیائی جمہوریتوں اور جارجیا میں امریکی فوج کی موجودگی سے متعلق اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ مزید اس کو ممالک مثلاً جارجیا کے اندرونی معاملات میں براہِ راست امریکی مداخلت تصور کیا گیا۔

پاول کے دورے کے سائے تلے بعض روسی سیاستدانوں نے امریکی سیکرٹری کے ساتھ اس موضوع پر بات چیت کا مطالبہ کیا اور روسی پارلیمنٹ میں خارجہ امور کمیٹی کے صدر کانسٹنٹائن کوستاچوف نے خطے میں امریکی فوج کی موجودگی کے معاملے کو دورے کے ایجنڈے میں شامل کرنے کی بات کی۔

اس تمام سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ امریکہ وسطی ایشیااور قوقاز میں بالکل ابتدائی مرحلے میں ہے اور یہ کہ امریکی کوششیں ابتدائی اقدامات سے آگے نہیں بڑھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خطے میں یہ کشمکش ابھی ابھی شروع ہوئی ہے کیونکہ یہ خطہ ماضی قریب تک سوویت یونین کی اجارہ داری میں تھا، لیکن خطے میں یہ کشمکش اپنے اندرروس کے ناگزیر مفادات کیلئے خطرات لئے ہوئے ہے۔ اسی طرح اس میں چین کیلئے بھی علاقائی خطرات پوشیدہ ہیں۔ امریکہ کا سٹریٹیجک مفادروس کو اس کے اثرونفوذ کے علاقوں سے بھگانے اور چین کو لگام دینے کا تقاضا کرتا ہے پس یہ کشمکش دنیامیں امریکہ کے واحد سپرپاور کے عہدے کو باقی رکھنے کے پروگراموں کے حصول کیلئے امریکی اسٹریٹجک مفاد کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ سب کچھ اس مسئلے کو اہم عالمی مسائل میں سے بنادیتا ہے جس پر کشمکش علاقائی حدود سے آگے بڑھنے والی ہے۔

پھر ایک اورعامل بھی ہے جواس خطے کو علاقائی یاعالمی سطح پر مؤثر ریاستوں کی توجہ کامرکز بناتا ہے اور یوں یہ ایک عالمی مسئلے کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ یہ عامل اس خطے کا کیمونیزم کے ستر سالہ دور میں اس کی جبری پابندی کے بعد اپنے دین، اسلام کی طرف واپسی ہے۔ چنانچہ کیمونسٹ دور کے خاتمے کے بعدلوگ اس قوت کے ساتھ اپنے اسلام کی طرف لپکے کہ جس نے دنیا کو متوجہ کیا، نہ صرف عبادات میں بلکہ انہوں نے اسلامی حکومت اور نظامِ خلافت کے قیام کی زبردست حد تک خواہش کی، حتی کہ "حزب التحریر" نے چند سالوں میں کئی ہزار مردوں اور عورتوں کو "خلافت" کی دعوت میں اپنے ساتھ شامل کیا۔ ان کاایمان زبردست تھاوہ اپنے آپ کو سختیوں میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں اوراللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کوخاطر میں نہیں لاتے۔

مگر ان کے حکمران جو سابقہ دور کی باقیات ہیں، اسلام کی طرف لوگوں کی گہری اور مضبوط واپسی کوناپسند کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے عوام کے خلاف پکڑ دھکڑ اور تشدد کے تجربات آزمائے اور اسلام کی اقتدار میں واپسی کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کیلئے انہیں روس، امریکہ، برطانیہ اوریہود تک کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ان علاقوں میں اس اسلامی لہر کوروکنے کیلئے مقامی انٹیلی جنس ایجنسیاں حرکت میں آئیں اورروسی امریکی وبرطانوی انٹیلی جنس فورسز کے ساتھ تعاون کیا۔ اسی طرح انہوں نے اسلامی فکر کے خلاف شکوک

وشبہات پھیلانے، پروپیگنڈا اور سیکولر افکار کو خوشنما اور رنگین بنانے کے اسالیب استعمال کئے۔ مگر ان لوگوں کے سینوں میں اسلام مستحکم ہو گیا ہے اور دن بدن اس کی قوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان شیطانی ہتھکنڈوں نے ان کو اسلام اور ایمان سے دور نہیں کیا۔ مغرب نے ان قوموں کے دلوں میں اسلام کی مضبوطی کی حقیقت کو بھانپ لیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ یہ ایک بھڑکتی ہوئی چنگاری میں تبدیل ہو رہی ہے۔ تیسری دنیا کے امور کا امریکی ماہر، رابرٹ ڈی کیپلان کہتا ہے، "وسطی ایشیا میں..... دنیا کے اس حصہ میں اسلام سب سے زیادہ پرکشش ہو گا کیونکہ یہ مظلوم اور مجبور و بے بس لوگوں کا سہارا بنتا ہے، تو عالمی سطح پر لگاتار پھیلنے والا یہ دین ہی واحد دین ہے، جو مقابلے اور چیلنج کیلئے تیار کھڑا ہے"۔

یہ خطہ اسلام کا ایک اہم قلعہ بن چکا ہے، یہ مشرقی ایشیا میں انڈونیشیا اور ملائشیا سے لیکر مشرق وسطیٰ تک ایک وسیع اسلامی کمان (آرچ) بناتا ہے اور یہ خطہ اس کمان کی چوٹی پر واقع ہے، جبکہ جغرافیائی اعتبار سے پاکستان اور ایران کے ساتھ اس خطے کے ممکنہ روابط، جو اس وسیع و عریض خطے میں ایک عظیم اسلامی ایٹمی ریاست کے قیام کو ممکن بناتے ہیں، روس اور امریکیوں کیلئے سنگین قسم کا خطرہ ہیں۔ اس لئے افغانستان پر امریکی قبضے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ امریکہ اس خطے کو قریب سے جھانک سکے، بالخصوص جبکہ یہاں کے حکمرانوں کا امت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور ان کا زوال ہونے والا ہے۔

ان علاقوں میں اسلامی تحریکات کی لہروں کی کثرت سے پیدا شدہ صورتحال کی سنگینی ان ریاستوں کے ساتھ معمول کی کانفرنسوں کا ایک سبب ہے، بالخصوص چین اور روس کے ساتھ، تاکہ اس خطے میں ابھرنے والے خطرات کا ازالہ کیا جائے۔ ان میں سب سے اہم شنگھائی کانفرنس تھی جس کی اولین ترجیحات میں اس خطرے کو رکھا گیا تھا جسے وہ اسلامی بنیاد پرستی یا اسلامی تحریکوں کا نام دیتے ہیں۔

اس طرح اس خطے کے اندر موجود بے پناہ وسائل اور روس و چین کی نسبت سے اس کا اسٹریٹجک محل وقوع اور امریکی لالچ، نیز اس کے اندر بڑھتی ہوئی اسلامی بیداری، یہ تمام امور یکجا ہو کر وسطی ایشیا کو ایک اہم عالمی مسئلہ بناتے ہیں۔

5 -برصغیر ہند کا مسئلہ

برصغیر ہند کا مسئلہ بھی پرانا ہے، مگر ماضی میں یہ اتنا نمایاں نہیں تھا جتنا کہ آج ہے اور نہ ہی یہ عالمی سطح پر سرفہرست بڑے مسائل میں سے تھا۔ اس مسئلے کے اندر جن نئے عوامل نے کردار ادا کیا اور اسے بڑے مسئلے میں تبدیل کیا، وہ تین امور ہیں: اسلامی لہر جو مسئلہ کشمیر سے پھوٹی، خطے میں چین کی بڑھتی ہوئی طاقت اور ہندوستان اور پاکستان کا ایٹمی طاقتوں کے گروہ میں داخل ہونا۔

جہاں تک اسلامی لہر کا تعلق ہے تو اسے قابو کرنا مشکل ہو گیا ہے، اس لئے امریکہ کی طرف سے افغانستان پر حملے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان اسلامی تحریکوں پر ایک جدید صلیبی حملہ کے ساتھ وار کیا جائے جو کشمیر کے مسلمانوں کی پشت پناہی کرتی ہیں، خاص طور پر جبکہ مسلمانوں کی قوت 1999ء میں بالکل واضح ہو گئی، جب پاکستان کے تعاون سے مسلمان مجاہدین نے پاکستان -ہندوستان سرحد پر واقع کارگل کی چوٹیوں پر حملہ کیا اور اگر سابق وزیر اعظم نواز شریف اور اس وقت کے چیف آف سٹاف پرویز مشرف نے خیانت کا ارتکاب نہ کیا ہوتا کہ ان دونوں نے امریکی ایما پر حملہ آور فوجوں کو واپس بلا لیا، تو قریب تھا کہ ہندوستانی فوج شکست سے دوچار ہو جاتی اور کشمیر کو آزادی مل جاتی۔

یہ حادثہ امریکیوں کیلئے خطرے کی گھنٹی تھی۔ اس نے خطے میں مسلمانوں کی طاقت میں اضافے کے بارے میں اسے سوچنے پر مجبور کیا، اس لئے امریکیوں نے اپنے ایجنٹ اور موجودہ صدر پرویز مشرف پر دباؤ ڈالا کہ وہ پاکستان میں موجود اسلامی (جہادی) کیمپوں کو ختم کرے۔ اس کیلئے جواز یہ تراشا کہ کشمیر میں ہندوستان کے خلاف لڑنے والے یہاں سے نکل کر جاتے ہیں اور یہ کہ وہ دہشت گرد ہیں۔

امریکہ نے پرویز مشرف پر دوبارہ دباؤڈالا کہ وہ کشمیر کے اسلامی مسئلے کے سیاسی تعاون سے دستبردار ہو جائے، تو اس نے امریکہ کا یہ مطالبہ بھی پورا کیا اور کشمیریوں کے حق خود ارادیت سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور دوطرفہ بنیادوں پر مسئلہ کشمیر کے حل کیلئے اسلام آباد میں پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے درمیان فوراً مذاکرات شروع ہوئے۔ ان مذاکرات کا آغاز یوں ہوا کہ پاکستانی حکومت نے کشمیر پر بھارت کا حق تسلیم کر لیا پس کشمیر پر مذکرات کا مقصد، کشمیر سے ہندوستانی قابض فوجوں کو نکالنا نہیں بلکہ معاہدوں کے ذریعے اس حق کو قانونی حیثیت دینا ہے۔

کشمیر کے مسئلے میں بالخصوص اپنے ایجنٹ پرویز مشرف پر امریکہ کے دباؤ ڈالنے کا مقصد صرف پاکستان میں بڑھتی ہوئی اسلامی تحریکوں پروار کرنا نہیں تھا، بلکہ خطے میں توازن کا قیام بھی تھا، تاکہ ہندوستان پاکستان کے ساتھ تنازع میں نہ الجھا رہے جس کے نتیجے میں چین خطے کی واحد قوت بن جائے۔ امریکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اس لئے بھی حالات کو پر سکون دیکھنا چاہتا ہے کہ ہندوستان پاکستان کے ساتھ اپنی مغربی سرحد سے محفوظ اور پُر امن ہو کر چین کیساتھ رسہ کشی کرے۔ اس کے لئے ہی ہندوستان اور پاکستان کو جنوبی ایشیا کے "سارک" گروہ میں شامل کیا گیا۔ اس طرح ایک ایسی بڑی قوت وجود میں آجائے گی جو تمام تر قابلیت کے ساتھ چین کا سامنا کر سکے۔ اگر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشمکش جاری رہی تو ہندوستان چین کا سامنا کرنے یا اس کے ساتھ طاقت کا توازن بر قرار رکھنے کے قابل نہیں رہے گا، بالخصوص جبکہ چین ایک بڑھتی ہوئی اقتصادی قوت بن چکا ہے اور دنیا میں سب سے بڑی آبادی بھی چین ہے، وہ سلامتی کونسل میں مستقل نشست کا حامل ہے اور ایک طویل عرصے سے ایٹمی ریاست ہے، یعنی یہ ہر لحاظ سے ایک ابھرتی ہوئی طاقت ہے۔ چین سے روس جیسی غلطی بھی سرزد نہیں ہوئی یعنی اس نے داخلی یکجہتی کی بھی حفاظت کی۔ طاقت ور چینی لیڈر Guofeng Hua ، جس نے ماوزے تنگ کے بعد چین کی نئے سرے سے اصلاح کی، نے کہا"وہ بڑی غلطی جو گورباچوف نے کی، یہ ہے کہ اس نے معیشت کی اصلاح کرنے سے پہلے سیاسی آزادی کی اجازت دے دی"۔

اس طرح امریکہ چین کی بڑھتی ہوئی طاقت کے بارے میں خاصا پریشان ہے اور خطے میں اس کا سامنا کرنے والی طاقت کھڑی کرکے اسے مشغول رکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے اسے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تنازع کا خاتمہ کرنے کی فکر لگی ہوئی ہے تاکہ چین کے ساتھ نبٹ سکے۔ اس سے پاکستان اور ہندوستان کے ایٹمی اسلحہ رکھنے پر امریکہ کی خاموشی اور رضامندی کا مقصد واضح ہو جاتا ہے، بلکہ ہندوستان کو خاص طور پر جدید اسلحہ رکھنے کا موقع فراہم کرنا اور اسلحہ کی ٹیکنالوجی میں اس کی ضروریات پوری کرنے کی سہولتیں دینا سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ امریکہ نے (اسرائیل) کو ریڈار والے جدید فالکن طیارے چین کو فروخت کرنے سے منع کیا، جبکہ ہندوستان کو یہی طیارے بیچ دینے کی اجازت دی۔ مزید یہ کہ امریکہ نے ہندوستان کے ساتھ اسٹریٹجک شراکت داری کے معاہدے کئے، یعنی اب ہندوستان کے ساتھ اس کے معاملات اسرائیل کی طرح ہوگئے ہیں، اس کے باوجود کہ ہندوستان نہ تو ایک مغربی ملک ہے، اور نہ ہی اینگلو سکسونک ریاست ہے۔

پس اس مسئلے میں نمایاں امور یہ ہیں: اسلامی لہر، چینی خطرہ اور ایٹمی پھیلاؤ۔ اس لئے امریکہ نے خطے میں اپنی اسٹریٹیجی اسلامی اور چینی پھیلاؤ کو روکنے اور خطے میں استحکام لاکر چین کی طاقت کو توازن میں لانے اور اس خطے میں کشمکش کے اسباب کا ازالہ کرنے کی بنیاد پر استوار کی، تاکہ یہ خطہ چین کا مقابل اور طاقت میں اس کے ہم پلہ ایک بڑی طاقت بن سکے۔

6 -افریقہ کا مسئلہ

افریقہ کا مسئلہ ایک جدید مسئلہ ہے، جو عالمی افق پر 1960 کے بعد ہی نمودار ہوا۔ یہ صرف اور صرف استعماری مسئلہ ہے کیونکہ افریقہ فکری طور پر پسماندہ ہے۔ اس میں خام مال کے بڑے ذخائر موجود ہیں اور وسیع زرعی وحیوانی وسائل کی موجودگی کا بھی اندازا لگایا گیا ہے۔ جب اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی میں استعماری طاقتوں نے دنیا کے ممالک پر ہلّہ بولا تو براعظم افریقہ بھی ان کے نرغے

میں آیا اور ہر ریاست جتنا کر سکتی تھی اس کے مطابق اسے کالونی بنایا۔ اسے کالونیاں بنانے میں استعماری ریاستوں کو زیادہ مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، اس لئے اکثر استعماری ریاستوں نے افریقہ میں استحکام حاصل کر لیا اور پورے کا پورا براعظم یورپ کی کالونی بن گیا۔ اس میں برطانیہ، فرانس، اسپین، ہالینڈ، جرمنی، اٹلی، پرتگال اور بلجیم کی کالونیاں موجود تھیں۔ برطانیہ کا اس میں بڑا حصہ تھا، اس کے بعد فرانس، پھر بلجیم اور پھر پرتگال کا نمبر آتا ہے۔ یہ آٹھوں استعماری ریاستیں دوسری عالمی جنگ تک افریقہ میں اپنی کالونیوں پر قبضہ جمائے رہیں۔ جب اقوام متحدہ کا چارٹر بنایا گیا تو اس میں استعمار کے خاتمہ سے متعلق کچھ شقیں رکھی گئیں، مگر اس مواد کو اس انداز سے رکھا گیا کہ یہ خاتمہ تدریجاً (مرحلہ وار) ہو گا۔ اس لئے بڑی ریاستوں نے 1960 کے بعد ہی افریقہ سے استعماری قبضے کے خاتمہ پر بحث کی۔ اس سے پہلے استعمار کے خاتمے کے پیش خیمہ کے طور پر اطالوی کالونیوں جیسی کچھ کالونیوں کا اقوام متحدہ کے زیر نگرانی رکھا گیا اور اس کیلئے ابتدائی طور پر کچھ سیاسی کاروائیاں کی گئیں۔ ان میں اہم ترین مثبت غیر جانبداری Non Alignment کی فکر، مثبت غیر جانبداری کانفرنسیں اور غیر جانبداری کا تصور تھا۔ جہاں تک مثبت غیر جانبداری کے تصور کا تعلق ہے، یہ دراصل ایک انگریزی فکر ہے جسے برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل نے انگریز ایجنٹ نہرو کو دیا اور اس سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ وہ اسے ہندوستان کی پالیسی کے طور پر اعلان کرے اور یہ کہ وہ ایشیائی ریاستوں میں اس کیلئے کام کرے۔ برطانیہ کا نہرو کو یہ تصور دینے میں راز یہ تھا کہ برطانیہ نے دیکھا کہ مشرق بعید اور ایشیا میں اس کی کالونیاں سب کی سب امریکہ اور روس (سوویت یونین) کی طرف سے خطرے میں ہیں۔ روس (سوویت یونین) کی طرف سے خطرہ یہ تھا کہ وہ اہلِ علاقہ کو استعمار سے آزادی و حریت حاصل کرنے پر اُبھار رہا تھا، بالخصوص جبکہ اس نے انڈونیشیا میں پیش آنے

والے حالات کو دیکھا اور امریکہ کی طرف سے خطرہ یہ تھا کہ امریکہ برطانیہ پر کالونیوں کو آزادی دینے کیلئے دباؤ ڈالے گا، پھر آزادی مل جانے کے بعد امریکہ ان کالونیوں کو قرضوں اور اپنے ماہرین کے ذریعے اپنی طرف کھینچے گا۔ جہاں تک آزادی کی فکر کا تعلق ہے تو چونکہ برطانیہ کی پرانی عادت ہے کہ وہ اس فکر کو استعماری اسلوب کو تبدیل کرنے کیلئے ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کرتا ہے، اس لئے اس نے اپنی چند کالونیوں کو آزادی دی

اوران کو بطور ملک تسلیم کر لیااوران کو نام نہاد برطانوی کامن ویلتھ کے نام سے منظم کیا۔ اس لئے اسے آزادی کے تصور سے زیادہ پریشانی نہیں تھی، وہ اسے پسند کرتا اوراس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس فکر کو اپنے استعمار کو مستحکم کرنے کیلئے کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسے ڈر یہ تھا کہ امریکہ قرضوں، امداد اورماہرین کے ذریعے ان آزادریاستوں پر اپنا تسلط جما لے گا۔ اس لئے اس نے مثبت غیر جانبداری کا تصور پیش کیا اورامریکہ وروس (سوویت یونین) کامقابلہ کرنے کیلئے یہ تصور نہرو کو دیا۔ نہرو نے ایساہی کیا اور مثبت غیر جانبداری کی طرف دعوت دینے لگا اوراس میں اچھی خاصی سرگرمی دکھائی۔ روس (سوویت یونین) نے اس کی افادیت کو سمجھا، اس لئے اس کی تائید کی اوراس سے فائدہ حاصل کرنے لگا، کیونکہ کسی بھی ریاست کے غیر جانبداررہنے کامطلب تھا کہ اسے مغرب سے الگ کرنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے تو اس کے سیاستدان اس حوالے سے باہمی اختلاف کا شکار تھے۔ بعض نے اس کی تحسین وتائید کی، کیونکہ غیر جانبداری کا تصوران ریاستوں کو قرضے اورامداد دیکر امریکہ کی طرف کھینچ لینے کاموقع فراہم کرتا ہے، جبکہ بعض نے اس کی مخالفت کی، کیونکہ یہ فکر کمیونیزم کوان ریاستوں کے اندر مداخلت کاموقع فراہم کرتی ہے۔ بہرحال نہرواس تصور کی طرف دعوت میں لگارہا۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ سرگرمیاں ہوں جن کے ذریعے اس تصور کا اظہار ہو سکے، چنانچہ اس نے چین کے ساتھ رابطہ کیااوراس کو غیر جانبدار ممالک کی کانفرنس منعقد کرنے کی فکر کی طرف دعوت دی۔ اس پر چین نے فوراً اتفاق کیااور کانفرنس کی تیاری کیلئے ایک کمیٹی وجود میں آئی۔ پھر اس کمیٹی نے ان بعض ممالک کے ساتھ رابطہ کیا جو کالونیاں رہنے کے بعد آزاد ہوئے تھے اوران کو غیر جانبداری کانفرنس کی دعوت دی۔ انڈونیشیا اس کمیٹی کارکن تھا، ان دنوں اس کا جھکاؤ امریکہ کی طرف نہیں ہوا تھا لیکن اسے ڈر تھا کہ یہ کام کمیونیزم کاساتھ دیناتصور کیاجائے گا۔ ایسالگتاہے کہ اس نے امریکہ کی رائے معلوم کرناچاہی تو امریکہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی، کیونکہ ان دنوں آئزن ہاور کی حکومت تھی اوروہ غیر جانبداری کی تائید کرتا تھا، اس لئے انڈونیشیا نے اس تصور کو اپنایا اور یہ تجویز دی کہ کانفرنس انڈونیشیا اور بندونگ (Bandung) میں ہو۔ اس پر پوری کمیٹی نے رضامندی ظاہر کی، اس طرح یہ کانفرنس 1954 میں بندونگ میں ہوئی۔ روس (سوویت یونین)، چین، برطانیہ اورامریکہ چاروں نے اس سے فائدہ اٹھاناچاہا، مگر

کانفرنس کا نتیجہ امریکہ، روس (سوویت یونین) اور چین کے حق میں نکلا کیونکہ اس میں ایسی قراردادیں پاس کی گئیں جو آزادی کی دعوت دیتی تھیں، جبکہ برطانیہ اس سے خوش نہیں تھا، کیونکہ وہ مثبت غیر جانبداری پر اکیلا بحث کرنا چاہتا تھا، یا اس لئے کہ کہیں یہ مثبت غیر جانبداری اسی کے خلاف استعمال نہ ہو جائے۔ امریکہ نے اس کانفرنس کا بڑا فائدہ اٹھایا، چنانچہ اس نے ٹیٹو، سوئیکارنو اور عبدالناصر کو اس کانفرنس اور اس تصور کو مضبوطی کے ساتھ اپنانے پر لگایا۔ یہ اشخاص برطانوی ایجنٹ نہرو کے ساتھ ملے جو اس تصور کا اصل علمبردار تھا۔ انہوں نے استعمار سے آزادی کی دعوت دینے اور استعماری ریاستوں کے خلاف مہم چلانے کیلئے اس کو ایک ذریعے کے طور پر اپنانا شروع کیا۔ اور اپنی زیادہ تر کوششیں افریقہ پر صَرف کیں۔ 1960 کے آتے ہی اس تصور نے افریقہ میں اپنا کردار شروع کیا۔ اس میں امریکہ کے ایجنٹ وجود میں آگئے۔ اسی دن سے کشمکش افریقہ کی طرف منتقل ہوگئی اور امریکہ سنجیدگی سے دیگر استعماری ریاستوں کو افریقہ سے نکالنے اور ان کی جگہ لینے کی کوشش کرنے لگا، اس لئے وہ ان استعماری ممالک پر کالونیوں کو آزادی دینے کیلئے دباؤ ڈالنے لگا۔ اس سے پہلے 1954 میں ہی اس نے الجزائر میں انقلابات بھڑکانے کا کام شروع کیا اور وہاں اپنے ایجنٹ بنائے۔ اس نے مصر اور عرب ممالک کو اس انقلاب کی پشت پناہی پر لگایا، اس طرح اس انقلاب نے استعماری ممالک کو متاثر کیا کہ وہ اپنی کالونیوں سے انخلا کریں۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے، تو وہ آزادی دینے کے معنی کو اچھی طرح جانتا تھا، اس لئے اس نے تھوڑے عرصے میں کئی کالونیوں کو آزادی دی، اس بنا پر زنجبار، تنجانیکا، نائیجیریا، یوگنڈا، نارتھ روڈیشیا یونین، ساؤتھ روڈیشیا اور نیاسالینڈ وغیرہ وجود میں آگئے۔ جہاں تک فرانس کی بات ہے تو اس میں پہلے ہچکچاہٹ تھی، مگر ڈیگال نے جب تیزی سے تبدیل ہونے والی عالمی صورتحال کو دیکھا تو اس نے بھی اسی منصوبے پر عمل کیا جسے برطانیہ نے نافذ کیا تھا۔ اس نے بھی کئی ریاستوں کو آزادی دی۔ اس طرح مراکش، تیونس، الجزائر، سینیگال اور گیبون وغیرہ کی ریاستیں وجود میں آگئیں۔ جہاں تک بیلجیئم کا تعلق ہے تو اس نے کانگو کو کالونی بنایا تھا جو افریقہ کی قیمتی کان ہے اور اس میں بڑی مقدار میں یورینیم پایا جاتا ہے جو ایٹم بم کی تیاری کا اصل اور بنیادی جزو ہے۔ اس لئے کانگو کو آزادی دینا آسان نہیں تھا، بالخصوص برطانیہ کا ان کمپنیوں پر کنٹرول تھا جو کاتنگا (Katanga) میں کانوں کا استحصال کرتی تھیں، جو کانگو کا ایک صوبہ ہے۔ اس لئے کانگو کو آزادی دینا ایک

بڑا مسئلہ کھڑا کر دیتا، لیکن امریکہ نے بلجیم پر کانگو کو آزادی دینے کیلئے دباؤ بڑھایا، تا آنکہ اس نے کانگو کو آزادی دیدی۔ چنانچہ کانگو ایک آزاد ریاست بن گیا۔ تب برطانیہ کے غصے اور اضطراب میں اضافہ ہوا۔ اس نے اپنا ایجنٹ مویس چومبی (Moise Tshombe) کو متحرک کیا اور اس نے کاتنگا کی کانگو سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ امریکہ نے اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں اٹھایا۔ چنانچہ اقوامِ متحدہ نے کاتنگا کی واپسی کیلئے عالمی فورس بھیجی اور اس وقت کا جنرل سیکرٹری Dag Hammarskjöld وہاں گیا۔ برطانیہ نے اس کے خلاف سازش تیار کی اور اسے قتل کر دیا۔ اب امریکہ اور برطانیہ کے درمیان کشمکش شدت اختیار کر گئی، جو کئی سالوں تک جاری رہی، یہاں تک کہ امریکہ نے کانگو پر تسلط حاصل کر لیا اور وہاں اپنی ماتحت حکومت قائم کی پھر چومبی کو وہاں سے نکال دیا، اس طرح کچھ عرصے کیلئے کانگو کے مسئلے میں سکون آگیا۔ اس دوران برطانیہ کو نیاسالینڈ، جنوبی اور شمالی روڈیشیا کے اتحاد کا ڈر ہوا۔ اس نے اس اتحاد کو توڑا اور نیاسالینڈ کو ملاوی کے نام کے ساتھ آزادی دے دی۔ اسی طرح شمالی روڈیشیا کو بھی آزادی دیدی اور اس کا نام زیمبیا رکھا۔ پھر جنوبی روڈیشیا کو ایسے حالات میں لانے کی کوشش کی جو وہاں پر اس کی استعماریت قائم رکھے، مگر چونکہ امریکہ اس حوالے سے برابر اس کا پیچھا کر رہا تھا، اس لئے برطانیہ نے بعد میں اس کو بھی زمبابوے کے نام کے ساتھ آزادی دیدی۔

امریکہ افریقی سینگ (Afican Horn) اور بڑی جھیلوں کی ریاستوں کو فرانس سے چھڑانے میں کامیاب ہوا جیسے یوگنڈا، روانڈا اور برونڈی، مگر نوے کے اواخر میں امریکہ کو چاڈ کو فرانس سے چھڑانے میں ناکامی ہوئی اور حسین حبری، جو فرانس کے ساتھ دوستی میں غیر مستقل تھا، کو شکست دینے کے بعد معاملے کا فیصلہ فرانس کے ایجنٹ ادریس دبی کے حق میں ہوا۔ حسین حبری فرانس سے دوستی کرتا تھا مگر پھر امریکہ نے اس کو اپنی طرف مائل کیا۔ یہی وجہ تھی کہ فرانس نے اپنے ایجنٹ ادریس دبی کو سپورٹ کیا اور اس کو اقتدار ملا۔

ادریس دبی Idrees Deby چاڈ کے صدر حبری کا آدمی اور اس کا مضبوط حلیف تھا۔ وہ اپریل 1989 تک چاڈ کی افواج کا جنرل کمانڈر رہا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے 1983 میں فیالارگو (Fialargo) کے معرکوں میں حبری کی فوج کی قیادت کی اور چاڈ سے لیبیا کی فوج کو ہٹانے میں کامیابی ملی، مگر ایک قبائلی اختلاف دبی کو اپنے حلیف حسن جاموس کے ساتھ ایک ناکام انقلابی کوشش میں کھینچ لایا جب دبی کو اپریل 1989 میں

اس کے عہدے سے برطرف کیا گیا۔ اس کے بعد وہ سوڈان فرار ہو گیا جہاں اس نے قومی تحریکِ نجات Patriotic Salvation Movement کو منظم کیا۔ اس تحریک نے صدر حبری کی حکومت کے مخالف دو قبائل زغاوۃ اور حجارہ سے بھی معاہدہ کیا۔ یہ قبائل چاڈ اور سوڈان کی سرحدی علاقوں میں سکونت پذیر ہیں۔ کرنل دبی کے فرانس کے ساتھ مضبوط تعلقات ہیں، یہ فرانسیسی فوجی ادارے کا سپوت ہے، اس نے 1958 کو پیرس میں ایک ملٹری سکول میں کورس حاصل کیا، اس لئے 1990 میں دبی کی کامیابی اور حبری کی شکست امریکی نفوذ پر زد اور فرانسیسی نفوذ کی تقویت تھی، کیونکہ اس وجہ سے ہی فرانس امریکہ کے بڑھتے ہوئے اثر کو روک پایا۔

جب امریکہ میں نوقدامت پرست (نیوکنزرویٹوز) اقتدار میں آگئے تو امریکہ براعظم افریقہ پر یلغار کے نئے اسالیب اختیار کرنے لگا۔ چنانچہ وہ یورپی ریاستوں کے ایجنٹوں کو بھگانے اور افریقی ریاستوں میں اپنے ایجنٹوں کو اقتدار میں لانے کیلئے اب صرف علاقائی جنگوں اور بحرانوں یا باغی تحریکوں کی پشت پناہی کرنے پر بس نہیں کرتا، جو کہ امریکی انتظامیہ کی دفاعی اور خارجی پالیسی رہی ہے۔ بلکہ اس نے ان اسالیب کے ساتھ بلاواسطہ مداخلت کا اسلوب بھی ملایا۔ چنانچہ اس نے دہشتگردی کے خلاف جنگ کے نام پر شمالی، وسطی اور مغربی افریقہ کی متعدد ریاستوں کے ساتھ فوجی معاہدے اور تعلقات قائم کئے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ آئندہ ادوار میں افریقہ پر کشمکش میں امریکہ کی بلاواسطہ فوجی مداخلت بنیادی کردار ادا کرے گی جبکہ اس کے ساتھ دیگر اسالیب بھی بروئے کار لائے جائیں گے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آئندہ دور میں افریقہ میں شدید ترین کشمکش برپا ہو گی۔ امریکہ نے پہلے بھی وہاں فوجی اڈے قائم کئے اور اب بھی شمالی، مغربی اور وسطی افریقہ میں مزید فوجی اڈے قائم کر رہا ہے۔ اس طریقے سے وہ باغی تحریکوں کی پشت پناہی کر سکے گا اور یہ تمام یورپی ریاستوں، بالخصوص برطانیہ کو نکالنے کیلئے علاقائی حکومتوں پر دباؤ ڈالنے کا ایک آلہ کار ہو گا۔ لیکن افریقہ میں چونکہ یورپی ریاستوں کے مفادات آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اس لئے اس مرحلہ میں افریقہ میں غیر معمولی خونریزی اور ظلم و بربریت کی مثال قائم ہو گی، بالخصوص جبکہ استعماری ریاستوں کی افریقہ میں صرف مادی فوائد حاصل کرنے اور قدرتی وسائل لوٹنے پر نظریں جمی ہوئی ہیں۔ اس بنا پر افریقہ میں کشمکش،

استعماری ریاستوں کے درمیان کشمکش ہے اوراسی وجہ سے یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ بنا اور ابھی تک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔اس لئے افریقہ کامسئلہ عالمی مسائل میں سے سمجھاجاتاہے۔

پس براعظم افریقہ پربڑی ریاستوں کے درمیان کشمکش اور کھینچ تان بیسویں صدی کی نوے کی دہائی سے شدت اختیارچکی ہے۔اس براعظم میں یورپی استعماری ریاستوں کے ساتھ ساتھ امریکہ اورروس(سوویت یونین)کا اثر بھی تھا اور جب روس(سوویت یونین)کمزور ہوااوراس کی افریقہ میں کوئی پرانی استعماری میراث بھی نہیں تھی، اس لئے وہ اس سے نکل جانے پر مجبور ہوا،جب اس نے گزشتہ صدی کی اسی کی دہائی میں انگولاسے انخلاکیا۔ اس طرح باقی چھوٹی یورپی استعماری ریاستیں بھی افریقہ سے نکل گئیں۔ اب اس میں صرف برطانیہ اور فرانس رہ گئے،ان دونوں نے برٹش کامن ویلتھ آرگنائزیشن اور فرینچ فرانکوفونی آرگنائزیشن کے دائرہ کار کے ذریعے اپنے آپ کوباقی رکھا۔ امریکہ افریقہ پر کنٹرول حاصل کرنے کیلئے برطانیہ اور فرانس کے ساتھ اپنے پورے زور کے ساتھ شدید مقابلے میں داخل ہوا۔ اسی امر نے برطانیہ اور فرانس کوافریقہ میں یورپی مفادات کے دفاع کیلئے ایک دوسرے سے تعاون کرنے اور مختلف افریقی ریاستوں کی طرف دونوں ریاستوں کے وزرائے خارجہ کے مشترکہ دوروں پر ابھارا۔

افریقہ میں ان تینوں ممالک کے درمیان کشمکش بدستور جاری ہے جس کامظاہرہ بیس سے زائد علاقائی جنگوں کی شکل میں ہواہے۔ اب تک سیرالیون،لائبیریا،آئیوری کوسٹ،صومالیہ،یوگنڈا،کانگو،روواانڈا،بروندی اور سوڈان اس کشمکش کی نمایاں ترین آماجگاہیں رہے ہیں۔

یہ کالا براعظم اس استعماری کشمکش کے سبب مسلح خونریز تنازعات میں مبتلاہے، جو آخری سالوں میں30 سے زائد ممالک کے درمیان 26 سے زائد تنازعات تک پہنچ گئے۔ ان مصنوعی تنازعات نے اس براعظم کو 370 ارب ڈالر سے زائدکامقروض بنایاجوبراعظم کے مجموعی قومی آمدنی کا 65٪ ہے اوراسی کے سبب18 ریاستوں میں 3 کروڑ سے زائد بارودی سرنگیں نصب کی گئیں جو پوری دنیا کے مجموعی سرنگوں کے چوتھائی سے بھی زیادہ ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ افریقہ پر مغربی استعماری ریاستوں کے درمیان کشمکش، کبھی کبھار بڑی ریاستوں کے درمیان معاہدوں اوراتفاقات (اجماع) میں تبدیل ہو جاتی ہے، جیسا کہ امریکہ اور برطانیہ کا شمالی سوڈان سے جنوبی سوڈان کی علیحدگی پر اتفاق ہوااور جیسا کہ فرانس اور امریکہ کا آئیوری کوسٹ کے ساحل پر معاہدہ ہوا، مگر اس کشمکش میں ان ممالک کے درمیان اقتصادی اور سیاسی مقابلہ بازی ہی نمایاں رہی ہے۔

اس طرح استعماریت کی بین الاقوامی کشمکش افریقہ منتقل ہوئی، چنانچہ یہ مسئلہ ایک عالمی مسئلہ بن گیا اور ابھی تک بین الاقوامی مسئلہ ہی ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ امریکہ وبرطانیہ اور فرانس سب نے افریقہ کو ایک ہی رابطہ کے تحت اکٹھا کرنے پر اتفاق بھی کیا جسے پہلے افریقی سمٹ آرگنائزیشن اور پھر افریقی یونین کا نام دیا گیا، مگر اس کانفرنس اور یونین کے اندروباہر ریاستوں، بالخصوص امریکہ اور برطانیہ کے درمیان کشمکش بدستور جاری ہے، جبکہ دنیا کی مشرقی اور مغربی بلاکوں میں تقسیم ختم ہو چکی ہے اوراب امریکہ یورپی ریاستوں، بالخصوص برطانیہ کو ان کی آخری کالونیوں بالخصوص افریقہ میں سے بھی نکالنے کے درپے ہے۔ یہ دکھائی دیتا ہے کہ امریکہ ان ریاستوں کی افواج کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کیلئے دہشتگردی کے خلاف جنگ کے نام سے افریقی ریاستوں میں سرایت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے پہلے بھی وہاں فوجی اڈے قائم کئے ہیں اور اب بھی شمالی، مغربی اور مشرقی افریقہ میں مزید فوجی اڈے قائم کر رہا ہے، اس طریقے سے وہ باغی تحریکوں کی پشت پناہی کر سکے گا اور یہ تمام یورپی ریاستوں، بالخصوص برطانیہ کو اس کی بقایا کالونیوں سے نکالنے کے لئے علاقائی حکومتوں پر دباؤ ڈالنے کا ایک آلہ کار ہو گا۔ لیکن افریقہ میں چونکہ یورپی ریاستوں کے مفادات آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں اس لئے اس مرحلہ میں افریقہ میں غیر معمولی خونریزی اور ظلم وبربریت کی مثال قائم ہو گی، بالخصوص جبکہ افریقہ میں ان کی نظریں صرف مادی فوائد اور قدرتی وسائل لوٹنے پر جمی ہوئی ہیں۔

یوں افریقہ کا مسئلہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔

یہ وہ بڑے عالمی مسائل ہیں جن کی وجہ سے سیاسی کاروائیاں عمل میں لائی جاتی ہیں، مگر اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ سیاسی کاروائیاں صرف ان مسائل کی بنا پر کی جاتی ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاستوں کے درمیان کشمکش کی اہم اور نمایاں ترین شکلیں یہ مسائل ہیں۔

امن کی حالت میں بین الاقوامی کشمکش ایسی سیاسی کاروائیوں کے ذریعے واقع ہوتی ہے، جس میں کبھی کبھار عسکری کاروائیاں بھی عمل میں لائی جاتی ہیں، جیسا کہ ویتنام میں ہوا یا زمانہ حال میں مشرق وسطیٰ (کویت، عراق اور افغانستان) میں ہوا اور کبھی اس کے ساتھ عسکری کاروائیاں عمل میں نہیں لائی جاتی ہیں جیسا کہ سابقہ زمانے میں روڈیشیا اور جنوبی افریقہ میں ہوا اور تیونس اور لیبیا میں جو کچھ ہوا۔ اور چونکہ یہ کشمکش مسائل یا تنازعات کے وجہ سے ہوتی ہے اور یہ چھ مسائل ریاستوں کے درمیان کشمکش کا اہم سبب ہیں، اس لئے ہم نے سیاسی کاروائیوں کیلئے ان کو بطور مثال پیش کیا، ورنہ سیاسی کاروائیاں ان کے علاوہ دیگر مسائل میں بھی عمل میں لائی جاتی ہیں، بلکہ کبھی کبھی کسی کشمکش کے بغیر بھی سیاسی کاروائیاں کی جاتی ہیں اور چونکہ بڑی ریاستوں کی آپس میں کشاکش جاری رہتی ہے اور یہ ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کے جال بُنتی رہتی ہیں، اس لئے یہ ایک لازمی امر ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف سیاسی کاروائیاں کریں۔ ان کاروائیوں کا مقصد یا تو ایک عالمی سازش کا آغاز ہوتا ہے، تاکہ دوسری ریاست اس میں پھنس جائے، یا پھر یہ دوسری ریاست کو کمزور کرنے کیلئے ہوتی ہیں، یا اپنے آپ کو مضبوط کرنے کیلئے، یا کسی اور وجہ سے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے مثلاً غیر مسلح کرنے کا تصور، یہ جب لیگ آف نیشن میں لایا گیا، برطانیہ نے اسے فرانس کو کمزور کرنے کیلئے ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا اور وہ فرانس پر اس تصور کی تنفیذ کیلئے دباؤ بڑھانے لگا، جبکہ برطانیہ ظاہر یہ کر رہا تھا کہ گویا وہ اسلحہ میں تخفیف کر رہا ہے۔ چنانچہ فرانس نے اس کو سچ جانا اور عملی طور پر اپنے اسلحہ میں کمی کی اور اپنے آپ کو مسلح کرنے کی سرگرمی بند کر دی، حالانکہ یہ برطانیہ کی طرف سے فرانس کو برطانیہ اور جرمنی کے مقابلے میں کمزور کرنے کی ایک سازش تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دوسری جنگ عظیم میں فرانس، جرمنی کے مقابلے میں قائم نہ رہ سکا اور جلد ہی خوفناک طریقے سے شکست سے دوچار ہو گیا۔ اس میں تخفیف اسلحہ کے تصور کا بڑا عمل دخل تھا۔

اور مثلاً جب دوسری جنگ عظیم ہوئی تو روس (سوویت یونین) نے چین کے اندر کام کیا اور وہاں ایک مضبوط کمیونسٹ پارٹی قائم کی اور حکومت ہاتھ میں لینے کیلئے اس پارٹی کی مدد کی، جبکہ امریکہ وہاں پر موجود حکومت کی پشت پناہی کر رہا تھا، لیکن پھر وہ چینگ کائی شیک (Chiang Kai Shek) کی پشت پناہی کرنے لگا، اور شروع میں کمیونسٹوں کو اپنے ساتھ ملانے پر لگایا، یہاں تک کہ اسے قوت اور اہمیت حاصل ہوئی۔ پھر کمیونسٹ اس سے الگ ہو گئے اور اس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ امریکہ نے چینگ کائی شیک کی علانیہ پشت پناہی شروع کر دی اور مال اور اسلحہ کے ساتھ اس کی مدد کی، جبکہ وہ خفیہ طور پر کمیونسٹ پارٹی کی بھی حوصلہ افزائی کر رہا تھا اور چان کائی چیک کی سرگرمیوں کو محدود کر رہا تھا۔ پس اقدامات کو اس نہج پر مرکوز رکھا گیا جو کیمونسٹ لوگوں کی کامیابی کا باعث ہوئے اور اسی وجہ سے وہ اس قابل ہوئے کہ پورے کے پورے چین میں اقتدار سنبھال لیں اور چینگ کائی شیک کو ملک بدر کر دیا اور اس کو جزیرہ فرموزا (حالیہ تائیوان) میں محصور کر دیا گیا۔ چینگ کائی شیک حیرت و استعجاب کے عالم میں تھا۔ اس کے تصور میں بھی یہ نہ تھا کہ امریکہ چین کو کیمونسٹ ریاست بنانے پر کام کر رہا ہے۔ وہ اس کو امریکہ کی بیوقوفی سے تعبیر کرتا تھا اور یہ کہ اسے حالات کا ادراک نہیں، مگر بعد میں یہ واضح ہوا کہ امریکہ نے اس کیلئے باقاعدہ منصوبہ بندی کی تھی کہ چین کو کمیونسٹ ریاست بنایا جائے تاکہ چین روس (سوویت یونین) کے مقابلے میں کھڑا ہو سکے تاکہ کیمونسٹ گروہ کا شیرازہ بکھیرا جا سکے اور اسے ملیامیٹ کیا جا سکے۔ فی الواقع امریکہ اس منصوبے میں کامیاب ہوا، اگرچہ اس کی یہ کامیابی دس سالوں میں مکمل ہوئی۔ تو یہ ایک سیاسی کاروائی تھی جو امریکہ نے سرانجام دی۔ یہ ایک بڑی بین الاقوامی سازش سمجھی جاتی ہے۔ اور مثلاً جنگِ عظیم دوم کے بعد جب یورپ تباہ حال ہو گیا اور اس پر غربت چھا گئی اور روس (سوویت یونین) کی طرف سے اس کو دھمکایا گیا تو اس نے اپنے آپ کو امریکہ کی جھولی میں پھینک دیا اور اسے مدد کیلئے پکارا۔ امریکہ نے یورپ کی مدد کی اور مارشل پلان ترتیب دیا اور یورپ پر امریکی امداد کا دھارا کھل گیا۔ یہ امداد اقتصادی اشیاء، اسلحہ اور ماہرین کی شکل میں تھی۔ اس امداد کے ذریعے امریکہ کمپنیوں میں ایک شراکت دار کی حیثیت سے شامل ہو گیا اور اس نے تربیت یافتہ افراد کی امریکہ ہجرت کرنے کی حوصلہ افزائی کی اور یورپ کی معیشت امریکی معیشت کے ساتھ نتھی ہو گئی۔ چنانچہ بمشکل دس سال ہی گزرے

ہوں گے کہ یورپ کا انحصارامریکہ پر ہو گیا،وہ امریکہ کے زیر دست ہو گیااوراس کی اقتصادیات عمومی طور پر امریکی کمپنیوں کی ملکیت میں آگئی۔ اس طرح یورپ کے لیے امریکی امداد اس کوامریکہ کے ساتھ جوڑنے،اس کے تربیت یافتہ لوگوں کو اپنے ہاں لے جانے اوراس کی معیشت میں شریک ہونے کیلئے ایک سازش تھی۔

اور مثلاً جب جرمنی دوسری جنگ عظیم سے باہر آیاتو اس کے زخموں سے خون رِس رہاتھااوراس کی صنعت تباہ ہو چکی تھی۔ تب امریکہ نے اس کے ساتھ تعاون کرنے میں جلدی کی۔ امریکہ ریاستوں کے اندر صنعت کے سنگ بنیاد کے متعلق اس اہم نقطے کاادراک رکھتا تھا کہ ایک ریاست تب ہی حقیقت میں عالمی سطح کی صنعتی ریاست بن سکتی ہے جب وہ جنگی صنعت کواپنی صنعت کی بنیاد قراردے اور اپنی پوری صنعت جنگی صنعت کی بنیادوں پر استوار کرے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر جرمنی اس بنیاد پر اپنی صنعت کو بحال کرتا ہے تواسے ایک بار پھر بڑی ریاست بننے میں دیر نہیں لگے گی۔ اس لئے امریکہ جرمنی کی طرف لپکا اوراس کے لیے صنعتی پروگرام تیار کیا۔ چنانچہ اس نے جرمنی کی صنعت کو جنگی بنیاد کے بجائے اقتصادی اور سرمایہ کاری کی بنیادوں پر قائم کیا۔ اس مقصد کے لئے وہاں امریکی کمپنیوں کی بھرمار شروع ہوگئی اور جرمنی کی صنعت کوامریکی دولت کے ذریعے کھڑا کیا گیا۔ اس طرح اس نے جرمنی پر اس حیثیت سے وار کیا کہ جرمنی ایک فوجی ریاست تھی۔ تو اگرچہ جرمنی کے اندر بڑے بڑے کارخانے وجود میں آگئے اور صنعتی لحاظ سے اس کی معیشت بہتر ہوئی اور جرمنی دوسری جنگِ عظیم سے پہلے کے مقابلے میں معاشی طور پر مضبوط ہو گیااور دنیانے محسوس کیا کہ جرمنی نے کتنی جلد اپنی صنعت کو بحال کر لیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ صنعت کی اس نوعیت کی وجہ سے جرمنی نے خودکشی کی اوراب یہ کبھی بھی کھڑا نہ ہو سکے گا،جب تک کہ وہ اپنی صنعت پر نظر ثانی نہ کرے اوراس کو بنیاد سے تبدیل نہ کرے اوراپنی صنعت کو جنگی بنیادوں پر استوار نہ کرے اور جب تک وہ امریکی کمپنیوں اور سرمایوں کو ملک سے نکال باہر نہ کرے، وہ معاشی لحاظ سے بھی آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ امریکہ کی جانب سے جرمنی کے ساتھ اس قسم کا تعاون ایک سیاسی کاروائی ہے جو کہ ایک عالمی سازش تھی اوراس کے ذریعے جرمنی پروار کیا گیانہ کہ اس کی مدد کی گئی۔

اور مثلاً جب کیوبا کے صدر کاسترو نے کیمونسٹ بلاک کے ساتھ رابطہ کیا اور روس (سوویت یونین) سے تعاون کا مطالبہ کیا تو امریکہ نہیں گھبرایا حالانکہ مونرو نظریہ براعظم کے تمام ممالک کیلئے امریکہ پر یلغار کے بارے میں سوچنے کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ جب روس (سوویت یونین) نے کاسترو کو اسلحہ کے ذریعے مدد دینا شروع کی تو امریکہ پھر بھی خاموش رہا، باوجود یہ کہ ایسا کرنا بین الاقوامی روایات کے لحاظ سے امریکہ کے اندر براہِ راست مداخلت شمار کیا جاتا۔ امریکہ کی یہ خاموشی کسی ڈر کی وجہ سے نہیں تھی نہ اس لئے کہ امریکہ اس سے بے خبر تھا، جبکہ کیوبا اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ یہ امریکہ کی طرف سے روس (سوویت یونین) کو نئی دنیا میں توسیع کی طرف گھسیٹ لینے کی ایک سازش تھی، تاکہ روس اتنا پھیلاؤ اختیار کر لے کہ وہ اپنی حمایت کو نبھا نہ سکے۔ ایسا کرنے سے روس کی پوزیشن کمزور پڑ جائے گی جبکہ امریکہ کو تقویت حاصل ہو گی۔ یہی وجہ تھی کہ بہت سے سیاستدان، حتیٰ کہ خود روسیوں نے بھی روس کے اس فعل کو حماقت سے تعبیر کیا اور اگر دونوں ممالک کے درمیان ویانا میں معاہدہ نہ طے پایا ہوتا، تو امریکہ کے اندر روس (سوویت یونین) کی توسیع اس کے لئے وبالِ جان بن جاتی۔

یہ کہنا درست نہیں کہ امریکہ اس کی وجہ سے غضب ناک ہوا تھا اور اگر روس (سوویت یونین) اس کا ادراک نہ کر لیتا اور کیوبا میں نصب کئے گئے اپنے ایٹمی میزائل کو ہٹا نہ لیتا تو امریکہ روس کے اس اقدام کی وجہ سے جنگ میں کود نے ہی والا تھا۔ یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ کینڈی کی طرف سے روس کو کیوبا میں میزائل نصب کرنے پر دھمکی اور اس کے بعد خروشیف کا میزائل ہٹانے کا عمل دونوں فریقین کے درمیان ایک طے شدہ اور مصنوعی کاروائی تھی، کیونکہ کینڈی اور خروشیف کے درمیان ہونے والے معاہدات میں سے ترکی میں موجود امریکی ایٹمی اڈے اور کیوبا میں روسی ایٹمی اڈے کا ہٹانا بھی تھا۔ امریکہ کیلئے کسی ہنگامے کے بغیر ترکی سے اپنے اڈے کو ہٹانا ممکن تھا کیونکہ ترکی کو اس اڈے کے ہٹنے سے کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہونے والا تھا اور یہ ترکی اور امریکہ کے درمیان غلط فہمی کا باعث بھی نہ ہوتا، جبکہ روس (سوویت یونین) کی خواہش پر کیوبا سے ایٹمی اڈے کو ہٹانے کا معنی کیوبا کے دفاع سے کنارہ کشی کے مترادف ہوتا اور اس کی وجہ سے کیمونسٹ ریاستوں اور خود کیوبا کے مشتعل ہونے کا خطرہ تھا اور اس سے روس (سوویت یونین) اور کیوبا کے درمیان غلط فہمی

کا پیدا ہونا بھی ممکن تھا۔ اس لئے اس اڈے کو ہٹانے کیلئے ایک ایسے اسلوب کی ضرورت تھی جس سے کیمونسٹ ریاستوں کی نظر میں روس کی حیثیت متاثر نہ ہو۔ اس کیلئے ان دونوں نے اس پر اتفاق کیا کہ امریکہ عالمی کشیدگی کیلئے ایسا سبب گھڑے جو اس اڈے کو ہٹانے پر منتج ہو۔ کینڈی نے اس اسلوب کیلئے ایسے وقت کا انتخاب کیا جس سے اس نے اپنا مفاد بھی حاصل کیا۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ برطانیہ نے مداخلت کر کے یمن سے مصری افواج کو بھگانے کیلئے عدن اور بیحان میں اپنے افواج کو متحرک کیا ہے اور اس نے دیکھا کہ برطانیہ نے مصری فوج کے خلاف اشتعال انگیزی شروع کی ہے اور بیجان کی طرف سے اس پر یلغار کرنے والا ہے، تو اس نے کیوبا میں ایٹمی میزائل کا مسئلہ اٹھایا اور عالمی کشیدگی پیدا کی، حتیٰ کہ برطانیہ اور فرانس کو عالمی جنگ چھڑ جانے کا خوف ہونے لگا۔ پس برطانیہ نے یمن میں مداخلت سے ہاتھ کھینچ لیا اور خروشیف نے بھی پسپائی کا مظاہرہ کیا اور کیوبا سے اپنا اڈہ ہٹانے پر آمادگی کا اظہار کیا، بشرطیکہ امریکہ ترکی سے اپنا اڈہ ہٹالے۔ پھر کینڈی نے اس بات کا اظہار کیا کہ وہ اس پر مذاکرات کیلئے تیار ہے، پھر ترکی سے اڈے کو ہٹالیا گیا۔ یہ اس مسئلے کی حقیقت ہے۔ یہ ایک مصنوعی کاروائی تھی جو کیوبا سے اڈہ ہٹانے کے لیے روس کو جواز فراہم کرنے کیلئے اور برطانیہ کو ڈرانے کیلئے کی گئی۔

اس بات کی دلیل کہ کیوبا میں روس (سوویت یونین) کا اپنا ایٹمی اڈہ بنانے پر امریکہ کی خاموشی ایک سازش تھی اور یہ ایک عالمی سازش تھی، عالمی جنگ کے بعد یونان میں پیش آنے والے حالات ہیں۔ جب وہاں کمیونسٹ انقلاب اُٹھا تو یوگوسلاویہ کے ٹیٹو نے سٹالن کو یہ پیشکش کی کہ یوگوسلاویہ یونان میں مداخلت کر سکتا ہے اور یونان میں کیمونسٹ بلاک کے ساتھ ملحق ایک کیمونسٹ ریاست قائم کر سکتا ہے۔ لیکن اسٹالن نے اس تجویز میں پوشیدہ خطرات کو بھانپ لیا اور ٹیٹو سے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ: کیا تم دنیا کی طاقتور ترین اور امیر ترین ریاست کے خلاف ہم سے بحر روم پر اڈہ قائم کروانا چاہتے ہو؟ اور کیا ہم اس اڈے کی حفاظت کر سکیں گے، ہم زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ امریکہ کیلئے اُلجھاؤ پیدا کریں۔ ہم امریکہ سے یونان کو نہیں لے سکتے کیونکہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں اور ہم اس کے بارے میں ہرگز نہیں سوچ سکتے۔

اور مثلاً جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی، تو ہٹلر کو ڈر ہوا کہ ترکی برطانیہ کا ساتھ دیتے ہوئے جنگ میں داخل ہو جائے گا، یعنی ہٹلر کو ترکی کے اتحادیوں کے ساتھ مل جانے کا ڈر ہوا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ ترکی میں برسر اقتدار طبقہ مصطفیٰ کمال کی جماعت عوامی پارٹی برطانیہ کا ساتھ دیتی ہے اور اپنے اوپر انگریز کے احسانات کا اعتراف کرتی ہے، اس لئے ان کو جنگ میں اپنے ساتھ ملانا انگریز کیلئے بہت ہی آسان ہے۔ اسے اس بات کا علم تھا، اس لئے اسے جرمنی کے خلاف ترکی کے جنگ میں کود جانے کا خوف ہوا تو اس نے ترکی کو غیر جانبدار رکھنا چاہا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ترکی اگر اس کے خلاف جنگ میں اترے گا تو اسے تین طرح کا نقصان ہو گا۔ پہلا یہ کہ ترک قوم انگریزوں سے زیادہ بہادر ہے بلکہ فرانسیسیوں اور روسیوں سے بھی بڑھ کر بہادر ہے۔ اس لئے اتحادیوں کے ساتھ ترکی کا جنگ میں داخل ہونا ان کو بھاری تقویت فراہم کرے گا۔ دوسرا یہ کہ ترک قوم ایک مسلم قوم ہے، تو ان کا جنگ میں داخل ہونا تمام مسلمانوں، خواہ عرب ہوں یا غیر عرب، کے جذبات کو جرمنی کے خلاف کر دے گا۔ یہ عالمی پروپیگنڈے میں بھی بہت اثر دکھائے گا۔ تیسرا یہ کہ ترکی ایک منفرد اسٹریٹجک محل وقوع رکھتا ہے، تو اگر یہ غیر جانبدار رہے تو یہ شمال مغربی محاذ پر ایک حفاظتی حصار کا کام دے گا۔ یوں یہ یورپ میں اتحادیوں کے داخلے میں ایک رکاوٹ ہو گا اور عقبی حملے سے بچاؤ کیلئے ایک مضبوط آڑ ہو گا۔ اس لئے ہٹلر نے ترکی کو غیر جانبدار رکھنے کی خواہش کی، چنانچہ اس نے اپنے چالاک ترین آدمی وان پیپن کو ترکی کیلئے سفیر بنا کر بھیجا تا کہ ترکی کو غیر جانبدار بنانے اور اس کو اتحادیوں کی جانب داری میں جنگ میں داخل ہونے سے روکنے پر کام کرے۔ چونکہ اتحادیوں کے خلاف ترکی کے جنگ میں داخلے کی کوئی امید نہیں تھی، اس لئے ہٹلر کو یہ فکر تھی کہ ترکی جرمنی کے خلاف اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں شریک نہ ہو جائے، اس لئے اس نے اس کام کیلئے اپنا بہترین آدمی بھیجا، لیکن اپنے ارادے کو چھپانے کیلئے اس نے یوں ظاہر کیا کہ وان پیپن کو بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ ترکی کو جرمنی کی جانب کھینچ لے اور اسے اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دینے پر قائل کرے۔ چنانچہ اتحادیوں نے بھی اپنی طرف سے ترکی کو غیر جانبدار رکھنے کی خواہش کی اور اس مقصد کیلئے ان کے سفیروں نے خوب کوشش کی۔ چونکہ وان پیپن بظاہر ترکی کو جرمنی کی جانب لینے میں مصروف تھا، اس بناپر اتحادیوں نے ترکی کو غیر جانبدار رکھنے کی مکمل کوشش کی۔ اس سیاسی کھیل اور وان پیپن کی چالاکی کی وجہ

سے ہٹلر ترکی کو جنگ کے پورے عرصے میں غیر جانبدار رکھنے میں کامیاب رہا، باوجود یکہ اتحادیوں کیلئے ترکی کی جانب سے اس کو ساتھ ملا کر جرمنی پر یلغار کرنا مشکل نہیں تھا، لیکن وہ اس محاذ کے کھل جانے کے خوف سے یہ کام نہ کر سکے۔ اوران کی بھی یہ خواہش رہی کہ ترکی غیر جانبدار ہی رہے تاکہ اس محاذ کو محفوظ کیا جائے، تو اس طرح کی سیاسی کاروائیاں جنگ کی حالت میں اثر انداز ہونے والی کاروائیاں سمجھی جاتی ہیں۔

یہ ان بین الاقوامی سیاسی کاروائیوں کی چند مثالیں تھیں جنہیں ریاستیں ایک دوسرے کے خلاف عالمی کشمکش اور عالمی زندگی میں استعمال میں لاتی ہیں۔ ان جیسی کاروائیاں یا تو ایک بین الاقوامی جال پھینکنے کیلئے کی جاتی ہیں یا دیگر ریاستوں کو کمزور کرنے یا سیاسی داؤ پیچ وغیرہ کیلئے کی جاتی ہیں۔ یہ کاروائیاں جیسے عام بین الاقوامی زندگی میں وقوع پزیر ہوتی ہیں، اسی طرح بین الاقوامی چھ مسائل پر موجود کشمکش میں بھی عمل میں لائی جاتی ہیں، لیکن اس وقت یہ ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہوتی ہیں یا دو ریاستوں کے درمیان یا باہم برسرپیکار ممالک کے درمیان واقع ہوتی ہیں، البتہ جب یہ عمومی شکل میں واقع ہوں تو ان کا بین الاقوامی سطح پر وسیع اثر ہوتا ہے۔ اس لئے سیاستدان کیلئے ضروری ہے کہ وہ صرف اہم مسائل اوران کے سلسلے میں کی جانے والی سیاسی کاروائیوں تک اپنا ذہن محدود نہ رکھے، بلکہ اپنی نظر کو ہر اس سیاسی کاروائی تک وسیع کرنا لازم ہے، جسے کوئی بھی بڑی ریاست عمل میں لائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک سیاستدان جب سیاسی کاروائیوں میں غور کرے تو وہ انہیں ان مخصوص حالات سے الگ کرنے سے باز رہے جن میں وہ واقع ہوئی ہوں اور نہ ہی ان کو عمومی(generalization) بنائے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ایک سیاست دان ہر کاروائی کو اس پر محیط حالات کے ساتھ جوڑے، اور وہ اس کاروائی کو ان حالات سے علیحدہ کر کے نہ لے اور نہ اس موضوع کو بالکل عام کر دے، اور نہ ہی ایک کاروائی کے اوپر کسی بھی دوسری کاروائی کو قیاس کرے اور نہ یہ کہ کاروائیوں کو منطقی ترتیب دے اوران سے منطقی نتائج اخذ کرے۔ ان تمام سے انتہائی اجتناب ضروری ہے کیونکہ سیاسی سمجھ بوجھ کیلئے منطق اور قیاس سے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں، کیونکہ سیاسی اعمال آپس میں ہم آہنگ نہیں ہوتے، ان میں یکسانیت و مماثلت نہیں پائی جاتی، بلکہ ہر کاروائی کے اپنے مخصوص حالات ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک سیاستدان کا یہ فرض بنتا ہے کہ سیاسی عمل کو اسی سے متعلقہ سابقہ سیاسی معلومات کے ساتھ جوڑے اوراس کا اس

عمل کے حالات کے اندر مطالعہ کرے، تب اسے جو فہم حاصل ہو گا وہ حقیقت کے زیادہ قریب ہو گا۔ اس کی مثالیں اَن گنت ہیں، عالمی زندگی میں روزانہ پیش آنے والے واقعات وحوادث یا بڑی ریاستوں کی سیاسی کاروائیاں ان مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر کاروائی ایک ایسی بنیاد کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہے، جس کا ریاست کی پالیسی، عالمی صورتحال یا ریاستوں کے حالات کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور یہ کہ ہر ایک عمل کے اپنے مخصوص حالات ہوتے ہیں اور اس کے اپنے مخصوص لوازمات ہوتے ہیں۔ مثلاً اپریل 1969ء میں ایسا ہوا کہ شمالی کوریا نے مشرقِ بعید میں امریکہ کا جاسوس طیارہ مار گرایا، جس نے امریکہ کو ہلا کر رکھ دیا اور نیشنل سیکیورٹی کونسل سر جوڑ کر بیٹھ گئی مگر صدر نکسن نے یہ فیصلہ منظور کروایا کہ امریکہ طیارہ مار گرانے کے انتقام کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ بس یہ ہوا کہ امریکہ کے جاسوسی طیارے اور جاسوسی بحری جہاز کسی ممکنہ حملے سے بچنے کیلئے سرگرم ہوگئے، جبکہ 1968 میں جب شمالی کوریا نے امریکہ کی ایک جاسوسی کشتی کو قبضے میں لیا تھا تو اس وقت بھی امریکہ کو بے چینی ہوئی تھی اور نیشنل سیکیورٹی کونسل کا اجلاس ہوا تھا اور صدر جانسن نے دھمکی دی تھی اور بحر الکاہل میں امریکہ کا ساتواں بحری بیڑا کوریا کی طرف حرکت کرنے لگا تھا۔ جب امریکہ نے دیکھا کہ اس کی دھمکی اور اعصابی جنگ کا کوئی اثر نہیں ہوا تو وہ مذاکرات اور دوستانہ ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہوا، یہاں تک کہ شمالی کوریا نے جہاز کے عملے کو رہا کر دیا۔ تو یہ دونوں واقعات ایک ہی نوعیت کے حامل ہیں، یعنی کوریا جیسی ایک چھوٹی ریاست کا امریکہ جیسی بڑی ریاست کے معاملات میں مداخلت کرنا، اس کے طیارے پر حملہ، اس کے پائلٹ کا قتل، نیز اس کے بحری جہازوں کی اس کے عملے سمیت گرفتاری۔ سوال یہ ہے کہ امریکہ نے ان دونوں واقعات میں کیونکر مختلف موقف اختیار کیا؟ کیا اشخاص کی وجہ سے ایسا ہوا؟ شاید یہی وجہ ہو۔ کیا ایسا اس لئے ہوا کہ ماضی میں ان دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا، یہ بھی ممکن ہے، لیکن ظاہر ایسا ہوتا ہے کہ بحری جہاز کا واقعہ معمول کے حالات میں ہوا تھا جب چین ثقافتی انقلاب میں مشغول تھا۔ اس لئے دھمکی ممکنہ خطرات کا باعث نہیں تھی۔ لیکن جہاں تک طیارے کے واقعے کا تعلق ہے تو وہ غیر معمولی حالات میں ہوا تھا۔ اس وقت روس (سوویت یونین) وسطی یورپ میں اپنی زمینی اور فضائی افواج کو اکٹھا کر رہا تھا اور اپنی بحری طاقت کو بحر روم میں لا رہا تھا۔ انہی حالات میں چین ثقافتی انقلاب کے بعد اب اپنے آپ کو دنیا کو دکھانے کی حالت میں آیا تھا

اوراس سلسلے میں روس (سوویت یونین) کو بھڑکا رہا تھا۔ تو اگر نکسن کوریا کو دھمکیاں دینے لگتا تو چین کا اس پر رد عمل ظاہر کرنے کا احتمال تھا اس طرح یہ کشمکش اور کشیدگی میں اضافے کا پیش خیمہ بن سکتا تھا اور ممکن تھا کہ برطانیہ اس کو مشرقی بلاک کے خلاف اشتعال انگیزی کا ذریعہ بنالیتا، اس لئے یہ درست نہیں تھا کہ امریکہ کوئی دھمکی دے یا اعصابی جنگ چھیڑ دے، اس لئے نکسن خاموش رہا۔

تو ان دونوں کاروائیوں کے حالات مختلف تھے، چنانچہ اس حوالے سے اقدامات میں بھی اختلاف آیا۔

اور مثلاً عہدۂ صدارت سنبھال لینے کے فوراًبعد نکسن نے یورپ کا دورہ کیا۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ مشرق وسطیٰ کے بحران کے سلسلے میں اپنے اتحادیوں کے پاس جارہا ہے تاکہ روس (سوویت یونین) سے رابطہ کرنے سے پہلے ان کی رائے لی جائے اوراگر اس دورہ کے کچھ دیگر اسباب نہ ہوتے تو اس کی بات کی تصدیق کی جاسکتی تھی، مگر گہری نظر سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت برطانیہ یورپی ریاستوں کے ساتھ رابطے کررہا تھا تاکہ انہیں مشرق وسطیٰ کے بحران کے سلسلے میں اپنے ساتھ ملالے اورانہیں روس کے خلاف اپنی طرفداری پر قائل کرے، خواہ یہ اقدام مشرقی بلاک کے خلاف عالمی جنگ کا باعث ہی کیوں نہ بن جائے۔ تو یہ ایک خطرناک صورتحال تھی جس نے نکسن کو صدارتی عہدہ سنبھالنے کے فوراًبعد کوئی بھی دوسرا کام کرنے سے پہلے یورپی ممالک کا دورہ کرنے پر مجبور کیا۔ تو اس کا سفر یورپ، یورپی ریاستوں کو برطانیہ کے گرد اکٹھا ہونے سے روکنے کیلئے تھا۔

اور مثلاً روس (سوویت یونین) نے 1968 کے اواخر میں چیکوسلواکیہ کے ساتھ جنگ لڑنا شروع کی اور اس کے ساتھ وارسا معاہدے میں شامل ممالک کو شریک کیا۔ رومانیہ کے علاوہ باقی سب نے اس میں شرکت کی اور کیمونزم، کیمونسٹ ریاست اور کیمونسٹ پارٹی پر ممکنہ مغربی کاروائی سے حفاظت کے بہانے وارسا اتحاد کی افواج چیکوسلوواکیہ میں داخل ہوگئیں۔ ایسا ممکن تھا کہ وجہ یہ ہی ہو لیکن جن حالات میں یہ حادثہ پیش آیا وہ کیمونسٹ پارٹی یا کیمونزم کی حفاظت سے زیادہ خطرناک تھے، خاص کر جبکہ کیمونزم کی تشریح میں

محض کیمونسٹ پارٹی کے رہنماؤں کے اجتہاد کے علاوہ کوئی اور چیز موجود نہیں تھی۔ حالات کو باریکی کے ساتھ دیکھنے سے پتہ چلتاہے کہ روسی (سوویت) بیڑا جو مصر کے ساحلوں پر موجود تھا، اسے برطانیہ کی طرف سے حملے کا خطرہ پیدا ہونے لگا تھا، کیونکہ برطانیہ بحر روم میں اپنی افواج کو جمع کر رہا تھا۔ اسی طرح مصر پر اسرائیل کے حملے کا بھی امکان تھا اس لئے روس (سوویت یونین) کیمونسٹ پارٹی کی حمایت وحفاظت کے بہانے مداخلت پر مجبور ہوا۔ ان حالات میں ممکن تھا کہ برطانیہ روس (سویت یونین) پر حملہ کرنے کیلئے کود پڑے، اس لئے جنگ اور وسائل کی رسد کی تیاری کی ضرورت پڑی۔

روس (سوویت یونین) کی طرف سے جبل الطارق (جبرالٹر) کے راستے جنگ کے حالات میں امداد کا آنا آسان نہیں تھا، جبکہ راستہ بھی طویل تھا۔ اس لئے بحر روم میں گزرگاہ کا ہونا ضروری تھا جو مصر کے قریب ہو۔ اس لئے روس (سوویت یونین) بیس لاکھ فوج، تین ہزار طیارے اور ایٹمی اسلحہ اکٹھا کر کے وسطی یورپ میں لے آیا اور وارسا اتحاد کو جنگ میں شرکت کیلئے تیار کیا۔ وہ برطانیہ کو خوفزدہ کرنے کیلئے چیکوسلوواکیا میں اعلانیہ طور پر داخل ہوا اور وسطی یورپ میں اپنی طاقت لایا تاکہ اگر برطانیہ کے ساتھ روس (سوویت یونین) کی مڈ بھیڑ ہو جاتی ہے تو بحر روم تک پہنچنے کیلئے یوگوسلاویہ اور البانیہ سے گزرنے کیلئے وہ پہلے سے تیاری کر چکے ہوں۔ اس طرح چیکوسلوواکیہ میں کیموسٹ ریاست کی بچاؤ کے بہانے داخل ہونے کا مقصد درحقیقت برطانیہ کو دھمکانا اور جنگ کی تیاری تھی، نیز یہ بھی کہ وارسا اتحاد کو جنگ میں کودنے کی تیاری کی حالت میں رکھا جائے۔

سیاسی کاروائیوں کو ان کی بنیاد کے ساتھ اسی طرح ہی جوڑا جاتا ہے اور ان کو اپنے مخصوص حالات اور گردوپیش کے احاطے کے اندر رکھا جاتا ہے اور انہی دنوں میں ان کو سمجھا جاسکتا ہے جن دنوں یہ کاروائیاں عمل میں لائی جاتی ہیں، نہ کہ ان سے پہلے کے دنوں کے لحاظ سے۔ سیاسی کاروائیوں کی سمجھ میں ان تبدیلیوں اور پیش رفت کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے جو ایک دن بلکہ ایک گھنٹے پہلے وقوع پذیر ہوئے۔ کسی کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ ماضی میں کھویا رہے اگرچہ وہ ایک گھنٹہ یا چند منٹ پہلے کی حالت ہی ہو، بلکہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ منتقل ہوتا رہتا ہے اور وہ بالکل آخری لمحات کے مطابق امور اور کاروائیوں کو سمجھتا ہے، جبکہ اُس تمام عرصے کے دوران ہونے والے امور اور کاروائیوں کو بھی مد نظر رکھتا ہے۔

یہ بڑے بین الاقوامی مسائل ہیں اور یہ وہ بڑی ریاستیں ہیں جو عالمی پالیسی پر اثرانداز ہوتی ہیں۔ اس طرح اصل اسباب کے ساتھ سیاسی کاروائیوں کو جوڑنے کی کیفیت اوران کو اپنے مخصوص حالات اور گردوپیش میں رکھ کر دیکھنے اور جس دن یا جس گھنٹے میں یہ کاروائیاں واقع ہوئیں، اسی دن اور گھنٹے میں ان کو سمجھنے کا بیان بھی مکمل ہوا۔

دنیا کی ابتر صورتِ حال کے اسباب

اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ دنیا کی ابتر صورتِ حال تب سے ہے جب سے بڑی ریاستوں نے بڑی طاقتوں کے طور پر دنیا کو محکوم بنایا ہے۔ اس ابتر صورتِ حال کی ایک وجہ عالمی برادری کے

تصور کی من گھڑت سوچ ہے، دوسری طرف جب سے سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی وجود میں آئی،یعنی استعمار کا ظہور ہوا، دنیا کو استعمار نے بربادی سے دوچار کیا۔ پس جب تک عالمی برادری کا یہ افسانہ باقی رہے گا اور جب تک بڑی ریاستیں آپس میں دنیا کے وسائل پر مزاحمت اور اس پر تسلط حاصل کرنے کیلئے برسرپیکار رہیں گی، جب تک استعمار باقی ہے، خواہ کسی بھی شکل میں ہو اور چاہے اس کے اسالیب میں کتنی ہی تبدیلیاں آجائیں، دنیا بدستور بدحالی کا شکار رہے گی۔ اس لئے دنیا کو بدقسمتی کی اس کھائی سے جس میں وہ لڑھک رہی ہے، نکالنا اور اسے خوشحالی کے راستے پر ڈالنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان تین مسائل کو حل نہ کیا جائے، یعنی دنیا سے ان تین عوامل کا خاتمہ نہ کیا جائے: عالمی برادری کا افسانہ، بڑی ریاستوں کا تسلط اور استعمار اور اجارہ داری کی موجودگی۔

جہاں تک عالمی برادری کا تعلق ہے تو یہ اپنی ابتدا سے جس بنیاد پر کھڑی ہے اور جب سے یہ حالات پیدا ہوئے ہیں ایک باطل بنیاد ہے، کیونکہ اس کی پہلی اینٹ ہی مغربی یورپ کی عیسائی ریاستوں کی برادری کی بنیاد پر رکھی گئی تھی، تاکہ ایک ایسا گروہ تشکیل دیا جائے جو اسلامی ریاست کا سامنا کر سکے۔ پھر اس کے ساتھ مشرقی یورپ کی دیگر عیسائی ریاستوں کو ملایا گیا۔ اس طرح یورپ میں عیسائی ریاستوں کی برادری وجود میں آئی۔ یہ سولہویں صدی سے، یعنی جب سے اسلامی ریاست یورپ کو اپنی لپیٹ میں لینے والی قوت کے طور پر ابھری، انیسویں صدی کے دوسرے نصف 1856 تک برقرار رہی۔ اس زمانے میں اسلامی ریاست کی کمزوری اس درجے تک پہنچ گئی تھی کہ اسے بیمار آدمی Sick man of Europe کا خطاب دیا گیا اور اس کی باقیات یعنی اس کے علاقوں کو بانٹنے کیلئے سازشیں زور پکڑنے لگیں تو اس پورے عرصے میں جو تین صدیوں کے لگ بھگ ہے، عالمی برادری کا مطلب عیسائی برادری اور اسلامی ریاست کی دشمن برادری رہا۔

باوجودیکہ یہ صرف عیسائی ریاستوں کی برادری تھی اور وہ بھی صرف یورپ کی عیسائی ریاستوں کی، جو غیر عیسائی ریاستوں کیلئے اس میں شمولیت کو ممنوع قرار دیتی تھی، اس کے باوجود انہوں نے اس کو عالمی برادری اور عالمی خاندان کا نام دے کر صرف اسی کو بین الاقوامی قرار دیا اور صرف انہی ریاستوں کو عالمی امور پر بحث کا حق دیا گیا۔ اگر یہ عیسائی برادری صرف عیسائی معاشرے تک ہی محدود ہوتی اور اس کو اسلام کے مقابلے میں ایک عیسائی معاشرہ نامزد کیا جاتا، اگر معاملہ اس حد تک رہتا تو بھی آسان تھا مگر اس کو عالمی کردار

دیا گیا اوراس کو ہمیشہ کیلئے عالمی بنائے رکھنے پر کام کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عالمی برادری کا تصور عیسائی ریاستوں کی بنیاد پر کھڑا گیا، تو بین الاقوامی معاملہ اسی برادری کے معاملے کو کہا گیا اور بین الاقوامی مسئلہ کا مطلب بھی ان کا مسئلہ قرار پایا، اسی کی پائیداری اوراسی کو منظم کرنے کیلئے اس میں کچھ روایتی ضابطے رکھے گئے، جنہیں بعد میں عالمی قانون کا نام دیا گیا۔ یہ ریاستیں عالمی معاہدوں کی طرف متوجہ ہوئیں جو ان عیسائی ریاستوں کے درمیان طے پائے اوران روایتی امور کی طرف متوجہ ہوئیں جو عیسائی معاشرے میں بطور معاشرے کے رائج تھے۔ پھر اس سے انہوں نے کچھ ایسے ضابطے بنائے، جنہیں بین الاقوامی ضوابط کا درجہ دے دیا گیا جسے عالمی قانون کہا جاتا ہے۔

یوں عالمی برادری یا عالمی خاندان کی بنیاد دراصل بین الاقوامی یورپی عیسائی برادری پر رکھی گئی اور عالمی قانون کا مطلب اصل میں وہ معاہدے ہیں جو عیسائی ریاستوں کے درمیان طے پائے یا وہ روایات جو یورپی عیسائی معاشرے میں رائج رہیں۔ اس لئے صرف یورپی عیسائی ریاستوں پر عالمی برادری کا اطلاق کرنا جعل سازی اور دھوکہ ہے، کیونکہ دنیا صرف یورپ کی عیسائی ریاستوں کی برادری کا نام نہیں۔ اس طرح محض یورپی ریاستوں کے درمیان طے پائے جانے والے معاہدات اوران کی رسم ورواج کو عالمی قانون کہنا جھوٹ اور جعل سازی کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ افکار جو عالمی قانون بننے کے قابل ہیں، صرف یورپی عیسائی ریاستوں کے معاہدات اور روایات نہیں، بلکہ وہ افکار ہی عالمی قوانین ہونے چاہئیں جو دنیا بھر میں موجود تمام معاشروں کے رسم ورواج کا مجموعہ ہوں اور وہ معاہدات اور قراردادیں جو پوری دنیا کے انسانی معاشروں کے درمیان طے پائیں۔ اس لئے عالمی برادری کا مفہوم اپنے قیام سے ہی غلط ہے اور عالمی قانون کا مفہوم اپنے قیام سے ہی درست نہیں۔ اس کی تلافی پھر بھی ممکن تھی اگر یہ ریاستیں دنیا کی باقی ممالک کو تسلیم کرتیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ برادری اپنے سوا کسی کا وجود ہی تسلیم کرنے کو تیار نہیں، بلکہ عیسائیوں کے علاوہ کسی اور کو اپنے برابر شامل کرنے پر بھی راضی نہیں۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں اس نے بعض غیر عیسائی ریاستوں کو عالمی برادری میں شامل ہونے کیلئے قبول کر لیا لیکن ضوابط وہی رکھے جن کو ان ریاستوں نے یورپی عیسائی ریاستوں کی بنیاد پر اختیار کیا تھا۔ اس لئے ریاستِ عثمانیہ سے بھی اس نے عالمی امور میں اسلام کو فیصلہ کن سمجھنے

کا تصور چھوڑنے کا مطالبہ کیا اور اس کیلئے یہی شرط لگائی اور اس شرط کو قبول کر لینے اور عیسائی ریاستوں کے روایتی ضابطوں کے آگے جھکنے کے بعد ہی اس کو داخل کرنے پر اتفاق کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس برادری نے بعض ریاستوں کو اس میں داخل ہونے کی اجازت تو دی لیکن اپنے ضوابط اور روایات سے ہٹ کر بین الاقوامی تعلقات میں کسی اور چیز کو گوارا نہ کیا۔ پہلی جنگ عظیم اور اسلامی ریاست کا خاتمہ ہونے تک حالات بدستور یوں ہی رہے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد اس کی تلافی ممکن تھی، جبکہ جس دشمن کی خاطر یہ عالمی برادری قائم کی گئی تھی اور اس کے مقابلے کیلئے عالمی ضوابط گھڑ لئے گئے تھے، وہ نہ رہا تھا، لیکن بات یہ نہیں تھی۔ ان ریاستوں نے اسی اساس کو پکڑا جس کی بنیاد پر عالمی برادری اور عالمی قوانین وجود میں آئے تھے اور عالمی برادری کی نمائندگی کرنے والی ایک عالمی تنظیم ایجاد کرنے پر اتفاق کیا، مگر اس کے اندر تمام ریاستوں کو شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی، بلکہ اسے کچھ مخصوص ممالک کیلئے خاص کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے بعض غیر عیسائی اور غیر یورپی ریاستوں کو اس میں قبول کر لیا لیکن یورپی عیسائی ریاستوں کے روایتی پیمانوں کے علاوہ کسی اور چیز کو قبول نہیں کیا اور دنیا کے باقی ممالک کے تصورات اور روایات کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ علاوہ ازیں اس کا مطلب یہ تھا کہ عالمی برادری یورپی عیسائی ریاستیں ہیں اور وہ ریاستیں جو لیگ آف نیشن میں شریک ہیں ان کو عالمی عیسائی برادری میں قبول کیا گیا۔ پھر جب اقوام متحدہ وجود میں آئی تو بھی اس کی رکنیت کو ان ممالک کے اندر محدود کرنے کی کوشش کی گئی جنہوں نے جرمنی کے خلاف جنگ میں شرکت کی تھی، یعنی عیسائی ریاستیں اور ان کی ماتحت ریاستیں، مگر امریکہ نے دنیا پر اپنے اثر ورسوخ کا دائرہ وسیع کرنے اور دنیا کے ممالک کو اپنے سائے تلے لانے کیلئے اقوام متحدہ کی رکنیت میں توسیع کروائی اور دنیا کے تمام ممالک کو اس میں شامل ہونے کی اجازت دی گئی، لیکن امریکہ اور تمام عیسائی ریاستوں نے عالمی قانون کے اندر کسی بھی قسم کے دیگر ضابطوں کو گھسنے دیا نہ ہی اقوام متحدہ کو اس کی اجازت دی، بلکہ عیسائی ریاستوں کے قواعد ہی عالمی قانون کیلئے بنیاد بنے۔ یہی عالمی قانون ہے اور یہی اقوام متحدہ ہے۔ حتیٰ کہ روس کی قیادت میں مشرقی بلاک جو سرمایہ دارانہ نظام اور عیسائی ریاستوں کے پیمانوں کے خلاف تھا، وہ بھی عالمی نظام کی بنیاد کو تبدیل کر سکا نہ ہی اس نظام کے اندر اپنے تصورات کو جگہ دلوا سکا۔ اس لئے باقی ممالک کے رسم ورواج اور تصورات کو دیوار پر مارتے ہوئے، عیسائی ریاستوں یا سرمایہ دار ممالک کا روایتی معیار

ہی اس وقت کے تمام انسانی معاشروں کی قسمت کے فیصلے کرتا ہے اور اس وقت عالمی برادری کا مطلب واقعی میں عیسائی ریاستوں، بالفاظ دیگر سرمایہ دار ممالک کی برادری ہے، اگرچہ اس کے اندر بہت سے دیگر ممالک نے بھی شمولیت اختیار کی ہوئی ہے۔ اس لئے عالمی برادری اور عالمی خاندان کے مفہوم پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح عالمی قانون کے معنی پر بھی از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

معاملے کو جس چیز نے مزید مشکل بنایا وہ یہ ہے کہ یورپی عیسائی ریاستوں یا سرمایہ دار ممالک نے ان روایتی ضابطوں، جو بعد میں عالمی قوانین کی شکل اختیار کر گئے، کے نفاذ کا معاملہ عالمی روایات کی مثل اخلاقی عنصر پر نہ چھوڑا، حتیٰ کہ اس کے نفاذ کو ان ممالک تک محدود نہ رکھا جنہوں نے ان قوانین کو مان لیا تھا، بلکہ انہیں اسلحے کی نوک پر نافذ کیا اور ان کے نفاذ کو دنیا کے تمام ممالک کے لئے لازمی قرار دیا، خواہ کسی ملک نے اپنے آپ کو ان کا پابند کر لیا ہو یا نہیں۔ پچھلے ادوار میں بڑی ریاستوں نے اپنے آپ کو امن وامان میں رکھنے اور عالمی معاشرے میں نظم وضبط کی رکھوالی کرنے والا خود ساختہ ادارہ متعارف کرایا تھا اور وہ جب بھی امن کو خطرہ محسوس کرتے یا حکم کی خلاف ورزی دیکھ لیتے تو دوسری ریاستوں کے امور میں مداخلت کرتے تھے اور کسی بھی ریاست کے اندر مداخلت کی راہ میں یعنی ان کے متفقہ روایتی ضابطوں کے نفاذ کی راہ میں صرف اس ریاست کی طاقت یا ان بڑی ریاستوں کا اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کی عدم قابلیت ہی رکاوٹ بن سکتی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپی عیسائی ریاستیں اجتماعی یا انفرادی طور پر عالمی نظام کے قیام کیلئے اپنے آپ کو دنیا کی عالمی پولیس سمجھتی تھیں، بلکہ لیگ آف نیشن کے قیام کے بعد بھی۔ پھر اقوام متحدہ کے قیام کے بعد سرمایہ دار ممالک نے عالمی قانون کے نفاذ کیلئے اپنے آپ کو دنیا کی عالمی پولیس کے طور پر متعارف کرایا۔ 1958 میں لبنان میں امریکی فوجیوں اور اُردن میں برطانوی فوجیوں کو اتار کر امریکہ اور برطانیہ کی مشرق وسطیٰ میں مداخلت، اور 2003 میں عراق کے خلاف جنگ، ان سرمایہ دار ممالک کا اپنے آپ کو عالمی پولیس قرار دینے کی ہی مثالیں ہیں جو عالمی قانون یا ان کے بقول عالمی نظام کو نافذ کرنے کیلئے کی گئیں۔ یہ کاروائی بھیانک کاروائی تھی اور یورپی معنوں میں عالمی برادری اور نام نہاد عالمی قانون کی وجہ سے دنیا کی بدبختی کا ایک سبب تھی۔ اس لئے دنیا کو اس زبوں حالی وبدبختی سے بچانے اور چھٹکارا دلانے کے لیے اس مسئلے کا علاج ضروری ہے۔

اس مسئلے کا علاج اس طرح ہو گا کہ اگر عالمی معاشرے میں ایک عالمی برادری قائم کرنا ضروری ہے ہو تو پھر یہ لازم ہے کہ عالمی معاشرے کو عام معاشروں پر قیاس نہ کیا جائے، کیونکہ ایک عام معاشرے میں مظالم ختم کرنے اور لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات نمٹانے کیلئے ایک ڈھانچے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ہر معاشرے میں ایک ریاست اور اتھارٹی کا وجود ناگزیر ہوتا ہے اور ایک قانون کی ضرورت ہوتی ہے جسے لوگوں پر بزور قوت نافذ کیا جائے۔ جہاں تک عالمی معاشرے کا تعلق ہے تو یہ انسانی برادریاں ہوتے ہیں، جن کے درمیان تعلقات جنم لے لیتے ہیں۔ یہ افراد کی طرح نہیں ہوتے ہیں جن کے آپس میں تعلقات پائے جاتے ہوں۔ ان میں سے ہر ایک برادری خود مختار ہوتی ہے، اسے لامحدود حق خودارادیت حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس برادری یا ریاست پر کسی قسم کے جبر کا مطلب اس کی خود مختاری کو سلب کرنا ہے اور یہی غلامی ہے، جس کا اظہار استعمار اور طاقت و قوت کے ذریعے تسلط کے حصول اور جبر کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس معاشرے یا ریاست کو اپنے قوانین کے نفاذ سے روکنے کا مطلب اس کی مشکیں کسنا، ہاتھ پاؤں شل کر دینا اور اپاہج کر دینا ہے۔ اس لئے انسانی برادریوں کے اوپر ایک ایسی قوت کی موجودگی صحیح نہیں جسے ایک برادری کی اتھارٹی کے مثل اتھارٹی حاصل ہو، بالفاظ دیگر یہ درست نہیں کہ عالمی معاشرہ ایک ایسا مجموعہ بن جائے جس پر ایک اتھارٹی کو بالادستی حاصل ہو، جو لوگوں کے امور کو چلائے۔ یعنی یہ صحیح نہیں کہ ایک ایسی عالمی ریاست قائم ہو جو کئی ریاستوں پر حکومت کرے، نہ کسی ایسی عالمی ریاست کا وجود درست ہے جسے کئی انسانی معاشروں پر اتھارٹی حاصل ہو، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسانی معاشرے اپنا وجود رکھتے ہوں، انہیں خود مختاری اور خودارادیت حاصل ہو اور اگر ان معاشروں سے ایک عالمی گروہ بنانا ضروری ہی ہو تو پھر ضروری ہے کہ یہ عالمی ریاست نہ ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مجموعہ اپنی اساس میں ہی ان ریاستوں سے مل کر بنے جو اس میں اپنے مرضی و اختیار سے شامل ہونا چاہتی ہیں۔ یہ نہیں کہ ایک مخصوص ریاست جس کے مخصوص تصورات ہوں اس کو قائم کرے یا ایک ایسی مخصوص ریاست اس کو قائم کرے جسے دوسری تمام ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ طاقت و قوت حاصل ہو۔ اس کا عالمی ریاست ہونا درست نہیں، بلکہ اس عالمی گروہ کی تشکیل ان کے ہاتھوں ہونی چاہئے جو مرضی خوشی سے ایسا کرنا چاہتے ہوں، قطع نظر اس سے کہ ان کے تصورات کیا ہیں، یا ان کی قوت کی مقدار اور ان کے اثر و نفوذ کی

حد کیا ہے، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی ریاست جو اس عالمی گروہ کی تشکیل میں شریک نہ ہوئی ہو، وہ کسی بھی وقت اس میں شریک ہو سکے اور اس کے بھی وہی حقوق اور ذمہ داریاں ہوں جو تشکیل کنندگان کے ہیں اور سب کو جب وہ چاہیں اس گروہ سے نکل جانے کی آزادی حاصل ہو، کسی پر بزور طاقت قراردادوں کو نافذ کرنا لازم نہ ٹھہرایا جائے۔ تب ہی عالمی گروپ حقیقی معنوں میں عالمی گروپ ہو گا، یہ نہیں کہ ایک مخصوص عالمی برادری کو عالمی خاندان کا جھوٹا نام دیا جائے، یا ایسی کوئی عالمی ریاست جو جھوٹے اور من گھڑت طریقے سے ادارہ اقوامِ متحدہ کہلائی جائے۔

یہ گفتگو برادری کے حوالے سے تھی، جہاں تک قانون کی بات ہے تو نہ تو عالمی گروہ کا اپنا ایک قانون ہونا صحیح ہے اور نہ ہی عالمی ریاستوں کا عالمی قانون ہونا صحیح ہے۔ ہاں عالمی برادری کا صرف کاروائی کا قانون ہو سکتا ہے جس کے ذریعے اداروں کا نظم و نسق چلایا جائے، نیز یہ قانون اس کے امور کو منظم کرنے کا طریقہ کار بتائے۔ اس کو اکثریتی رائے سے پاس کیا جا سکتا ہے اور اکثریت ہی اس کو تبدیل کرے، یا حالات کے تقاضے کے مطابق اس میں ترمیم کرے۔

جہاں تک نام نہاد عالمی قانون کی بات ہے، تو اس کا ہونا اور اس کو گھڑ لینا صحیح نہیں، کیونکہ قانون حکمران کا حکم ہوتا ہے، جب کسی عالمی ریاست یا عالمی شہنشاہیت کا وجود ہی نہیں، بلکہ ایک ایسی عالمی ریاست کا وجود جو تمام ریاستوں پر اتھارٹی ہو، صحیح ہی نہیں، کیونکہ ایسا ہونا ناممکن ہے اور اس کی موجودگی کے دعوے کا مطلب جنگیں اور خونی تنازعات ہیں، اس لئے کسی عالمی ریاست یا عالمی اتھارٹی کا ہونا جائز نہیں، تو ایسے میں کسی عالمی قانون کا وجود بھی باطل ہے۔ اس کی تین وجوہات ہیں: ایک تو یہ کہ قانون حکمران کا حکم ہوتا ہے اور تمام ریاستوں یا عالمی برادری پر کسی کا اقتدار ہے ہی نہیں۔ لہٰذا عالمی قانون بھی نہیں، یعنی اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ دوسرا یہ کہ قانون کا نفاذ لازم ہوتا ہے، اس کے لئے قوتِ نافذہ کا وجود ضروری ہے، جبکہ ایسی کسی عالمی اتھارٹی کا وجود درست نہیں جو تمام ریاستوں پر اپنے اوامر طاقت کے ذریعے نافذ کرے، کیونکہ یہ جنگوں اور خونی تنازعات کا باعث ہو گا۔ تیسرا یہ کہ قانون تعلقات کو منظم کرتا ہے اور عالمی تعلقات انسانی گروہوں کے درمیان رضامندی کے ساتھ قائم ہوتے ہیں، دو یا دو سے زیادہ ریاستیں اپنے مفادات کے مطابق اپنے اختیار سے تعلقات

طے کر لیتی ہیں یہ تعلقات ان تعلقات سے مختلف ہوسکتے ہیں جو دوسری دو یا زیادہ ریاستوں کے درمیان موجود ہوں۔ لہٰذا جو چیز تعلقات کو منظم کرتی ہے وہ معاہدات ہیں، قانون سے یہ کام نہیں لیا جاسکتا۔ درحقیقت موجودہ تعلقات صرف معاہدات سے ہی منظم ہیں۔ لہٰذا ایسے کسی عالمی قانون کا وجود ہی نہیں جو تمام ریاستوں کے درمیان تعلقات کو منظم کرے، اس لئے کسی عالمی قانون کا بنانا باطل ہے۔

اس کے علاوہ لوگوں کی اکثریت حتیٰ کہ مغرب والوں نے بھی ایسے عام عالمی قانون سے انکار کیا ہے اور ریاستوں کو کسی بھی عالمی قانون کا پابند کر دینے کو مسترد کیا ہے، یعنی کہ ان کو اس کے نفاذ پر مجبور کیا جائے۔ سوجب سے عالمی قانون کا تصور سامنے آیا، اس کے قواعد اور اصول کی حقیقت کے بارے میں مغربی قانون دانوں کے درمیان اختلاف شروع ہوا، ان میں سے بہت سوں نے اس کی تنفیذی قوت پر شک کیا۔ جرمنی کے کانٹ اور ہیگل، برطانیہ کے ہوبز، اوسٹن اور ان کے پیروکاروں نے عام عالمی قانون کو نہیں مانا ہے اور مغرب کے بہت سے قانون دان اسی رائے کی طرف گئے ہیں، یہاں تک کہ وہ مغربی قانون دان جو بین الاقوامی قانون کے اصول کی موجودگی کی بات کرتے ہیں، وہ بھی اس کو ایک واجب التنفیذ قانون کی طرح نہیں لیتے، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک اخلاقی اصول ہی ہے جس کی خلاف ورزی کرنے پر کوئی قانونی مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ حتیٰ کہ جو لوگ بین الاقوامی قانون کی قانونی ہونے کے معنی کی تشریح کیلئے سازشوں میں لگے رہتے ہیں، ان کی یہی تشریحات اس کی عدم موجودگی پر دلالت کرتی ہیں اور یہ کہ اگر کوئی چیز موجود ہے تو وہ بین الاقوامی عرف (رواج) ہے، نہ کہ بین الاقوامی قانون۔ اس لئے بہت کم مفکرین، حتیٰ کہ مغرب میں بھی، عام عالمی قانون کے وجود کی بات کرتے ہیں اور صرف بین الاقوامی عرف (رواج) کو ہی ثابت کیا جاسکتا ہے۔

عُرف جو انسانی معاشروں کے درمیان متعارف ہے، موجود ہے۔ انہی میں سے وہ عام عُرف ہے جسے قدیم زمانے سے آج تک قبول عام حاصل ہے، مثلاً ایلچیوں کو قتل نہ کرنا، جسے سفیروں کا استثناء کہا جاتا ہے اور اسی میں سے خاص معاشروں کے درمیان پایا جانے والا عرف ہے جیسے عربوں کے درمیان یہ معروف تھا کہ کسی کو بیت الحرام کی زیارت سے منع نہیں کیا جائے گا۔ تو یہ عرف بلاشک موجود ہیں، تاہم یہ قانون نہیں ہیں۔

یہ وہ روایات ہیں جو کچھ مخصوص واقعات کے بار بار وقوع ہونے سے سب لوگوں کے ہاں یا کسی خاص معاشرے میں متعارف ہو جائیں۔ اس بنا پر بین الاقوامی عرف تو موجود ہے لیکن بین الاقوامی عام قانون کا کوئی وجود نہیں۔

رہا لوگوں پر طاقت کے ذریعے عالمی قانون کے نفاذ کا مسئلہ، تو اس میں طاقت یا جبر کا استعمال صحیح نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نفاذ اگر کسی عالمی اتھارٹی یعنی عالمی ریاست کی طرف سے ہو تو اس کا وجود ہی ممکن نہیں، کیونکہ عالمی ریاست کا کوئی وجود نہیں، اور اگر دو یا دو سے زیادہ بڑی ریاستوں کے مجموعے کی طرف سے ہو تو اس کو جارحیت تصور کیا جائے گا، یہ قانون کا نفاذ نہیں کہلائے گا، کیونکہ اگر کوئی ایسی ریاست جو اس کا نفاذ کرتی ہے، اس قانون کی مخالفت کرے، تو باقی ریاستیں اس پر اس کا نفاذ نہیں کر سکیں گی، کیونکہ اس کا معنی جنگ ہے اور اگر وہ دو ریاستیں جو اس کو نافذ کرتی ہیں یا وہ تمام ریاستیں جو اس کو نافذ کرتی ہیں، اس کی خلاف ورزی کریں، تو کون ہے جو اس پر ان سے باز پرس کرے اور ان پر قانون کو نافذ کرے؟ یقیناً کوئی بھی نہیں۔ اس لئے طاقتور ممالک کا چھوٹے یا کمزور ممالک پر قانون کا نفاذ جارحیت ہو گی، اسے عالمی قانون کا نفاذ نہیں کہا جا سکتا۔ اس سے واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام ریاستوں پر کسی مشترکہ عالمی قانون کے نفاذ کا کوئی وجود نہیں، لہٰذا طاقت کے ذریعے عالمی قانون کے نفاذ کی سوچ صحیح نہیں کیونکہ یہ جارحیت کے سوا کچھ نہیں۔

اس سب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی عالمی قانون کا وجود درست نہیں، بلکہ عملاً یہ موجود ہی نہیں ہو سکتا۔ صرف وہ معاہدات، جو ریاستوں کے درمیان ہو جاتے ہیں اور عرف جو ان معاہدات، جنگی تعلقات کے بارے میں ان کے ہاں شہرت حاصل کریں، موجود ہیں یا وہ امن معاہدات جو انسانی معاشروں کے درمیان کئے جائیں۔ اگر کسی ایسے بین الاقوامی معاشرہ کو قائم کرنے کی ضرورت ہو بھی تو یہ ایک انتظاماتی قانون ہو گا اس کا کام عالمی عرف اور ان کی خلاف ورزی پر نظر رکھنا ہو گا۔ اس کے تحت عالمی معاہدات کے متعلق عرف بھی داخل ہیں کہ عالمی معاہدات کیسے کئے جائیں، کیسے ان کو نافذ کیا جائے یا ان کو ختم کیا جائے وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہر عالمی رواج کو بھی نہیں لیا جاتا بلکہ وہ عرف جو اس عالمی معاشرے میں پروان چڑھ جائیں کہ جو عالمی برادری کو جنم دے چکا ہے۔ یہ عرف کوئی ایسے فیصلے نہیں ہوتے جسے ریاستیں پاس کرتی ہیں، ایسا سمجھنا غلط ہے اس میں کُلی طور پر نقصان ہے، بلکہ یہ اس لیے پروان چڑھتے ہیں کہ طویل زمانے تک ریاستیں ان کی پیروی کرتی آتی ہیں،

حتی کہ یہ مستحکم ہو جاتے ہیں اور یہ ریاستیں ذاتی جذبے کی وجہ سے یہ گمان کرنے لگتی ہیں کہ ان رواجوں پر عمل کرنا لازم ہے۔ جہاں تک ریاستوں کی طرف سے ان رواجوں کی پیروی کا تعلق ہے تو یہ ایک اصول، معاملے یا تصور کے دہرائے جانے کی وجہ سے ہوتی ہے جسے عرف سمجھا جاتا ہے کیونکہ لوگوں کے کسی کام کو کرنے اور ان کے کسی چیز پر اتفاق کرنے سے عرف نہیں بنتا بلکہ اس کیلئے اس کی تکرار اور دہرائی ضروری ہے تاکہ وہ عرف عام بن جائے۔ تو یہ عرف عام وہی ہے جس پر عالمی برادری نظر رکھے، اس وقت کہ جب وہ عالمی تنازعات اور ان خلاف ورزیوں کی جانچ پڑتال کرے جو اس برادری میں شامل ریاستوں سے سرزد ہو جائیں۔ لہٰذا عالمی تنازعات کے حل کے وقت اپنے حقیقی معنوں میں بین الاقوامی عرف کو ہی دیکھا جائے۔ بین الاقوامی عرف کے ریاستوں پر بزور طاقت نفاذ کی سوچ ٹھیک نہیں بلکہ رائے عامہ اور اخلاقی عامل کے ذریعے اس کو نافذ کیا جانا چاہئے۔ کیونکہ برادری کے اندر شریک ریاستوں نے کسی اصول یا امر کو اس وقت عالمی عرف سمجھا جب ان کے ہاں اس کا عرف ہونا ثابت ہو چکا، تب ہی ان ریاستوں کا یہ یقین وجود میں آیا کہ اس عرف کی پیروی لازم ہے۔ اس بنا پر طاقت کے ذریعے اس کے نفاذ کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ اس کے علاوہ عرف کی مخالف پر ریاست کے خلاف رائے عامہ کی قوت ریاستوں کو بیرونی طریقے سے مجبور کرنے سے زیادہ رضاکارانہ اور انفرادی طور پر مجبور کرے گی اور عرف عامہ کی خلاف ورزی پر شرم اٹھانے کا خوف ایک انسانی معاشرے کے لیے مادی قوت کے ذریعے نفاذ کے خوف سے زیادہ مؤثر ہے۔ اس لئے معاشرے کے طے کردہ فیصلوں کا نفاذ رائے عامہ اور اخلاقی عوامل پر چھوڑا جائے اور یہی ان فیصلوں کے نفاذ کا طریقہ ہو۔

جہاں تک بڑی ریاستوں کی وجہ سے دنیا کی بدحالی کی بات ہے تو یہ کسی ریاست کے بڑی ریاست ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ یہ ان ریاستوں کی گروہ بندی اور مفادات اور مصالح کی تقسیم کیلئے ان کے گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہے۔ یہی گٹھ جوڑ مصائب کی ماں ہے، لہٰذا اس کے علاج کیلئے یہ ضروری ہے کہ بڑی ریاستوں کے گٹھ جوڑ پر توجہ دی جائے، اس حقیقت پر نہیں کہ یہ ریاست ایک بڑی ریاست ہے۔ پس مقدس اتحاد (Sacred Alliance) بڑی ریاستوں کا اولین گٹھ جوڑ تھا، جو اپنے درمیان مفادات اور مصالح کی تقسیم کی غرض سے معرض وجود میں آیا۔ یہ اتحادی بادشاہوں کے دفاع اور ان کے تخت شاہی کو بچانے کی خاطر عمل میں لایا گیا تھا۔

اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ ان میں سے کسی ایک بادشاہ یا جن امور پر ان کا اتفاق ہوتا ہے، کے خلاف اٹھنے والی کسی بھی انقلابی تحریک کا قلع قمع کیا جاسکے، نیز یہ کہ امن یا حکومت کیلئے خطرے کو دلیل بنا کر دنیا کے کسی بھی ملک میں مداخلت آسان بنادی جائے، تو یہ گروہ بندی دنیا اور خود یورپ کیلئے ایک تباہی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ یورپ کے لوگ اس پر اثر انداز ہونے میں کامیاب رہے اور اس گروہ کی قوتوں کو مفلوج کر دیا، انہوں نے انقلاب برپا کیے اور اس گروہ کے فیصلوں کو توڑ دیا، لیکن مفادات بانٹنے کیلئے بڑی ریاستوں کی گروہ بندی اور گٹھ جوڑ کا تصور اب تک دنیا پر راج کر رہا ہے۔ فرانس میں انقلاب اٹھا اور اس نے شہنشاہیت کو تہس نہس کر کے جمہوریت کا اعلان کیا، بلجیم میں انقلاب کھڑا ہوا اور اس نے ہالینڈ سے الگ ہو کر آزادی حاصل کر لی، اسی طرح جرمن قوم اس قابل ہوئی کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا خاتمہ کر دے جس میں اسے تقسیم کر دیا گیا تھا اور اس نے جرمن اتحاد قائم کیا۔ یہ سب ان پانچ بادشاہوں کے گٹھ جوڑ کے خلاف ہوا۔ لیکن نظام تبدیل ہو جانے کے بعد بھی یہ ریاستیں عالمی گروہ بندی کے تصور کے ساتھ چمٹی رہیں، یہی گروہ بندی جنگ عظیم اول کا باعث بنی اور یہی دوسری جنگ عظیم کا بھی باعث بنی۔

یہ صحیح ہے کہ امریکہ اور روس (سوویت یونین) نے معاہدہ کر کے دونوں عالمی گروہوں کو ختم کر دیا، یعنی کمیونسٹ گروہ اور سرمایہ دارانہ گروہ۔ 1961 میں خروشیف اور کینیڈی کے درمیان ویانا میں معاہدہ ہو جانے کے بعد، ان دونوں نے تیسری جنگ عظیم کے خطرات کو دور کیا، مگر یہ بھی تب ہوا کہ ان دونوں نے ایک اور جدید گروہ بنایا۔ اس لئے یہ نہ سمجھا جائے کہ انہوں نے بڑی ریاستوں کے گروہ کے تصور کو ختم کیا، بلکہ اپنے مفادات کیلئے ایک اور گروہ تشکیل دیا اور ایک نیا خطرہ پیدا کیا، یعنی دنیا دو بڑی ریاستوں کے درمیان تقسیم ہوئی، جس سے عالمی صورتحال کو نقصان پہنچا۔ اس لئے ان دونوں نے بجائے یہ کہ وہ عالمی گروہ بندی کا مسئلہ حل کریں، اس کو مزید پیچیدہ کر دیا اور اس میں ایک اور مضبوط گروہ بنا ڈالا۔ ان دونوں نے یہ امکان ہی ختم کر دیا کہ چھوٹی ریاستیں اپنے مسائل کے سلسلے میں بڑی ریاستوں کے اختلاف سے استفادہ کریں اور عالمی سیاست کیلئے ان دونوں کے گٹھ جوڑ سے بہت بڑا خطرہ پیدا ہوا۔

اس طرح کی گروہ بندی جب بھی قائم ہو گی، امن کیلئے خطرہ پیدا ہو گا بلکہ دیگر ریاستوں کیلئے چاہے چھوٹی ہوں یا بڑی اور خواہ یہ روایتی گروہ ہو کہ گروہ کے رکن ممالک غنیمت کو آپس میں برابر تقسیم کریں یا موجودہ گروہ جیسا ہو کہ سپر پاور (جو کہ امریکہ ہے) گروہ کی باقی ریاستوں کو یرغمال بنائے اور سب سے پہلے اپنے مفادات کو پورا کرے، اور غنیمت پوری کی پوری یا اس کا بڑا حصہ اپنے لیے مخصوص کرے جبکہ گروہ کے دیگر ممالک کو بچا کچا حصہ ملے، جیسا کہ دوسری خلیج جنگ میں ہوا۔ جب عراق نے کویت پر قبضہ کیا تھا، تو ایک عالمی اتحاد قائم ہوا تھا، یوں امریکہ نے گزشتہ صدی کی نویں دہائی کے اوائل میں عراق پر وحشیانہ جارحیت کے ساتھ حملہ کیا اور اپنے ساتھ لگ بھگ تیس ممالک ملا لئے۔ اسی طرح 2003 کے اوائل میں عراق پر امریکی جارحیت کے وقت بھی امریکہ نے مختلف معاہدوں کے نام سے تیس کے قریب ممالک کو اپنے ساتھ ملا کر انہیں جنگ میں جھونک دیا۔

بلاشبہ تمام گروہ، خواہ ان کی شکل جو بھی ہو عالمی اسٹیج پر بڑے پیمانے پر شر پیدا کرتے ہیں، اس لئے عالمی گروہ بندی کے تصور کے جلد از جلد علاج کی ضرورت ہے، چاہے ان گروہوں کو بڑی ریاستیں بنائیں یا چھوٹی اور بڑی ریاستیں۔

یہ بات کہ اس کا علاج کیا ہے، اس کے لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا علاج صرف اس تصور کو اس کی جڑ سے تبدیل کرنے میں ہے، کیونکہ انسان کا زندگی میں رویہ اس کے ان تصورات کے مطابق ہوتا ہے جو وہ زندگی کے بارے میں رکھتا ہے، اس لئے سب سے پہلے اس مفہوم کو ان اقوام کے ہاں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے جو بڑی ریاستوں میں بستی ہیں اور عالمی گروہ بندی کا تصور رکھتی ہیں۔ پھر دوسرے عالمی گروہوں کا وجود ختم کیا جائے اور جب تک اس مفہوم کو تبدیل نہیں کیا جائے گا، دنیا کی بدبختی اور بدحالی کا یہ سلسلہ جاری رہے گا، بلکہ یہ بدحالی بڑھے گی۔ اب یہ بات کہ اس کو تبدیل کرنے کا طریقہ کیا ہو گا۔ اس کیلئے گروہ بندیوں کے خلاف رائے عامہ بنائی جائے، یہی اس کا کامیاب علاج ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اُنیسویں صدی میں کمزور اقوام کو نوآبادی بنانے کا تصور چھوٹی بڑی تمام یورپی ریاستوں کے ہاں ایک فخر سمجھا جاتا تھا اور وہ اقوام و عوام کو نوآبادیات بنانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی دیوانہ وار کوشش کرتی تھیں، نہ تو برطانیہ

اور ہالینڈ کے درمیان اس میں کوئی فرق تھا، نہ جرمنی اور بلجیم، یا فرانس اور اسپین کے درمیان کوئی فرق تھا۔ تمام یورپی ریاستیں دیگر قوموں پر استعماری قبضے کیلئے نکل پڑی تھیں۔ جب روس میں پہلی جنگ عظیم کے بعد کمیونسٹ ریاست قائم ہوئی تو اس نے استعماریت کے خلاف جنگ کا تصور اپنایا اور اس پر نہایت شدید اور بے رحمانہ تنقید کی، قوموں کو استعمار کا مقابلہ کرنے کیلئے اُکسایا اور استعماریوں کے خلاف ان کو بھڑکایا۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے آتے ہی دنیا میں استعمار کے خلاف صفایا کرنے والی رائے عامہ تیار ہوئی تھی۔ اس لئے اقوام متحدہ کے چارٹر میں ایسا مواد شامل کیا گیا جو دنیا میں استعماریت کو ختم کرنے سے متعلق تھا اور آزادی کا تصور پنپنے لگا۔ پس استعماری ریاستیں استعماریت کو خیر باد کہنے لگیں اور انہیں عالمی رائے عامہ کے دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر نو آبادیوں کو آزادی دینی پڑی، اگرچہ بعض ریاستوں نے اس کو بھی استعمار کی شکل بدلنے کیلئے ایک اسلوب کے طور پر لیا۔ بہر حال رائے عامہ اس قابل ہوئی کہ استعمار کے درست ہونے کا تصور تبدیل کر سکے۔ اسی طرح بڑی ریاستوں کے تصور یا زیادہ صحیح تعبیر کے ساتھ بڑی ریاستوں کے گروہوں کے تصور کو تبدیل کرنے کے لئے جن قوموں نے بڑی ریاستوں کے گروہوں کی طرف سے جو سختیاں اور مصیبتیں اُٹھائیں یا اب تک اُٹھا رہی ہیں، انہیں یہ کرنا ہو گا کہ وہ بڑی ریاستوں کے گروہ کے تصور کا سنجیدگی سے شدید مقابلہ کریں، یہاں تک کہ اس کا بالکل صفایا کر دیں۔ مگر اس تصور کو صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے ایک ایسی طاقتور ریاست کا وجود ضروری ہے، جو اس فکر کو اپنائے کیونکہ جب تک موجودہ بڑی ریاستیں اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے اس تصور کی مختلف زاویوں سے تائید کرتی رہیں گی، تو اس تصور کی وجہ سے سختیوں کا سامنا کرنے والی قوموں کیلئے اس کو مٹانے میں کامیابی کا حصول ایک مشکل امر ہے۔ ہاں اگر وہ ایک ایسی طاقتور ریاست کو قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں جو اس سوچ کی حامل ہو تو پھر اس تصور کو ختم کرنے میں کامیابی ملے گی، صرف اسلامی ریاست کا قیام ہی وہ واحد امید ہے جو اس تصور سے کمزور اور بے بس اقوام کو رہائی دلا سکتی ہے۔

باقی رہا استعمار کا مسئلہ اور لوگوں کے وسائل کو لوٹنا اور ان کی تذلیل، تو اگرچہ دنیا والوں نے اس کا مقابلہ کرنے کیلئے معقول قدم اٹھایا ہے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اب بھی بدستور ایک خطرناک عمل ہے جس کی وجہ سے کمزور اقوام پس رہی ہیں، اور اسی عمل کی وجہ سے علاقائی اور عالمی استحکام خطرے سے

دوچار ہے، کانگو کا بحران جو کئی سالوں تک جاری رہا اور یہ اب تک ایک استعماری خطہ ہے، یا مشرق وسطیٰ کا موجودہ بحران، یہ استحکام کے حق میں استعمار کے خطرہ ہونے کی مثالیں نہیں تو اور کیا ہے؟ لہٰذا استعمار کے مسئلہ کا علاج بے حد ضروری ہے۔

بے شک استعمار سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کا ایک ایسا جزو ہے جو اس سے کبھی جدا نہیں ہوتا، بلکہ یہی اس کی فکر کو نافذ کرنے کا طریقہ ہے۔ اس لئے بنیاد سے اس کے علاج کا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں کہ سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کا ایسے مقابلہ کیا جائے کہ اس کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ اس لئے سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کا خاتمہ کرنے کیلئے کوششیں صَرف کرنا از حد ضروری ہے۔ یقیناً کمیونیزم نے استعمار سے نمٹنے اور سرمایہ دارانہ آئیڈیالوجی کا مقابلہ کرنے کیلئے کچھ اقدامات کئے، لیکن وہ ایک غلط تصور لے کر چلا اور یہ ایک لولا لنگڑا مقابلہ تھا۔ کیونکہ اس نے دین کی ریاست سے جدائی کے عقیدے کا مقابلہ مادی ارتقاء کے عقیدے کے ذریعے کیا۔ جبکہ مادی ارتقاء کا عقیدہ بذات خود ایک غلط عقیدہ ہے جو انسانی فطرت سے میل نہیں کھاتا، یہی وجہ تھی کہ سرمایہ دارانہ معاشروں میں یہ تصور پذیرائی حاصل نہ کر سکا، اس کے ساتھ وہ اشخاص جنہوں نے اس عقیدے کو قبول کیا، زندگی میں ان کے رویے پر یہ عقیدہ اثرانداز نہیں ہوا، کیونکہ جو انسان مادے کے ارتقا کا عقیدہ رکھتا ہو، اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دین کی ریاست سے جدائی کی فکر نافذ کی جائے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ریاست سے دین کی جدائی کے عقیدہ کو ایک ایسا شخص نافذ کرے جو اللہ کے وجود کا اقرار کرتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ کے وجود کا منکر اس کو نافذ کرے۔ کیونکہ اس کا معنی نہ تو الحاد (لادینیت) ہے اور نہ ایمان، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ریاستی معاملات میں دین کو فیصلہ کن حیثیت دینے سے دور رکھا جائے۔ مادی ارتقا کا عقیدہ اپنانے والے کے رویے پر اس سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اشتراکی عقیدے نے سرمایہ دارانہ معاشروں پر کوئی اثر ڈالا، نہ ہی وہاں کوئی تبدیلی لے کر آیا۔ جہاں تک کمیونزم کی طرف سے سرمایہ داریت کا مقابلہ کرنے کی بات ہے تو یہ مقابلہ کارل مارکس اور اس کے بعد آنے والے کمیونسٹ فلاسفروں کے افکار و نظریات کے ذریعے شروع کیا گیا۔ اس عقیدے نے اس کو قبول کرنے والے کچھ افراد اور گروہوں کو ضرور جنم دیا، لیکن یہ عقیدہ محض مطالعے اور بحث و مباحثہ کے ذریعے ایسی کوئی قوم پیدا نہ کر سکا جو سب کے

سب اس کو قبول کرتے ہوں۔ پس ایک ڈھانچے کے ذریعے اس کو وجود میں لانے کا طریقہ ایک غلط طریقہ تھا، یعنی ایک اشتراکی ریاست کے ذریعے، جو غلط ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خیالی طریقہ تھا۔ سوکیمونزم کی غلطی یہ ہے کہ اس نے ریاست کے قیام کو ریاست کے یکسر خاتمے کا طریقہ بنایا اور خیالی اس لئے کہ یہ طریقہ اس انقلاب کو عالمی انقلاب بنانا چاہتا تھا، جو صنعتی طور پر ترقی یافتہ اقوام سے شروع ہو کر باقی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ اس لئے لینن اس کی تشریح کے بہانے اس کی مخالفت پر مجبور ہوا، چنانچہ اس نے روس میں ایک کمیونسٹ ریاست قائم کی۔ روس ان دنوں صنعتی لحاظ سے یورپ سے پیچھے تھا، لینن اس کو صرف روس میں قائم کر سکا، پھر تین دہائیوں بعد لینن کے جانشینوں نے بڑی استعماری ریاست یعنی امریکہ کے ساتھ معاہدہ کر لیا، یہ معاہدہ استعمار کے ساتھ معاہدہ تھا۔ اس معاہدے کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ کمیونیزم کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا، چنانچہ مرکزی کمیونسٹ ریاست صفحہ ہستی سے مٹ گئی اور اسی معاہدے کی وجہ سے کمیونیزم کو اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی، اس لئے یہ ضروری ہے کہ اب سرمایہ داریت کا مقابلہ کرنے اور استعمار کا خاتمہ کرنے کیلئے کسی دوسرے علاج کی تلاش کی جائے۔ یہ علاج اسلام ہی ہے جو اس کی قابلیت رکھتا ہے، بلکہ یہی استعمار کو ہٹانے اور سرمایہ داریت کو تباہ کرنے کا واحد علاج ہے۔ اسلام جو حل اور علاج پیش کرتا ہے، اس کی بنیاد اس پر ہے کہ کائنات، انسان اور حیات سے متعلق عالمی سطح پر ایک جامع تصور کو متعارف کیا جائے اور اس کو عالمی معاشرے کے رواج میں داخل کیا جائے جو رضامندی اور اختیار کے ساتھ عالمی عرف کو نافذ کرنے کی بنیاد پر قائم ہے، تو کائنات، انسان اور حیات کے حوالے سے اس جامع فکر پر عالمی سطح پر بحث ہی تصورات کو بدلے گی اور غلط تصورات کو جڑ سے اکھاڑے گی اور عالمی عرف کی اصلاح کرے گی۔ استعماریت بھی زندگی کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے، اس کا خاتمہ اس نقطۂ نظر کا خاتمہ کئے بغیر ہر گز نہیں ہو سکتا۔ یہ درست ہے کہ عالمی رائے عامہ جو دنیا میں استعمار کے خلاف پیدا ہوئی ہے، استعمار اس سے متاثر ہوا ہے تاہم اس رائے عامہ نے استعمار کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا نہ ہی اس کا وجود کمزور ہوا، بس اتنا ہے کہ استعمار نے اپنے اسلوب بدل دیے ہیں۔ افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے وہ ممالک جنہیں کالونیاں بنایا گیا، وہ آج بھی کالونیاں ہیں، اگرچہ ان کے متعلق ریاستوں کو آزادی دینے کا اسلوب اختیار کیا گیا۔ ان کالونیوں کو صرف انقلابات، علاقائی اور عالمی جنگیں

ہی آزادی دلا سکتی ہیں، لیکن جب تک دنیا میں موجود بڑی ریاستیں استعمار کو ایک فکر (نظریہ) کے طور پر اپنائے رکھیں گی اور اپنے وسائل کو اس کے مفادات کے تابع بنائے رکھیں گی، تب تک دنیا سے استعمار کے خاتمے کا کوئی راستہ نہیں، جب تک کہ اس کو ماننے والوں کے دل و دماغ سے اس فکر کو کھرچ نہ دیا جائے، یعنی وہ اسے زندگی کے بارے میں ایک نقطہ نظر کے طور پر اپنانا چھوڑ دیں۔ یہ بھی درست ہے کہ مادی طور پر استعمار کا مقابلہ کیا جائے اور رائے عامہ اس کے خلاف رہے اور اس کیلئے دگنی کوشش کی جائے مگر یہ کامیاب علاج نہیں، کامیاب علاج عالمی سطح پر بحث و مباحثہ کے میدان میں انسان، حیات اور کائنات کے بارے میں فقط اسلام کو ایک کُلی فکر کے طور پر پیش کرنے سے ہو گا تاکہ ہر کوئی اس پر بحث کر سکے اور عالمی سطح پر اس کو تمام ریاستوں کے درمیان بحث و مباحثہ کیلئے پیش کیا جائے، بالخصوص عالمی معاشرے کے درمیان۔ استعمار کا یہی واحد علاج ہے اور یہ عملی طور پر اس وقت ہی ممکن ہو گا جب عالمی سطح پر ایک مضبوط اسلامی ریاست موجود ہو۔

یہی وہ تین امور ہیں جن کے سبب دنیا بدحالی سے دوچار ہے اور اسی کے سبب انسانیت سعادت اور خوش قسمتی کے راستے پر چلنے سے قاصر ہے، اور اسی طریقے سے ان تین مصیبتوں کا علاج ہو گا۔ مگر علاج کا مطلب یہ نہیں کہ جنگیں ختم ہو جائیں گی یا پریشانیاں اور اضطرابات ختم ہو جائیں گے، نہ اس کا یہ معنی ہے کہ عالمی رسہ کشی اور سیاسی داؤ پیچ یا شیطانی چالیں ختم ہو جائیں گی، اس کا معنی ہے کہ یہ گہرا اجتماعی ڈراؤنا خواب ختم کیا جائے، جس سے چھٹکارا مشکل لگ رہا ہے، ورنہ ریاستوں کے درمیان کشمکش، جنگوں کی مجبوری، داؤ پیچ اور چالیں فطری امور ہیں، مگر یہ انفرادی اور محدود امور ہوں گے، چنانچہ پوری دنیا کو جنگوں میں نہیں جھونک دیا جائے گا جیسا کہ ماضی کی دونوں بڑی عالمی جنگوں میں ہوا، نہ ہی یہ ہو گا کہ ریاستوں کی سوچ لوگوں کا خون چوسنے تک محدود رہے، جیسا کہ آج ہو رہا ہے، بلکہ اس وقت ان ریاستوں کی سوچ میں وہی کچھ ہو گا جو انسانی طبیعت کا تقاضا ہے، یعنی ہدایت اور گمراہی، خیر و شر اور حُسن اور قبح، تو ان کی فکر میں یہ سب پایا جائے گا، سر تا پا شر نہیں ہو گا، جو بڑی ریاستوں کے تصور، عالمی برادری کے تصور اور استعماری فکر کے جنم لینے سے لے کر آج تک قائم ہے۔ اس لئے اس شر کو لگام دینے کی ضرورت ہے جو دنیا پر کئی دہائیوں سے یلغار کئے ہوئے ہے، اس کام کو سرانجام دینے والی ریاست کی بھی ضرورت ہے یعنی اسلامی ریاستِ خلافت۔

عالمی سیاست پر اثرانداز ہونے کی کیفیت

کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ افراد کیلئے عالمی سیاست پر اثرانداز ہونا کیسے ممکن ہے، افراد تو افراد، جماعتوں کیلئے ریاستوں کے رجحانات پر اثرانداز ہونا کیونکر ممکن ہے؟ بالخصوص جبکہ ایک رجحان جڑ پکڑ چکا ہو

اور کئی دہائیوں تک دنیا کے یہی رجحانات رہے ہوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ افراد یا جماعتیں، جب سیاسی اعمال کا جائزہ لیں، یا عالمی سیاست کو سمجھنا چاہیں، تو یہ صحیح نہیں کہ وہ صرف ایک ذہنی تفریح یا فکری آسودگی یا صرف سیکھنے اور اپنے معلومات میں اضافے کیلئے یہ کام کریں، بلکہ وہ یہ کام اس لئے کریں کہ اس کے ذریعے دنیا کے امور کی دیکھ بھال کر سکیں اور تاکہ وہ اس طریقہ کے بارے میں سوچیں جس کے ذریعے وہ دنیا پر اثر انداز ہو سکیں، یعنی وہ یہ کام سیاستدان بننے کیلئے کریں۔ ایک سیاستدان کو، خواہ کتنا ہی ذہین شخص کیوں نہ ہو، محض ذہنی تفریح حاصل کرنے سے انتہائی دور رہنا چاہئے اور محض فکری آسودگی کی طرف اس کا میلان نہیں ہونا چاہئے اگرچہ وہ بہت گہری سوچ کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔ سو وہ سیاست پر اس لئے نظر رکھتا ہے اور عالمی سیاسی صورتحال اور عالمی حالات کو صرف اس لئے سمجھنا چاہتا ہے کیونکہ وہ ایک سیاستدان ہے، اس لئے نہیں کہ وہ ایک ذہین شخص یا مفکر ہے۔ سیاسی ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ عالمی امور سنبھالنے کیلئے کوشش کرتا ہے یعنی عالمی سیاست پر اثر انداز ہونے کیلئے، یہ ایک پہلو سے ہے۔ دوسرے پہلو سے وہ اپنے آپ کو ایک فرد سمجھتے ہوئے کام نہیں کرتا، بلکہ اپنے آپ کو امت کا جزو سمجھتے ہوئے اور ایک ڈھانچے یعنی ریاست میں اپنی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے سیاسی کام کرتا ہے۔ یہ سیاستدان اگرچہ اس ریاست کے پالیسی سازوں اور ان کو نافذ کرنے والوں میں سے نہیں ہوتا، تاہم وہ ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جو ریاستی پالیسی بنانے والا اور ان پالیسیوں کو نافذ کرنے والا بننے کی خواہش رکھتے ہیں یا پالیسی سازوں اور ان کو نافذ کرنے والوں کا احتساب کرنے والا بننا چاہتے ہیں، اس طرح وہ عالمی سطح پر مؤثر ہو گا اگرچہ وہ ایک ایسا فرد ہے جو نہ تو پالیسی بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے نہ ہی وہ اس کو نافذ کر سکتا ہے۔ ایسا ہو کر وہ مؤثر ہو سکتا ہے کیونکہ جس ریاست میں وہ موجود ہے وہ اس جیسے لوگوں کے ذریعے اثر انداز ہوتی ہے یا وہ اور اس کی طرح کے دوسرے لوگ اس ریاست کو عالمی سیاست اور عالمی صورتحال پر موثر بنانے کیلئے کوشش کرتے ہیں، یہاں سے سیاسی مفاہیم (تصورات) کی افادیت سمجھ میں آتی ہے، یعنی سیاسی بصیرت کے حامل اور دنیا میں رونما ہونے والی بالخصوص بڑی ریاستوں کی طرف سے رونما ہونے والی سیاسی کاروائیوں کو سمجھنے والے افراد کو تیار کر کے ریاست کو عالمی سیاست اور عالمی صورتحال میں مؤثر کردار ادا کرنے کا حامل بنانا۔ اس لئے عالمی سیاست اور عالمی صورتحال پر اثر انداز ہونے کیلئے سیاسی تصورات کی شفافیت پہلا قدم

ہے اور پہلی اینٹ افراد کو سیاسی اعمال پر نظر رکھنے اور عالمی سیاست کو سمجھنے کی طرف مائل کرنا یعنی عالمی سیاست کے ماہرین تیار کرنا ہے۔ اس طرح فطری طور پر ریاست کا عالمی سیاست اور عالمی صورتحال پر اثر پڑے گا۔ اس سے سیاسی تصورات کی ضرورت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور ان تصورات کی قیمت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مگر یہ بات جاننا ضروری ہے کہ ریاست کو اس وقت عالمی وجود حاصل ہوتا ہے جب دنیا کی دیگر ریاستوں کے ساتھ اس کے تعلقات قائم ہوں، جیسا کہ معاشرے کے ایک فرد کی معاشرے میں موجودگی دیگر افراد کے ساتھ تعلقات کی بنا پر ہوتی ہے معاشرے اور لوگوں کے درمیان اس کا مقام و مرتبہ ان تعلقات کی بنیاد پر ہوتا ہے، نیز لوگوں کے درمیان تعلقات پر اثرانداز ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک ریاست ہوتی ہے کہ اس کا وجود ریاستوں کے ساتھ اس کے تعلقات کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس کا مرتبہ ریاستوں کے ساتھ اس کے تعلقات اور عالمی تعلقات پر اثرانداز ہونے کے مطابق گھٹتا بڑھتا ہے۔ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے، اس کا اصل عمل یعنی اس کا کام دنیا تک اسلام کی دعوت کو لے کر جانا ہے، تو اس پر فرض ہے، بلکہ اس کے وجود کا لازمی حصہ ہے کہ اس کو عالمی مقام حاصل ہو اور یہ ریاست عالمی تعلقات پر اثرانداز ہو۔ اس لئے اس کے سیاستدانوں کے سیاسی تصورات کا عالمی سیاسی تصورات ہونا ایک ایسا امر ہے جو ناگزیر ہے، یہ محض علاقائی یا ملکی سیاست کے تصورات نہ ہوں، یعنی اسلامی سیاستدانوں کے لیے یہ بھی ناگزیر ہے کہ ان کے ہاں جو سیاسی تصور موجود ہو وہ عالمی پہلو سے ہونا چاہئے، نہ کہ صرف علاقائی یا ملکی پہلو سے۔ اسی وجہ سے ریاست کے اسلامی ریاست ہونے کے پہلو سے ان کو مکمل سیاسی شعور و آگہی حاصل ہونی چاہئے۔ اور ان کے مسلمان ہونے کی حیثیت سے اور ان کی ریاست، جس کی اصل اور بنیادی ذمہ داری، دنیا تک اسلام کی دعوت لے کر جانا ہے، کی حیثیت سے ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ان کی یہ سیاسی آگاہی کامل ہو۔

سیاسی شعور و آگاہی

سیاسی آگاہی کا مطلب سیاسی حالات، عالمی صورتحال سے آگاہی، سیاسی واقعات یا عالمی سیاست یا سیاسی کاروائیوں پر نظر رکھنا نہیں، اگرچہ یہ امور اس میں کمال حاصل کرنے کیلئے لازم ہیں۔ سیاسی آگاہی

دنیا کو ایک خاص زاویے سے دیکھنے کو کہتے ہیں، جو ہماری نسبت سے اسلامی عقیدے کا زاویہ ہے اور وہ زاویہ یہ ہے: **لاالہ الااللہ محمدرسول اللہ**

اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

<< أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا: لاالہ الااللہ محمدرسول اللہ، فاذا قالو ها عصموامنى دمائهم وأموالهم الابحقِّها>>

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ لڑتا رہوں، جب تک کہ وہ یہ کہہ نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، جب وہ یہ کلمہ پڑھ لیں گے تو ان کے جان ومال محفوظ ہو جائیں گے، ماسوائے کہ جو حق ان پر ادا کرنا لازم ہے"

یہی سیاسی شعور ہے۔ تو کسی خاص زاویے کے بغیر دنیا کو دیکھنا سطحی چیز ہے، یہ سیاسی شعور نہیں ہو گا۔ اور علاقائی یا خطے کی سوچ رکھنا ایک معمولی شے ہے، اس کو سیاسی شعور نہیں کہتے۔ سیاسی شعور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ دو عنصر اس کے اندر موجود نہ ہوں: ایک، پوری دنیا کو نگاہ میں رکھنا اور دوسرا یہ کہ اس نگاہ کا سرچشمہ ایک خاص اور متعین زاویہ ہو۔ یہ زاویہ کوئی بھی ہو سکتا، چاہے یہ ایک معین آئیڈیالوجی ہو یا معین فکر ہو یا معین مفاد وغیرہ ہو۔ یہ سیاسی شعور کی حقیقت کے حوالے سے تھا اور یہ حقیقت ہے کہ ایک مسلمان کی نسبت سے معین زاویہ اسلامی عقیدہ ہی ہے۔ یہ سیاسی شعور ہے۔ چونکہ یہی اس کی حقیقت ہے تو ایک سیاسی شخص پر قدرتی طور پر یہ لازم ہے کہ وہ انسانوں کے ہاں بحیثیت انسان، زندگی کے بارے میں ایک معین تصور ایجاد کرنے کیلئے کوشش کرے، خواہ جہاں بھی ہو۔ اس تصور کی ایجاد ہی وہ پہلی ذمہ داری ہے جو سیاسی شعور رکھنے والے کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے کہ جسے اس ذمہ داری کو قبول کر کے ادا کئے بغیر چین ہی نہ آئے۔

سیاسی شعور کے حامل شخص پر لازم ہے کہ جس وقت وہ اپنے تصورات کو راسخ کرنے اور اپنی رجحانات کو پختہ کرنے کیلئے تگ ودو کر رہا ہو، تو وہ ان تمام رجحانات کے خلاف اعلانِ جنگ کرے، جو اس کے رجحان کے مخالف ہوں اور ان تمام تصورات کے خلاف میدان جنگ میں کود جائے جو اس کے تصورات سے متصادم ہوں۔

تووہ بیک وقت دو محاذوں پر لڑتا ہے۔ یہ دونوں سمتیں اس جنگ میں ایک دوسرے سے بال برابر جدا نہیں ہوتیں، کیونکہ یہ دونوں ایک ہی شے ہیں۔ وہ توڑتا بھی ہے اور درست بھی کرتا ہے، تخریب بھی کرتا ہے اور تعمیر بھی، وہ روشنی کے دیے جلا کر اندھیروں کو منتشر کرتا ہے، ایسے شخص کی مثال یوں ہے:"وہ آگ بھی ہے جو بگاڑ کو جلاتی ہے اور روشنی بھی ہے جو سیدھا راستہ دکھاتی ہے"۔ اور جیسا کہ تصورات کو راسخ کرنے اور اپنے رجحانات کو مضبوطی سے پیوست کرنے میں حقیقت (صورتِ حال) پر افکار کے اطلاق کے دوران منطقی یا آزاد نقطہ نظر سے دوری رکھی جائے، اسی طرح ان الزامات کے خلاف اعلان جنگ بھی رجحانات کے خلاف جدوجہد کا حصہ ہے جو زندگی کے بارے میں اس کے تصورات پر لگائے جائیں۔ اسی کے تحت ان راسخ شدہ تصورات کے خلاف جنگ بھی آتی ہے، جو انحطاط کے دور سے چلے آئے ہیں۔ دشمنوں کے افکار اور اشیاء کی بابت گمراہ کن پروپیگنڈا کے اثرات کے خلاف جنگ کرنا، یا بلند مقاصد اور دوررس اہداف پر جزوی مقاصد اور وقتی اہداف کو فوقیت دینے کے خلاف جنگ بھی اس کا حصہ ہے۔ یعنی سیاسی شعور کا حامل شخص دو محاذوں پہ جنگ لڑتا ہے: داخلی اور بیرونی، دو سمتوں میں بڑھتا ہے: تعمیر اور تخریب، دو میدانوں میں کام کرتا ہے: سیاست کا میدان اور فکری میدان۔ خلاصہ یہ کہ وہ کارزارِ حیات کے اعلیٰ ترین میدانوں میں جا گھستا ہے، اس لئے سیاسی شعور کے حاملین کا جب حقیقت اور انسانوں اور زندگی کے مسائل کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے تو ان کا معاملات کے ساتھ تصادم ایک لازمی امر ہے، اس میں داخلی علاقائی اور عالمی سطح کا کوئی فرق نہیں۔ اس تصادم کے دوران اس پیغام کو پہنچانے میں کہ جس کا وہ علمبردار ہے اور اپنے اختیار کردہ مفہوم کے مطابق دنیا کو دیکھنے میں اس کی قابلیت نکھر کر سامنے آتی ہے اور وہ ان دونوں کے لیے مخصوص زاویے کو بنیاد اور فیصلہ کن بناتا ہے، اس مقصد کیلئے وہ کوشش کرتا ہے اور اس ہدف کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ہاں اگر اسے اپنے نفس کی چالوں کی خبر نہیں تو اس مخصوص زاویے کو دیکھتے ہوئے، جس کا اس نے اپنے آپ کو پابند کیا ہوا ہے اور اپنے خاص ذوق اور متعین میلانات کی وجہ سے، چاہے وہ فطری ہوں یا فکری، یہ اندیشہ ہے کہ وہ حقائق کو اپنا من پسند رنگ دے دے، یا افکار کی اپنی خواہش کے مطابق تاویل کرے، وہ خبروں کو اُس نتیجے کے مطابق سمجھے، جس تک وہ پہنچنا چاہتا ہے۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ آراء اور خبروں پر اپنے میلانات کو مسلط کرنے سے پرہیز کرے۔

بسا اوقات نفس کا کسی ذاتی، جماعتی یا فکری امر کے ساتھ لگاؤ، اسے اس طرف لے جاسکتا ہے کہ وہ ایک رائے کی تفسیر کرے کہ یہ سچی ہے جبکہ وہ جھوٹی ہو یا اس کے خیال میں وہ چیز جھوٹی ہو جبکہ وہ سچی ہو۔ اس لئے سیاسی شعور کے حامل شخص کیلئے اشد ضروری ہے کہ جو بات کہی جارہی ہے یا جو کام کیا جارہا ہے، اس کا اچھی طرح جائزہ لے لے۔ حقائق خواہ اشیاء ہوں یا واقعات، کے لیے حسی ادراک اور منطقی احساس کا ہونا لازم ہے، لیکن یہ ادراک اس کی چاہت اور رغبت کی بجائے صرف انہی حقائق کا ہونا چاہئے۔ اور جہاں تک افکار کی بات ہے، تو ان کی حقیقت کے مطابق ان کو سمجھنا لازم ہے۔ پھر اپنے ذہن کو وہ باہر کی طرف منتقل کرے، یعنی اپنی اِس بصیرت کے ساتھ وہ اُس حقیقت کو دیکھے جو اس فکر کی نمائندگی کرتی ہے۔ پھر اس فکر کو اسی حقیقت کے مطابق سمجھے، جو اس فکر کی طرف اشارہ کرتی ہے، نہ کہ اپنی چاہت کے مطابق۔ یہ صحیح ہے کہ حقیقت کی یہ تعبیر کبھی مجازی ہوتی ہے، کبھی استعارہ ہوتا ہے اور کبھی کنایہ (اشارہ)، یہ ایک جملہ بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی ترکیبِ کلام سے متعین ہوتے ہوں، نہ کہ محض ان الفاظ سے کہ جن سے یہ جملہ بنا ہے، لیکن یہ امر اس کو اپنے ذہن کو باہر کی طرف منتقل کرنے اور اس حقیقت کو دیکھنے سے باز نہیں رکھتا جس پر جملہ لغۃً دلالت کرے، وہ معنی کہ جو اہل لغت نے اس جملے کا بیان کیا ہو۔ لہٰذا سیاسی شعور کے حامل شخص کیلئے حق کا ساتھ دینا ضروری ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اس نقطہ نگاہ کے مطابق ہو، جس کو اس نے پختہ یقین کے ساتھ قبول کیا ہے اور وہ حقائق کو حقائق ہی کی نظر سے دیکھے، لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ نظر حقیقت کے احساس یا فکر پر مبنی ہو۔ ایسا کرنے سے اس کا شعور کامل ہو جاتا ہے، کیونکہ اسے غور و فکر کے وسائل حاصل ہو چکے ہیں۔ اور یہ ضروری ہے کہ اس کے ہاں دنیا کو دیکھنے کا مخصوص زاویہ اس کے ویژن، احساس اور فہم و ادراک کی بنیاد بن جائے۔

اس پس منظر میں یہ سوال اُٹھایا جاتا ہے کہ حق کی پابندی کرنے والے اور حقائق کو جوں کے توں دیکھنے والے سیاسی شعور کے حامل شخص کی غیر جانبداری اور دنیا کو ایک خاص زاویے سے دیکھنے کو کس طرح یکجا کیا جاسکتا ہے؟ اس قسم کے سوالات امور پر سطحی نگاہ رکھنے سے پیدا ہوتے ہیں، جب انسان بحث کو گہرائی کے ساتھ سمجھ لیتا ہے، تو وہ اس قسم کے سوال نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اشیاء کی حقیقت اور ان پر حکم لگانے کے درمیان فرق ہے۔ اشیاء کی حقیقت میں لوگ اختلاف نہیں کرتے۔ اگر یہ حقیقت آنکھوں سے دِکھتی ہے، تو

ہر صاحب بصارت اس کو جوں کا توں دیکھے گا، الاّیہ کہ اسے دھوکہ دیا جائے یا گمراہ کیا جائے، اور جب حقیقت کا تعلق احساس کے ساتھ ہو تو ہر وہ شخص جو احساس رکھتا ہو، شے کو محسوس کر سکے گا، خواہ چکھ کر ہو جیسے کڑواہٹ یا مٹھاس، خواہ چھو کر جیسے ملائم ہونا اور کھردراپن، خواہ اس کا تعلق سننے سے ہو جیسے آوازیں، خواہ سونگھنے سے ہو جیسے بو۔ پس تھوڑے بہت فرق سے قطع نظر لوگ اشیاء کو جوں کا توں محسوس کرتے ہیں، البتہ اشیاء پر حکم لگانے میں لوگ مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا جہاں بینی کے مخصوص زاویے کا تعلق، اشیاء اور افعال پر حکم لگانے کے ساتھ ہے، اور حقائق کو جوں کے توں دیکھنے کا تعلق احساسات وادراکات (اَفہام) کے ساتھ ہے۔ اس لئے حقائق کو جوں کے توں دیکھنا اور حق کا ساتھ دینا ضروری ہے، نیز دنیا، واقعات اور اشیاء کو مخصوص زاویے سے دیکھنا بھی ضروری ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ عالمی سیاست پر یہ کس طرح لاگو ہوتا ہے، تو ہم اس کیلئے کچھ مثالوں کو سامنے رکھیں گے جس سے معلوم ہوگا کہ سیاسی واقعات کو مخصوص زاویے سے کس طرح دیکھا جاسکتا ہے۔ ہم رسول اللہ ﷺ کی سیاست میں سے چند مثالیں لائیں گے، کچھ مثالیں قرونِ وُسطیٰ کی سیاست کی اور کچھ عصرِ حاضر کی سیاست سے پیش کریں گے۔ وہ مخصوص زاویہ نگاہ جس سے آپ ﷺ دنیا کو دیکھتے تھے وہ دعوت کو پھیلانا تھا۔ قریش جو اس وقت جزیرہ نما عرب میں بڑی ریاست تھی اور کفر اسی کی قیادت میں دعوت کا مقابلہ کر رہا تھا، آپ ﷺ نے سیاسی اور جنگی کاروائیوں کو قریش تک محدود کرنے کو اپنا ہدف بنایا۔ چنانچہ آپ ان پر نظر رکھنے کیلئے جاسوسوں کو بھیجا کرتے تھے، قریش کے تاجروں کا پیچھا کرتے تھے اور جنگی معرکوں میں ان کے ساتھ جھڑپیں ہو جاتی تھیں۔ اور آپ ﷺ نے باقی ریاستوں، یعنی قبائل کے بارے میں اتنا ہی کافی سمجھا کہ وہ تماشائی بنے نظارہ کرتے رہیں، یا جسے لوگ غیر جانبدار کہتے ہیں۔ تو آپ ﷺ کی تمام سیاسی وعسکری کاروائیاں دنیا کو دیکھنے کے مخصوص زاویے سے پھوٹتی تھیں۔ رسول ﷺ کو جب خیبر کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ قریش کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے مدینہ پر یلغار کرنے والے ہیں، جس کا مقصد (نعوذ باللہ) محمد ﷺ کو ختم کرنا اور اسلام کا صفایا کرنا ہے، تو آپ ﷺ نے عمل کا زاویہ اس طرح متعین کیا کہ قریش کے ساتھ جنگ بندی یا صلح کی جائے، تاکہ اس کے بعد وہ یکسوئی کے ساتھ خیبر کا صفایا کر دیں۔

آپ ﷺ نے اس مخصوص زاویے سے اپنی مستقبل کی کاروائیوں کیلئے امن کی پالیسی کو اساس کے طور پر اپنالیا جب تک کہ اس سے آپ ﷺ کے اہداف حاصل ہوتے رہیں۔ پس اس مرحلے میں آپ ﷺ کا عمرہ کے لیے جانا اور قریش کی طرف سے ضد کے باوجود آپ ﷺ کی رضامندی، قریش کی اکھڑپن کے مقابلے میں آپ ﷺ کی نرمی، اوراپنے اصحاب کی مخالفت وغیرہ جیسی تمام کاروائیاں اسی امن پالیسی کی کڑیاں تھیں۔ تو جس دشمن پر آپ ﷺ نے توجہ مرکوز کرکے اس کے ساتھ سیاسی کاروائیاں شروع کی تھیں، یہ سب کی سب ایک مخصوص زاویے سے نکلتی تھیں اور اس مخصوص زاویہ کے تقاضوں کے مطابق ہوا کرتی تھیں۔

تو یہ دومثالیں رسول ﷺ کی کاروائیوں کی ہیں: ایک عام کاروائی، جو ایک بڑی ریاست پر جو کہ دشمنوں کا سرغنہ تھی، مخصوص زاویہ سے توجہ مرکوز کرنے کی تھی۔ دوسری خاص کاروائی، جو ایک متعین ہدف پر توجہ مرکوز کرنے کی تھی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے ایک خاص زاویہ اپنایا اوراسی خاص زاویے سے سیاسی وعسکری تدابیر اور کاروائیوں کو دیکھا۔ اس سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ سیاسی واقعات کے متعلق مخصوص زاویہ نگاہ کاروائیوں اور تدابیر پر کس طرح لاگو کیا جاتا ہے اور یہ کہ اگر یہ مخصوص زاویہ نگاہ موجود نہ ہو تو کاروائیوں کا کوئی معنی نہیں۔

بڑی ریاستوں نے برلن کانفرنس کے بعد اسلامی ریاست یعنی ریاستِ عثمانیہ کے املاک کی لوٹ مار کو زاویہ مخصوصہ بنالیا۔ صرف یہ نہیں تھا کہ ریاستِ عثمانیہ کا خاتمہ کیا جائے اوراس کے باوجود کہ ان ریاستوں نے دونوں امور پر بحث کی اور دوسرے امر پر اتفاق بھی ہوا تھا، مگر اس کو زاویہ مخصوصہ نہیں بنایا۔ اس لئے ان ریاستوں کی تمام کی تمام کاروائیاں اسی زاویہ مخصوصہ کے مطابق ڈھلتی گئیں اوران میں باہمی سیاسی کشمکش شروع ہوگئی جو ایک صدی سے زیادہ عرصے تک جاری رہی۔ یہ کشمکش اگرچہ اسلامی ریاست کے انہدام کے ساتھ ختم ہوگئی، مگر یہ وہ زاویہ مخصوصہ نہیں تھا جس سے یہ ریاستیں سیاسی کاروائیوں اور سیاسی واقعات اور کاروائیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ مخصوص زاویہ جس سے یہ ریاستیں اس معاملے کو دیکھتی تھیں، وہ تھا جو ان کی پالیسیوں اور سیاسی کاروائیوں کے متعلق نقطۂ نظر کو کنٹرول کرتا تھا۔

امریکہ نے دوسری عالمی جنگ کے بعد کہا کہ دنیا ایک کمپنی ہے، اور امریکہ اس کمپنی میں سب سے زیادہ شئیرز کا مالک ہے، لہٰذا اس کمپنی کا انتظام بھی اس کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ امریکہ نے اپنی اس بات کو زاویہ مخصوصہ بنالیا جس سے وہ دنیا کو دیکھتا ہے۔ پس اس کی تمام کاروائیاں اسی زاویہ کے مطابق ڈھلنے لگیں اور دنیا میں رونما ہونے والی سیاسی کاروائیوں کو اسی زاویہ سے دیکھنے لگا۔ اس زاویہ سے دیکھنے نے اس کو سوویت یونین کے ساتھ اتفاق بلکہ معاہدہ کروایا اور برطانیہ و فرانس اس کے نزدیک اجنبی بن گئے۔ پھر سوویت یونین کے سقوط کے بعد اس کے نقطۂ نظر میں تبدیلی آئی۔ اب نہ صرف فرانس اور برطانیہ، بلکہ دنیا کی ہر ریاست اس کیلئے اجنبی بن گئی۔ امریکہ اس میں آخری حد تک گیا، وہ تمام معاہدات بھی اس کے لیے اجنبی بن گئے جن پر دنیا والوں نے اتفاق کیا تھا۔ پس وہ کیوٹو Kyoto معاہدے سے نکل گیا اور اس نے بارودی سرنگیں نکالنے کے معاہدات میں شمولیت اور جرائم کی عالمی عدالت کے قیام کو بھی مسترد کر دیا وغیرہ۔ اس کا زاویہ مخصوصہ جس سے وہ دنیا کو دیکھتا تھا، اس کی بنیاد دیگر مقابل ریاستوں کی عدم موجودگی تھی، جن کے ساتھ وہ برابری کی سطح پر معاہدات کرے۔ اس لئے اس کا رجحان انفرادیت کی طرف ہونے لگا اور وہ دوسری بڑی ریاستوں کے ساتھ تسلط اور بالادستی کا معاملہ کرنے لگا۔

یہ ہے دنیا میں جاری سیاسی واقعات کو مخصوص زاویے سے دیکھنے کی کیفیت۔ خواہ یہ زاویہ عام ہو، جیسا کہ دعوت کے پھیلاؤ کو خارجہ پالیسی کیلئے بنیاد بنایا جائے، یعنی ایک مخصوص نقطۂ نظر سے دنیا کو دیکھا جائے، یا یہ زاویہ مخصوص زاویہ ہو، جیسے کہ ایک مخصوص ریاست تک دشمنی کو محدود کرنا، جس پر کنٹرول کے ذریعے باقی دنیا کی طرف بڑھا جائے، یا یہ زاویہ خاص الخاص ہو، مثلاً کسی خاص سیاسی معرکہ میں شمولیت تاکہ دیگر ریاستیں اس ریاست کے سیاسی معرکوں کا نمونہ دیکھ لیں۔ تو زاویہ مخصوصہ سے سیاسی کاروائیوں اور واقعات پر نقطہ نظر کا اطلاق آسان امر ہے، اس کے لیے عملی سیاست میں کردار ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے فہم کیلئے گہرائی سے سیاسی واقعات کو مد نظر رکھنا ہی کافی ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاست پر نظر رکھنے اور سیاسی تصورات کی سمجھ کے نتیجے میں سیاسی سمجھ کا حاصل ہو جانا ایک لازمی امر ہے اور یہ کہ سیاسی کام کیلئے سیاسی سمجھ ایک ناگزیر امر ہے، اور یہ سیاسی واقعات پر اثر انداز ہونے کیلئے بھی ناگزیر ہے۔

اور جبکہ بڑی ریاستوں کے ہاں سیاسی آگاہی ایک بنیادی چیز بن چکی ہے اور عالمی سیاست کی معرفت سیاستدانوں کا روز کا معمول بن چکا ہے، تو سیاسی تصورات میں سے سیاسی آگاہی کے زیور سے آراستہ ہونا امت مسلمہ کے بیٹوں کا جو کہ اسلامی ریاست کے بیٹے ہیں، پہلا فرض بنتا ہے، اور یہ کہ سیاسی آگاہی ان کی سیاسی کاروائیوں کی بنیاد ہو۔ نیز یہ کہ یہ سیاسی آگاہی لوگوں میں عام ہو جائے، معاشرے میں یہ ایک بنیادی چیز بن جائے اور سیاستدانوں کا روز کا معمول بن جائے، کیونکہ ان کی اصل ذمہ داری پوری دنیا تک اسلام کی دعوت لے کر جانا اور لوگوں میں ہدایت پھیلانا ہے۔ یہ کام اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب وہ سیاستدان ہوں، دنیا کو مخصوص زاویے سے دیکھنے والے ہوں، نیز ان کو مکمل سیاسی آگاہی حاصل ہو۔

یہ سیاسی آگاہی کوئی بڑا مشکل امر نہیں، اسے ایک بھاری چیز تصور نہیں کرنا چاہئے کہ جس سے صرف ذہین اور تعلیم یافتہ لوگ ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ اس خیال سے بچنے کیلئے اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ سیاسی آگاہی انتہائی سادہ چیز ہے اور یہ ہر کسی کی دسترس میں ہے، حتی کہ اَن پڑھ اور عوام کی پہنچ میں بھی ہے۔ کیونکہ سیاسی آگاہی کا مطلب یہ نہیں کہ تمام اسلامی علوم کا احاطہ کیا جائے یا دنیا کو دیکھنے کے لئے جس مخصوص زاویہ کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے، اس پر مکمل عبور حاصل ہو۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ پوری دنیا کو دیکھا جائے، نظر پوری دنیا پر ہو، خواہ اس کے بارے معلومات کم ہوں یا زیادہ، اور یہ کہ دنیا کو دیکھنے کیلئے ایک مخصوص زاویہ موجود ہو۔ تو اس میں اہمیت عالمی سطح کی نگاہ کو حاصل ہے، اگرچہ یہ ایک سیاسی عمل کے متعلق ہی ہو، نیز یہ کہ یہ نگاہ ایک مخصوص زاویے سے ہو۔ پس صرف عالمی نگاہ اور اس کا مخصوص زاویے سے ہونا سیاسی آگاہی کے حصول کیلئے کافی ہے۔

یہ درست ہے کہ یہ سیاسی آگاہی دنیا اور دنیا کے سیاسی واقعات کے بارے میں معلومات کے فرق کے اعتبار سے قوت اور ضعف میں مختلف ہو سکتی ہے۔ اسی طرح مخصوص زاویہ کے بارے میں معلومات کے فرق کی وجہ سے بھی اختلاف ہو سکتا ہے، مگر اس سب کو سیاسی آگاہی کہا جائے گا اور اختلاف کے باوجود اس کا نتیجہ کم از کم ایک ہوتا ہے، یعنی سیاست میں سطحی، گھٹیا اور معمولی قسم کے امور کو دیکھنے سے گریز۔ اس بنا پر سیاسی آگاہی سیاستدانوں اور مفکرین کے ساتھ مخصوص نہیں اور اسے ان کے ساتھ خاص کرنا درست بھی نہیں۔ یہ ایک عام

چیز ہے اوراس کا عموم بر قرار رکھنا ضروری ہے اور جیسا کہ علمااور طالبعلموں کے اندراس کو پیدا کیا جاسکتا ہے، ان پڑھ اور عوام میں بھی اس کو پیدا کیا جاسکتا ہے بلکہ پوری امت کے اندر سیاسی آگاہی پیدا کرنا ضروری ہے اگرچہ یہ اجمالی طور پر کیوں نہ ہو، کیونکہ امت ہی وہ زمین ہے جس میں سپوت جنم لیتے ہیں، لہٰذا یہ مٹی سیاسی آگاہی کی مٹی ہونی چاہئے تاکہ سپوتوں کو پیدا کرسکے، تاکہ امت حکمرانوں کا محاسبہ کرسکے، لوگوں کا اندازہ کرے اور صحیح آگاہی کے ساتھ بیرونی خطروں کا سامنا کرسکے۔

جہاں تک افراد اورامت کے اندر سیاسی آگاہی پیدا کرنے کا تعلق ہے، تو یہ سیاسی معنوں میں سیاسی تربیت (تثقیف) سے پیدا ہوتی ہے، خواہ یہ تربیت اسلامی افکاراحکام کے ذریعے ہو یاسیاسی واقعات پر مسلسل نگاہ رکھنے کے ذریعے۔ پس ایک مسلمان سیاستدان کی تربیت اسلامی افکار واحکام کے ذریعے کی جانی چاہئے، ایک خالی خولی فلسفہ کے طور پر نہیں، بلکہ ان کو واقعات وحوادث کے ساتھ مربوط کیا جائے۔ اسی طرح جب وہ سیاسی واقعات پر نظر رکھتا ہے تو صرف ایک صحافی کی طرح نہیں رکھتا جو محض خبروں کی جستجو میں لگا رہتا ہے، نہ ہی ایک استاد کی طرح معلومات یکجا کرنا اس کا مقصد ہوتا ہے، بلکہ وہ ان کو مخصوص زاویہ سے دیکھتا ہے تاکہ ان پر اپنا فیصلہ صادر کرے، یاان کو دوسرے واقعات اورافکار کے ساتھ جوڑے یاان کو سیاسی کاروائیوں کی حقیقت کے ساتھ جوڑے۔ آئیڈیالوجی اور سیاست کے ذریعے یہ سیاسی تربیت (تثقیف) ہی امت اورافراد کے اندر سیاسی آگاہی پیدا کرنے کا طریقہ ہے، یہی امر امت کو اپنی سیاسی ذمہ داری ادا کرنے اوراپنی اصل ذمہ داری کو اٹھانے کا کام کروائے گا۔ یہ ذمہ داری دنیا تک دعوت لے کر جانے اور لوگوں کے اندر ہدایت پھیلانے کی ذمہ داری ہے،اس لئے امت اورافراد کی سیاسی تربیت ہی ان کے اندر سیاسی آگاہی پیدا کرنے کا طریقہ ہے۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ امت کی سیاسی تربیت کی جائے جو وسیع پیمانے پر ہو۔ اسی سے امت کے اندر سیاسی آگاہی پیدا ہوگی اور یہی امر امت کو اس قابل بنائے گا کہ وہ تخلیقی سیاستدانوں کی صفوں کی صفیں پیدا کرے۔

جمادی الثانی 1425 ہجری